4
جلد چہارم

کلیات
خواجہ احمد عباس

کلیات خواجہ احمد عباس

(جلد چہارم)

ناول

مرتب

ارتضیٰ کریم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2017
تعداد : 550
قیمت سیٹ : -/1935 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1965

Kulliyat-e-khwaja Ahmad abbas (Vol.iv)
compiler: Prof. Irteza Karim

ISBN No :978-81-934243-9-1

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن، دہلی۔110033
اس کتاب کی چھپائی میں 80GSM_Natural Color کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

خواجہ احمد عباس اردو کے اہم اور منفرد ادیب رہے ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے اور مضامین بھی۔ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے فلمیں لکھیں، ڈائریکٹ بھی کیں، کئی اسکرپٹ بھی لکھے علاوہ ازیں مضامین، سفرنامے اور سوانح بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصر ادیبوں میں ان کا قد نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ راقم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ کلیات آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی، دوسری اور تیسری جلد خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں ان کے افسانوی مجموعے 'ایک لڑکی'، 'پاؤں میں پھول'، 'زعفران کے پھول'، 'میں کون ہوں'، 'کہتے ہیں جس کو عشق'، 'گیہوں اور گلاب'، 'دیا جلے ساری رات'، 'نئی دھرتی نئے آسمان'، 'نیلی ساڑی' اور 'سونے چاندی کے بت' کے افسانے شامل ہیں۔

'سونے چاندی کے بت' خواجہ احمد عباس کا دسواں افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں کل نو کہانیاں دس خاکے اور چھ شخصی مضامین شامل ہیں۔ چنانچہ دوسری جلد میں صرف نو کہانیوں کو ہی

شامل کیا گیا ہے۔ خاکے اور مضامین کو آٹھویں جلد میں شریک کیا گیا ہے۔

تیسری جلد میں خواجہ احمد عباس کی وہ انتالیس کہانیاں شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں شریک نہیں ہیں اور پہلی بار کتابی شکل میں سامنے آ رہی ہیں۔ ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ جیسے اس انتخاب میں ایک کہانی ''اچھن کا عاشق'' بھی شامل ہے۔ جو ہندی میں ''شونیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے حوالے سے یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے کئی افسانوں کے عنوان بدل کر ہندی میں بھی شائع کرایا ہے۔ اس ضمن میں ''کولڈ ویو/سرد لہر'' مایا نگری/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، ہاتھ کا میل/بھکارن، اسپرٹ/لمس، چمتکار/معجزہ۔ بعض کہانیاں مثلاً ''ہاتھ کا میل'' اور ''بھکارن'' متن کے اعتبار سے بھی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ متن کی یہ تبدیلی آیا خواجہ احمد عباس نے کی ہے یا اردو سے ہندی ترجمہ کرتے وقت یہ آزادی مترجم نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانی ''ہاتھ کا میل/بھکارن'' اپنے دو مختلف متون کے ساتھ یہاں شریک کر لی گئی ہے۔ تا کہ قارئین کو اس کے اختلافِ متن کا اندازہ ہو سکے۔ نیز تحقیق کے طالب علموں کو اس سے کچھ رہنمائی حاصل ہو سکے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلد ان کے ناولوں پر محیط ہے: چار دل چار راہیں، شیشے کی دیواریں، بمبئی رات کی بانہوں میں، اندھیرا اجالا، انقلاب، دو بوند پانی، فاصلہ، تین پہیے، ساحل اور سمندر، چار یار۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ناول ''چار یار'' ماہنامہ بیسویں صدی دہلی میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اب اس شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور ناول جو 'ایک اور پریم کہانی'، 'ساحل اور سمندر'، 'ہیلوس مالتی' جیسے مختلف عنوان سے بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ ناول بھی پہلی بار اس کلیات میں شامل ہوا ہے۔ ایک جاسوسی ناول جس کی پہلی قسط طبی دنیا دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کلیات میں شریک ہے۔ اس کی وضاحت بھی مقدمے میں کر دی گئی ہے۔

ساتویں جلد سوانح اور سفرنامے پر مشتمل ہے جس میں: مسولینی فاشیت اور جنگِ حبش، مولانا محمد علی، خروشچیف کیا چاہتا ہے؟ فلمیں کیسے بنتی ہیں؟ جیسی تحریریں شامل ہیں۔ خواجہ احمد

عباس کے چین، جاپان اور دوسرے ممالک کے سفر کی روداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس سفرنامہ کچھ اس اسلوب میں لکھتے ہیں کہ قاری بھی ان کا شریک سفر ہو جاتا ہے۔

آٹھویں جلد میں ان کے ڈرامے 'زبیدہ'، 'اناس' اور 'ایٹم بم' وغیرہ شامل ہیں۔ کئی ڈراموں کی اشاعت اور اسٹیج ہونے کی خبر بھی اس زمانے کے رسائل اور جرائد میں نظر آتی ہے— مگر تحقیق کے طالب علم کو اس کی دستیابی میں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ مثلاً ڈراما 'یہ امرت ہے' یا 'پرچم' تک رسائی نہ ہو سکی۔ 'لال گلاب کی واپسی'، بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور اس شکل میں پہلی بار سامنے آرہا ہے۔ ان ڈراموں کے مضامین بھی متنوع رہے ہیں۔ فلمی دنیا سے لے کر ادبی شخصیات پر انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کو بھی اس کلیات میں شامل کرلیا گیا ہے۔

میں یہاں قومی اردو کونسل کے جملہ ممبران اور اراکین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی سبیل پیدا کی۔ ڈاکٹر شمس اقبال جو قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ہیں۔ انھوں نے بطور خاص اس کلیات بلکہ ضخیم کلیات کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ہر چند کہ میں اس کے لیے راضی نہیں تھا کہ یہ کلیات قومی کونسل سے شائع ہو لیکن ان کا یہ اصرار کہ آپ صرف قومی کونسل کے ڈائریکٹر نہیں ہیں بلکہ آپ کی بنیادی حیثیت اردو کے ایک محقق اور تنقید نگار کی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کلیات کی اشاعت کا سب سے زیادہ حق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی محبت کے طفیل کلیات خواجہ احمد عباس کی یہ آٹھ جلدیں آپ کے مطالعے کے لیے حاضر ہیں۔

اگر اس کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی نشان دہی فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں اسے دور کیا جا سکے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

○	پیش لفظ	iii
○	اعتذار	ix
-1	چار دل چار راہیں	1
-2	شیشے کی دیواریں	111
-3	بمبئی رات کی بانہوں میں	171
-4	چار یار	299

اعتذار

خواجہ احمد عباس اپنے موضوعات، اسلوب اور آہنگ کے باوصف اردو کے منفرد فکشن نگار (افسانہ نگار، ناول نویس، ڈراما نگار) ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ ان کے فکشن کے سرمایے کے تجزیے کے لئے اردو فکشن کی تنقید کو نئے محاورے کی ضرورت پیش آئے گی کیوں کہ ان کا ''سرمایۂ فکشن'' اپنے معاصرین کے فکشن سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔

خواجہ احمد عباس کو اس بات کا احساس تھا کہ:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں

چنانچہ اپنی تخلیقات کے حوالے سے مفتیان اردو ادب یا اپنے نکتہ چینوں کی رائے انہوں نے بار بار نقل کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

''ادیب اور نقاد کہتے ہیں: خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے، ادب کی تخلیق اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ فلم والے کہتے ہیں: اس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومنٹری ہوتے ہیں۔ وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے۔

آرٹ کی تخلیق نہیں۔ اور خواجہ احمد عباس خود کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے: مجھے کچھ کہنا ہے...اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں کبھی بلٹز میں ''آخری صفحہ'' (Last Page)اور ''آزاد قلم'' لکھ کر، کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر، کبھی افسانے کی شکل میں، کبھی ناول کی، کبھی ڈاکومنٹری فلم بنا کر، کبھی دوسروں کی فلموں کی کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر، کبھی کبھی خود اپنی فلم ڈائرکٹ کر کے۔

اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہی ہے کہ انسان کی اندرونی زندگی، اس کے ذاتی نفسیاتی مسائل اور اس کی بیرونی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے جو کچھ دنیا میں اس کے اپنے ملک اور اس کے سماج میں ہوتا ہے، اس کا اثر اس کے اپنے کردار پر اور اس کے افعال پر پڑتا ہے، جیسے جیسے دنیا، سماج، ملک کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اسی طرح انسان بھی بدلتے رہتے ہیں۔''

(خواجہ احمد عباس نمبر، ایوان اردو دہلی، دسمبر 1987ء، ص:66)

خواجہ احمد عباس کی تحریریں اور تخلیقات، عوامی ادب کا بہترین اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ عوامی ادب، ممکن ہے ادب عالیہ کا حصہ کبھی نہ بنے لیکن ادب عالیہ کو حیات بخشنے، اسے اعتبار اور اعتماد بخشنے میں اس کا اساسی کردار ہوتا ہے۔ عوامی ادب نہ ہو تو ادب عالیہ کے سوتے خشک پڑ جائیں گے۔ کمال یہ ہے کہ عوامی ادب اگر لامحدود ہوتا ہے تو ادب عالیہ کے قارئین بہت محدود بلکہ مخصوص ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر بھی سماج کی تبدیلی اور تعمیر میں بہت کم ہوتا ہے۔

میر نے کہا بھی ہے کہ:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند\
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

خواجہ احمد عباس بھی عوام سے ہو کر خواص تک اپنی بات پہنچانا چاہتے تھے اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں، جتنا لکھا ہے ان کو پڑھنے کے لئے وقت

درکار ہے۔ پھر یہ لکھنا اگر محض قلم سے لکھنا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضامین، تبصرے، کالم، خاکے کے علاوہ سیلولائڈ، گویا قلم سے کام نہ بنا، یا مطمئن نہ ہوئے تو ''فلم'' کا سہارا لیا۔ غالب کو تو صرف غزل ہی سے شکایت تھی ۔

بہ قدرِ شوق نہیں ،ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مگر خواجہ احمد عباس کاغذ اور قلم پر بھی قناعت نہ کر سکے اور سماج کی تنگی دامانی کے علاج کے لئے ''اظہار کے مختلف پیرائے'' کا سہارا لیا۔ خواجہ احمد عباس کی ادبی فتوحات کے اتنے رنگ ہیں کہ کسی ایک مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر اجمالاً تو کیا مفصل گفتگو بھی ممکن نہیں ہے۔ تادمِ تحریر خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی قلمی اور فلمی خدمات کا ایماندارانہ جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔ ان پر لکھی جانے والی زیادہ تر کتابیں تشنہ ہیں۔

●

خواجہ احمد عباس جو ایک متوسط طبقے کے ہر نوجوان کی طرح پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے اور خود ان کے والدین کی بھی یہی خواہش اور کوشش تھی۔ لیکن علی گڑھ میں ان کے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین کی ایک تقریر نے ان کے نہ صرف زاویۂ نظر کو بدل دیا بلکہ زندگی کا رخ بھی موڑ دیا۔ انھوں نے اسی پل یہ فیصلہ لے لیا کہ انھیں اپنے بھائی جان کی طرح صحافی ہی بننا ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ہی الفاظ ہیں:

> ''1925 کا ذکر ہے... کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام، ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ ''ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے، اپنی سیاسی تنظیم علاحدہ نہیں کرنی چاہیے۔'' یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی... اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ

دیا۔ اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا... اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔"

(غبار کارواں، آجکل جولائی 1971)

یہ ایک طویل مضمون کا حصہ ہے جسے میں نے ادھر اُدھر سے حذف کر کے آپ کے سامنے اس لیے رکھا ہے کہ میری بات کو تقویت ملے۔ کوئی چاہے تو تفصیل کے لیے ان کی انگریزی میں موجود سوانح "I am not an Island" سے بھی رجوع کر سکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے زمانہ طالب علمی میں ہی علی گڑھ سے ہی ایک اخبار Aligarh Opinion کے نام سے جاری کیا، جسے آج بھی کسی یونی ورسٹی کے طالب علموں کا پہلا ہفتہ وار اخبار کہا جا سکتا ہے۔ Aligarh Opinion نکالنے کی پاداش میں اس زمانے کے نائب شیخ الجامعہ نے انھیں یونی ورسٹی سے اخراج کی دھمکی بھی دی تھی۔ مگر اقبال کے اس شعر:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے، بہت اونچا، حد پرواز سے

کے مصداق دوران تعلیم ہی انھوں نے 'ہندوستان ٹائمز' اور 'بمبئی کرانیکل' کے لیے نامہ نگار کی خدمات انجام دیں۔ بی اے کے فوراً بعد دہلی کے ایک اخبار 'National Call' کے دفتر میں تین مہینے بحیثیت کارآموز (apprentice) کام کیا۔ خواجہ احمد عباس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

Let me record here that three months period in the 'National Call' really made me into a journalist

(I am not an Island: P 72)

خواجہ احمد عباس بنیادی طور پر ایک صحافی تھے مگر ایک ایسے صحافی جو باکردار تھے، جو کسی کے استحصال یا کسی کو استعمال کرنے کے پیش نظر قلم نہیں اٹھاتے تھے بلکہ حق اور سچائی کی آواز بلند کرنے کے لیے، نہایت بے باک انداز میں اپنی بات کہتے تھے۔ صحافت کے راستے سے ہی وہ فلم کی دنیا میں داخل ہوئے تھے، یعنی پہلے پہل وہ فلم پر تبصرہ لکھتے تھے اور اپنی بے باک رائے کی بنیاد پر ہی انھوں نے 'فلم مبصر' کا ایک معتبر مقام حاصل کر لیا تھا۔ قلم سے فلم تک کا ان کا سفر نہایت دلچسپ رہا ہے۔ وہ خود یہ بات کہتے تھے کہ میں نے اپنا سفر دو نقطے سے شروع کیا تھا اور 'ایک

نقطے' پر مکمل کیا۔ اگر چہ اس میں ان کو مالی اعتبار سے نقصان ہی اٹھانا پڑا، لیکن ان کی تشفی اس امر میں تھی کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ صحافت اور فلم میں کچھ وصف قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے یعنی دونوں کا سروکار ہمارا عصری سماج، ہمارا اپنا زمانہ ہوتا ہے، نیز دونوں کی رسائی عام انسان تک ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کی تحریروں کا تعلق اسی لیے عام سماج کے عام آدمی سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد حیات بھی یہی تھا کہ ان کی بات، ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، اس حوالے سے ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی— بلٹز کا آزاد قلم/ رجحان ساز اور عہد ساز کالم کہا جاسکتا ہے— 'بلٹز' سے زیادہ قارئین کو اس کے آخری صفحے پر شائع کالم' آزاد قلم' کا انتظار رہتا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ کہتی ہے کہ کالم نگاری کے حوالے سے یہ سب سے طویل عرصے تک لکھا جانے والا کالم تھا۔ 'بلٹز' میں انھوں نے کم وبیش 40 برسوں تک' آزاد قلم' لکھا اور انھوں نے بہ وقت تقرری ہی یہ بات انتظامیہ کے پیش نظر رکھ دی تھی کہ وہ اپنے نظر اور نظریے کے اعتبار سے جو کچھ لکھیں گے، اسے بلٹز من وعن شائع کرے گا، کسی طرح کی کتر بیونت نہیں ہوگی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ معاوضہ تو کم ہوسکتا ہے مگر میری یہ شرط باقی رہے گی۔ چنانچہ پوری زندگی وہ ملک میں رہے ہوں یا ملک سے باہر— بلٹز کے لیے' آزاد قلم' کا لکھنا، کبھی نہیں بھولے۔ راج نرائن راز جو شاعر بھی تھے اور آجکل کے مدیر بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جب ہفتہ وار اردو بلٹز جاری ہوا، تو وہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے لکھنے لگے۔ آزاد قلم کا آخری صفحہ بلٹز کے لاسٹ پیج کا ترجمہ نہیں بلکہ جداگانہ کالم ہوا کرتا تھا، ہندی اور اردو میں آزاد قلم کا کالم محض چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ زبان بیشتر سہل ہوا کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ میں: ''گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں جو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اور راجستھان میں پڑھے اور سمجھے جاتے تھے گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔''

لاسٹ پیج، صحافت کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ 39 برس تک ایک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دنیائے صحافت کا سب سے

زیادہ عرصے تک شائع ہونے والا کالم ہے اور شاید یہی بات آزاد قلم کے آخری صفحے کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔''

(خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار، ص 230)

یہاں مجھے صرف ایک اضافہ کرنا ہے کہ شاید نہیں بلکہ یقیناً 'آزاد قلم' اردو صحافت کی تاریخ میں لکھا جانے والا 'طویل العمر' یا طویل مدتی کالم ہے۔

بلٹز کے 'آزاد قلم' کا آج اگر تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو کچھ دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ 'آزاد قلم' کا موضوع بالکل آزاد ہوتا تھا۔ خواجہ احمد عباس نہایت آزادانہ طور پر قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ادبی اور لسانی موضوعات پر بے باکانہ اسلوب میں اظہار خیال کرتے تھے۔ دوسرا اہم پہلو 'آزاد قلم' کا یہ تھا کہ اس کے صفحے کے بائیں ہاتھ کے کونے پر کبھی کسی فلمی ہیرو، ہیروئین یا ادیب کی تصویر ہوتی تھی، اور اس تصویر کے ساتھ کوئی شعر یا کوئی اطلاع ہوتی تھی مثال کے طور پر 'قاضی سلیم' کی تصویر کے ساتھ یہ شعر:

ہر قدم پر لٹا کر متاع نظر
میں نے گھر گھر سے آنسو اکٹھے کیے

منفرد شاعر قاضی سلیم جو اب ممبر پارلیامنٹ بھی بن گئے، درج ہے۔''

(بلٹز، 12 جنوری 1980)

پرویز شاہدی کی تصویر کے ذیل میں یہ عبارت درج ہے:

''رقص حیات اور تثلیث حیات کے خالق، جن کی شاعری میں مخدوم اور جاں نثار اختر کی طرح تخلیقی صلاحیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔''

(بلٹز، 10 مئی 1980)

بلٹز کے آزاد قلم کا مطالعہ ہمارے سامنے ہندوستان کے عوامی اور عام مسائل کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے اس عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ملی اور ادبی صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے یہاں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی نیز معلومات عامہ پر ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ یہاں بلٹز کے 'آزاد قلم' کے چند

عناوین بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کرتا ہوں کہ لفافے سے بھی مضمون تک پہنچا جاسکتا ہے:

''کیا کوئی کلچر اور زبان مر سکتی ہے؟''

(بلٹز 10 مئی 1980)

''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: گاندھی جی کے ساتھی مظہر الحق''

(بلٹز 24 مئی 1980)

''حیدرآباد کا 'شہر اور سپنا' کب بسایا جائے گا؟

کہاں بسایا جائے گا؟

''کیا اسمبلیوں کے چناؤ دوبارہ ہوں گے''

(بلٹز، 31 مئی 1980)

''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

(بلٹز، 27 مارچ 1965)

''روٹی نہیں ہے تو کیک کھاو.

(بلٹز، 17 فروری 1965)

سامراج، سوراج، کامراج، رام راج؟

(بلٹز، 21 فروری 1983)

''رہتا ہے دل وطن میں!''

(بلٹز، 8 فروری 1964)

جھوٹا سچ یا سچا جھوٹ

(بلٹز، 11 مارچ 1964)

''نئی سیتا، نئی زلیخا، نئی مریم''

(بلٹز، 14 مارچ 1964)

ایسے کئی مضمون کے عنوان یہاں نقل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر آخری عنوان سے لکھے جانے والے کالم کی چند سطریں، آپ ملاحظہ فرمائیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کیا 1964 کے

ہندوستان اور 2014 کے ہندوستان کی تصویر بدلی ہے؟؟ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

''آج وہ سب باہر نکل آئی تھیں اور بمبئی کی سڑکوں پر کندھے سے کندھا ملا کر مارچ کر رہی تھیں۔

سیتا، ساوتری، عائشہ، خدیجہ، مَیری

سلمہ، سوہنی، جولیٹ، پدمنی

لیلیٰ، لیلا، للّی

موہنی، محمودہ، مارگریٹ

ملوں میں کام کرنے والی نوگز کی ساڑی پہننے والی مہاراشٹری عورتیں...

دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں، اسٹینوگرافر، ٹائپسٹ گرلز، کلرک، پلاسٹک کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں۔

دواؤں کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں، بیڑی بنانے والیاں، بسکٹ بنانے والیاں...

ساڑیاں، فراک، شلوار، لمبی چوٹیاں، کٹے ہوئے بال۔ کسی کے ماتھے پر بندی، کسی کے ہونٹوں پر لپ اسٹک، کسی کے ہاتھوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں، کسی کی انگلی پر شادی یا منگنی کی انگوٹھی، کسی کی گود میں بچہ، مگر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک انقلابی سرخ پھریرا— ہر ایک کے دل میں ایک نئی امنگ، ایک نیا جوش، ہر ایک کی زبان پر ہندوستان کی کام کرنے والی نئی عورتوں کے نعرے—

''مہنگائی کا خاتمہ کرو!

کام کرنے والی عورتوں کو برابر کے حقوق دو

چولہا جلانے والی گیس کی قیمت کم کرو، تیل کی کمپنیوں کو عوام کی ملکیت بناؤ، کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بال گھر Creche بناؤ— شادی شدہ کام کرنے والیوں پر سے پابندیاں ہٹاؤ۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کی فکر کیا تھی؟ ان کے

تیور کیا تھے؟ ان کی نگاہ کتنی دوررس تھی؟ وہ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظر نامے پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے؟ دراصل خواجہ احمد عباس اپنے انھیں موضوعات اور اسلوب کے اسی بے باکانہ انداز کی بنیاد پر صحافت اور ادب کی تاریخ میں ایک الگ عنوان کے تحت یاد کیے جاتے رہیں گے۔

افسانہ

خواجہ احمد عباس کا پہلا افسانہ ''ابابیل'' تھا، (اس افسانے کی سنہ اشاعت کے سلسلے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ راقم السطور نے اسی لیے رسالہ جامعہ کے مشمولات کا عکسی صفحہ پہلی جلد میں شامل کر دیا ہے تاکہ کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔) گویا یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ تادم تحریر حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے کل کتنے افسانے لکھے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً سوا سو کہانیاں ہونی چاہئیں۔ لیکن ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد دس ہی ہے۔ بقیہ افسانوی مجموعے انہیں دس مجموعوں کی بنیاد پر اردو کے پبلشرز اپنے اپنے طور پر تیار کرتے رہے اور بازار میں لاتے رہے، جنہیں جعلی ایڈیشن بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان مجموعوں میں بھی بعض افسانے اشاعت مکرر کی حیثیت رکھتے ہیں، کچھ میں کہانیوں کے علاوہ خاکے، مضامین اور دیگر نوعیت کی تحریریں بھی شریک کردی گئی ہیں۔ اس سے ہمارے ناقدین کو مغالطہ بھی ہوا ہے کہ وہ ان کے بعض مضامین کو افسانہ تصور کرتے ہوئے افسانے کے زمرے میں شریک کر لیتے ہیں۔ رام لعل نے اپنی کتاب ''خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے'' میں ''آئینہ خانہ میں'' کو افسانے کے زمرے میں شامل کردیا ہے۔ یہی سہو پروفیسر صغریٰ مہدی کی مرتبہ کتاب ''اگر مجھ سے ملنا ہے'' (خواجہ احمد عباس کے افسانے) میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ افسانہ نہیں بلکہ مضمون ہے۔ 'آئینہ خانہ میں' ادبی تحریر کا ایسا سلسلہ ہے۔ جس کے تحت ماہنامہ ''افکار'' کراچی میں کرشن چندر، بیدی، اور دوسرے قلم کاروں نے اپنی شخصیت اور فکر وفن پر خود روشنی ڈالی تھی۔ خواجہ احمد عباس کا یہ سوانحی مضمون افکار (دسمبر 1963ء) میں شائع ہوا تھا۔

ان کے بعض افسانوں کو عنوانات بدل بدل کر بھی شائع کیا گیا ہے۔ الف لیلیٰ 1956/الف لیلیٰ 1980، الف لیلیٰ 1952، سوری 1952/سوری 1953، پنجرہ/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، آج کے

لیلیٰ مجنوں ربیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں، اجنتا راجنتا کی اُور، کیپٹن سلمٰی ربھوپال کی کیپٹن سلمٰی، ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام ربچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام، رفیق رمیجر رفیق مارا گیا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایسے کچھ افسانے بھی ہیں جو کسی مجموعے میں نہیں ملتے بلکہ اردو رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔

اردو کی طرح ہندی والوں نے بھی خواجہ احمد عباس کی تحریروں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ جس پبلشر نے جیسے مناسب سمجھا، ان کی کہانیوں اور ناولوں کو شائع کیا اور اپنی تجارت کو فروغ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی اور ہے کہ خواجہ احمد عباس کی تحریریں اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کی بنیاد پر عوام میں خوب مقبول ہیں اور تھیں۔ اردو کی کہانیوں کا اگر سخت سے سخت انتخاب بھی کیا جائے تو خواجہ احمد عباس کی کہانیاں ان میں جگہ بنالیں گی۔ ان کے افسانوں کے انفراد پر آئندہ سطور میں گفتگو ہوگی۔ سر دست ان کے افسانوں کے مجموعوں کی تفصیل حاضر ہے۔

پہلا افسانہ '**ابابیل**' رسالہ: جامعہ، جلد 26، شمارہ 6 جون 1936

ایک: پہلا افسانوی مجموعہ: **ایک لڑکی** (1942)

مشمولات: (1) فیصلہ (2) ایک لڑکی (3) سرکشی (4) ناگن (5) پہلا پتھر (6) ابابیل (7) تین عورتیں (8) داروغا اور لڑکی (9) معمار (10) رادھا۔

دو: پاؤں میں پھول (1948)

مشمولات: (1) پاؤں میں پھول (2) چڑھاؤ اتار (3) بارہ گھنٹے (4) ایک پائلی چاول (5) ماں (6) آزادی کا دن (7) میں اور وہ (8) موت کی شکست۔

نوٹ: تعارف کے طور پر کرشن چندر کی تحریر شامل ہے۔

تین: زعفران کے پھول: (مارچ۔1948) کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی

مشمولات: (1) زعفران کے پھول (2) اجنتا (3) اندھیرا اور اجالا۔

چار: میں کون ہوں، (1949)، نو ہند پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی۔

مشمولات: (1) چڑیا چڑے کی کہانی (2) دھوئیں کی زنجیر (3) جاگتے رہو (4) رفیق

(5) میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی (6) میرے بچے (7) میری موت (8) ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام (9) انتقام (10) شاعر کی آواز (11) میں کون ہوں؟

نوٹ: کہانی کی کہانی کے عنوان سے ایک مضمون بھی شامل ہے۔

پانچ: کہتے ہیں جس کو عشق، (1953)، پروین بک ڈپو، الہ آباد۔

مشمولات: (1) کہتے ہیں جس کو عشق (2) شکر اللہ کا (3) مسوری 1952

چھ: گیہوں اور گلاب، (1955)، ایشیا پبلشرز، دلی۔

مشمولات: (1) گیہوں اور گلاب (2) میرا بیٹا میرا دشمن (3) آسمانی تلوار (4) لال پیلا (5) نئی برسات (6) معجزہ (7) مونتاژ۔

سات: دیا جلے ساری رات، (1959)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی۔

مشمولات: (1) دیا جلے ساری رات (2) روپے آنے پائی (3) چراغ تلے اندھیرا (4) بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام (5) کچی کچی (6) تین تصویریں (7) ڈیڈ لیٹر (8) الف لیلیٰ 1958۔

نوٹ: اس مجموعے میں کرشن چندر کی یہ تحریر بھی شامل ہے: کرشن چندر اور احمد عباس کا آپس کا مقدمہ۔

آٹھ: نئی دھرتی نئے انسان، (1977)، مکتبہ جامعہ، دہلی۔

مشمولات: (1) نیا شوالہ (2) ہنومان جی کا ہاتھ (3) سبز موٹر کار (4) ٹڈی (5) بھولی (6) نئی جنگ (7) تین بھنگی (8) پانی کی پھانسی (9) تیسرا دریا (10) سونے کی چار چوڑیاں (11) یہ بھی تاج محل (12) ٹیری لین کی پتلون (13) چٹان اور سپنا (14) خزانہ (15) دو ہاتھ (16) ایک لڑکی۔ سات دیوانے۔

نوٹ: اس مجموعے میں ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے ایک تحریر شامل ہے۔

نو: نیلی ساڑی، دسمبر (1982)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔

مشمولات: (1) ایک کہانی کا سوال ہے (2) تین مائیں ایک بچہ (3) سردی گرمی (4) بھوک (5) فین (6) نیا انتقام (7) نیلی ساری۔

دس: سونے چاندی کے بت، (1986)، کلاسیک انٹرنیشنل، بمبئی۔

اس کتاب میں فلمی شخصیات پر دس خاکے اور چھ ایسے مضامین شامل ہیں جن کا تعلق فلمی دنیا سے ہے ان کے علاوہ درج ذیل نو کہانیاں شریک کتاب ہیں۔

(1) ماں کا دل (2) فلمی نکون (3) پرنیتا کماری کے پان (4) دو پرچھائیاں (5) کایا کلپ (6) انجمن کا عاشق (7) رین مشین (8) ایک لڑکی تین چہرے (9) ایکٹریس۔

ان کے علاوہ جو افسانوی مجموعے ہیں انہیں مندرجہ بالا افسانوی مجموعوں کا BY PRODUCT کہا جانا چاہئے۔ الّا یہ کہ کسی نے کسی رسالے میں شائع شدہ کوئی افسانہ شریک کر دیا ہو۔ چند مجموعے جو درج ذیل عنوانات سے شائع ہوئے ہیں:

(1) پیرس کی ایک شام (2) بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں (3) چراغ تلے (4) اداس دیواریں (5) پھول اور دوسری کہانیاں (6) اندھیرا اجالا (7) اگر مجھ سے ملنا ہے (مرتبہ: صغریٰ مہدی) (8) خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے (مرتبہ: رام لال)

خواجہ احمد عباس کو میں ''اسکرین پلے فکشن نگار'' تصور کرتا ہوں۔ اپنے خیال کو تقویت بخشنے اور آپ کو مطمئن کرنے کی خاطر ان کی ہی تحریر حاضر ہے۔

> امر، جو کنٹر کٹر کا کلرک تھا، روپے کی گنتی کر رہا تھا۔ پھر گوپال کے اوور ٹائم کے روپے دیتے ہوئے، ذرا تعجب ظاہر کرتے ہوئے بولا، 'ارے بھائی، تم اتنی سخت محنت کیوں کرتے ہو؟'
>
> ''امر بھیا، ساری محنت میں اس لیے کرتا ہوں کیونکہ میں امیر آدمی کا بیٹا نہیں ہوں لیکن مجھے غریبوں جیسی زندگی گزارنا اچھا نہیں لگتا۔ آج میں نے اُوور ٹائم اس لیے کیا ہے کہ 'سیلر بوائے' بار اور نائٹ کلب میں پینے کا مزا لینا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ حساب کتاب کا رجسٹر پھینکو اور مزے اڑاؤ۔ میں کہتا ہوں تم ایک بار بھی روزی کو دیکھ لوگے تو تمھارے جیسا دھرماتما بھی پھسل پڑے گا۔''

اس سلسلے میں ایک دو مثالیں اور بھی ان کے ہی ناول/افسانے سے پیش کی جاسکتی ہیں:

''......آؤ میں تمہاری قمیض کو سی دوں گی۔ روزی ناچ گانے کے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے سے سوئی دھاگا اٹھاتی ہے اور گوپال کی پھٹی ہوئی قمیض کو سینے لگتی ہے.....''

یہاں کہانی جس اسلوب میں بڑھائی جا رہی ہے وہ واضح طور پر ''اسکرین پلے'' سے قربت رکھتا ہے۔

ناول

(1) چار دل چار راہیں (2) شیشے کی دیواریں (3) بمبئی رات کی بانہوں میں (4) اندھیرا اجالا (5) انقلاب (6) دو بوند پانی (7) فاصلہ (8) تین پیسے (9) ساحل اور سمندر (10) چار یار۔

تاریخی ترتیب سے ''چار دل چار راہیں'' جسے کتابستان الہ آباد نے 1959 میں شائع کیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ناول ''انقلاب'' جو بوجوہ نیا سنسار بمبئی سے 1975 میں شائع ہوا۔ ناول کے سلسلے سے اسے پہلی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خود انہوں نے اپنے کئی مضامین میں اردو میں اس کے تاخیر سے چھپنے کی وجہ بتائی ہے۔ آجکل اپریل 1985 کے شمارے میں ''من کہ.....'' کے تحت انہوں نے لکھا ہے:

''سب سے مشہور ناول اردو میں ''انقلاب'' تھا، جس کو پندرہ برس کے بعد جب اس کا روسی ایڈیشن 'سن آف انڈیا' (فرزند ہند) کے نام سے 90000 کی تعداد میں بک گیا، تب بھی جب کوئی پبلشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کو تیار نہیں تھا، تب میں نے خود گیارہ سو کی تعداد میں اس کو اپنے خرچ سے چھاپا اور بیچنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے اجرا کی رسم اپنے ہی گھر پر کی۔ کوئی پچاس ساٹھ اردو کے ادیب، ایڈیٹر، شاعر، جرنلسٹ وغیرہ اکٹھے کیے۔ ہر ایک کو تحفتاً ایک ایک جلد دی۔ امید تھی کہ کچھ تو ان میں سے کچھ ''اچھا یا برا اس کے بارے میں لکھیں گے، مگر جب وہ لوگ لنچ کھا کر میرے گھر سے رخصت ہوئے تو (اس واقعہ کو سات برس گزر چکے ہیں) آج تک کوئی ریویو بھی کسی نے نہیں لکھا۔ میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اردو میں زیادہ ناول کیوں نہیں چھپتے۔''

میں خواجہ احمد عباس کی تحریروں کی تلاش کر ہی رہا تھا کہ اس درمیان ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا ایک مضمون ''جوالا مکھی'': **خواجہ احمد عباس کا گم شدہ ناول** ''ایوان اردو'' دہلی کے فروری 2015 کے شمارے میں منظر عام پر آیا۔ جس سے ایک نئی حقیقت سامنے آئی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ خواجہ احمد عباس کی پہلی کہانی اگر 1936 میں شائع ہوئی تو ان کی ناول نگاری کا سفر بھی اسی سال شروع ہوتا ہے۔ میں یہاں مذکورہ مضمون کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں تا کہ صورت حال سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہوا جا سکے۔ یحییٰ نشیط لکھتے ہیں:

> میرے پیش نظر اس وقت ''طبی دنیا'' دہلی کا ستمبر 1963ء کا ایک شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ نمبر 11 سے 61 تک خواجہ احمد عباس کے ناول کی پہلی قسط طبی دنیا کے مدیر نے اپنی رائے کے ساتھ شائع کی ہے۔ مدیر کی رائے حسب ذیل ہے۔
>
> ''ایک پُر اسرار ناول جو''طبی دنیا'' میں ہر ماہ قسط وار شائع ہوگا۔
>
> ''ہم اپنے نوجوان عزیز خواجہ احمد عباس کے شکر گزار اور دعا گو ہیں کہ''طبی دنیا'' میں ادبی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ہمیں اپنا یہ پہلا شاہکار بھیجا۔ عزیز موصوف ایک ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ مغربی علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ملازمت کی پابندیوں کے حوالے نہیں کیا، جس میں ان کے لیے زندگی کی کامیابیوں کا ایسا میدان تھا، جو ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے شاید کسی ایک ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کے خدا داد ادبی ذوق اور شوقِ مطالعہ اور قابلِ قدر جذبۂ ایثار نے ان کے سامنے جو راہِ خدمت پیش کی، انھوں نے اسے اختیار کر لیا۔ آسمانِ صحافت پر یہ ایک نئی صبح کا ظہور ہوا ہے اور خدا نے چاہا تو لوگ دیکھیں گے کہ مولانا حالؔی کے مطلع خاندان سے ان کے بعد ایک اور روشن تارہ نکلا ہے!''
>
> اس اداریے کے بعد مدیر نے ''جوالا مکھی'' کا پہلا باب شائع کیا ہے۔ عنوانِ باب کی جلی سرخیوں کے ساتھ جزوی سرخیوں کو بھی مدیر نے قدرے روشن کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی زندگی میں جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں، جتنی بھی فلمیں بنائی ہیں، جتنے اسکرپٹ اور جتنے ناول لکھے ہیں، ان تمام سے مختلف یہ تخلیق ہے۔ پتہ نہیں کیوں، پھر اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ''طلبی دنیا'' ایک غیر ادبی جریدہ ہے۔ محققین بھلا ادب کا میدان چھوڑ کر طلبی جریدے کی ورق گردانی کیوں کرنے لگیں۔ اسی سرد لوحی اور عدم توجہی کا نتیجہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی اولین کوشش سے آج ہم بے خبر ہیں۔

میں نے اپنی بساط بھر کوشش کرلی ہے کہ اس رسالے کے باقی ماندہ شماروں کو بھی حاصل کروں، اس دوران مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دو ماہ ٹھہرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا تھا اور میں نے اس ضمن میں کوشش بھی کی مگر طلبی دنیا کے وہ قدیم شمارے مجھے دستیاب نہ ہوسکے۔''

اس کے بعد انہوں نے اس جاسوسی ناول کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے اور پہلی قسط بھی۔ جو اس کلیات میں ناول کے باب میں شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''یہ ناول خواجہ احمد عباس کی ابتدائی کاوش ہے اس لیے اس میں وہ پختگی اور فن کی کہنگی دکھائی نہیں دیتی۔ اس میں ان کا مبتدیانہ پن صاف دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ان کی اس اولین تخلیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں شروع ہی سے ترقی پسند افکار پنپنے لگے تھے۔ ان کے اس ناول کی تخلیق اس زمانے میں ہوئی تھی جب ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس انجمن کے قیام سے قبل 1932 میں چند نوجوانوں نے ''انگارے'' کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کردیا تھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے انہی افسانوں سے متاثر ہو کر یہ ناول لکھا ہو اور ''انگارے'' کی مناسبت سے اپنے ناول کا نام ''جوالا مکھی'' رکھا۔ اس ناول کی پہلی قسط ہی میں مصنف کے خیالات اور جذبات میں اشتراکیت کا اثر نمایاں ہے۔ مالداروں اور غریبوں کے درمیان دولت کی خلیج کی وجہ سے بڑھتے ہوئے فاصلوں کا ادراک خواجہ

احمد عباس کو شروع ہی سے تھا۔ اس افتراق کو ختم کرنے کا وہ انقلابی نعرہ ابھی ہندوستان میں لگایا نہیں گیا تھا۔ اس لیے انقلاب کی زیریں لہریں ہی ان کے یہاں نظر آتی ہیں۔

اس ناول کی پہلی قسط ستمبر 1936ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا تھا۔ لکھنؤ میں ہوئے اس اجلاس کے بعد سے گویا اس انجمن کو تحریک ملی، پھر بھیونڈی اور ممبئی میں اس کے جلسے ہوتے گئے اور ادب میں ایک مضبوط تحریک کے طور پر وہ کام کرنے لگی۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، علی سردار جعفری، عزیز احمد، سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی وغیرہ فعال ادیبوں کے دم سے اس انجمن کی خوب ترقی ہوئی، مگر ''جوالا مکھی'' لکھتے وقت خواجہ احمد عباس اکیلے تھے، ان کا کوئی ہم نوا تھا نہ کوئی ہمسر۔ یہی ایک ناول تھا جس میں اشتراکیت کی مدھم سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس اعتبار سے بھی ''جوالا مکھی'' کی کلیدی اور بنیادی اہمیت کو اردو ادب میں تسلیم کیے بغیر مفر نہیں۔

ان تمام خصوصیات کے سبب خواجہ احمد عباس کے ناول ''جوالا مکھی'' کو اردو کا پہلا ترقی پسند ناول کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے گمشدہ ابواب کی بازیافت کے لیے کوشش کی جائے اور اسے مکمل صورت میں سامنے لانے کے جتن کیے جائیں۔''

راقم نے بھی اس ناول کے حوالے سے تحقیق کی لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ چونکہ طبی دنیا کے شمارے کسی بھی لائبریری میں دستیاب نہ ہو سکے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ''طبی دنیا'' کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہو۔ ممکن ہے خواجہ احمد عباس نے ناول کی شروعات کی ہو لیکن وہ اسے جاری نہ رکھ سکے۔ ایسا ان کی کئی کتابوں کے ساتھ ہوا ہے کہ اعلانات تو کیے گئے مگر اس عنوان سے ان کی کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ مثلاً ''یہ امرت ہے''، ''پرچم'' یا ''چار دانوں کی کہانی''۔ آخری الذکر کی آخری قسط بھی دستیاب نہیں ہو سکی۔

خواجہ احمد کے ناولوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ اندھیرا اجالا، شیشے کی دیواریں،

دو بوند پانی ، چار دل چار راہیں، بمبئی رات کی بانہوں میں، سات ہندوستانی، ایک پرانا ٹب اور دنیا بھر کا کچرا، فاصلہ وغیرہ۔ یہاں حتمی طور پر ان ناولوں کی سنہ اشاعت نہیں دی جا سکتی۔ چونکہ زیادہ تر ناولوں پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اصلاً یہ ناول فلم کے لئے لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں وہ ادبی شان نہیں ملتی، جو ادبی ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے ان ناولوں پر ہماری تنقید مہر بہ لب نظر آتی ہے۔ آخر ان میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری یا ناول کے فن کے باب میں کتنے آنچ کی کسر رہ گئی ہے؟ اس پر بات تو ہونی ہی چاہئے تھی تا کہ ان کی فنی کمزوریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا مگر ہمارے ناقدین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے انقلاب کا ذکر مندرجہ بالا سطر میں دانستہ نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ ناول ان ناولوں سے مختلف ہے اور یہاں فنی اعتبار سے خواجہ احمد عباس زیادہ بامراد بھی رہے ہیں۔ اگر چہ انقلاب کے حوالے سے بھی ہمارے ناقدین نے بخل سے کام لیا ہے۔

ڈرامے

خواجہ احمد عباس کا تعلق IPTA سے بہت گہرا رہا ہے اور انہوں نے اس کے لئے کئی ڈرامے لکھے اور اسٹیج بھی کئے۔ مثلاً: (1) زبیدہ (2) اناس اور ایٹم بم (3) یہ امرت ہے (دستیاب نہیں ہو سکا) (4) بارہ بج کر پانچ منٹ (5) لال گلاب کی واپسی (6) پرچم۔ (دستیاب نہیں ہو سکا)

ان ڈراموں کے موضوعات مختلف بھی ہیں اور متنوع بھی۔ لیکن ایک عام روح جو ان تمام ڈراموں میں جاری ہے، وہ انسان دوستی، رواداری اور عصری منظرنامے کی ہے۔ ڈراما ''بارہ بج کر پانچ منٹ'' کا موضوع بالکل آج کا موضوع ہے، یعنی صحافت جو سیاست، سماج اور ملک کا مقدر بدل سکتی تھی اس نے بھی تجارت کی شکل لے لی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان ڈراموں کو کامیاب کوشش کہا جائے گا۔

صحافتی تحریریں

اوپر ذکر آ چکا ہے اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ خواجہ احمد عباس کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ اسی لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ صحافتی مضامین لکھے بلکہ درج ذیل صحافتی نوعیت کی

کتابیں بھی لکھیں جن کے نام یہ ہیں: (1) مسولینی فاشیت اور جنگِ حبش (2) مولانا محمد علی (3) خروشچیف کیا چاہتا ہے؟ (4) فلمیں کیسے بنتی ہیں؟

فلم اسکرپٹ اور کہانیاں

(1) میرا نام جوکر (2) سات ہندوستانی (3) دھرتی کا لال (4) بابی (5) شہر اور سپنا (6) آسمان محل (7) ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی (8) راہی (9) آوارہ (10) شری420 (11) خون کا رشتہ۔

سفر نامہ: (1) مسافر کی ڈائری (2) سرخ زمین اور پانچ ستارے

تادمِ تحریر خواجہ احمد عباس کی اُردو میں مندرجہ بالا کتابیں دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی میں بھی تقریباً باون (52) تصانیف ہیں (ان میں بعض کتابیں اُردو کہانیوں کا ترجمہ ہیں)۔ اس تعداد میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو کتابیں کم ہو جائیں لیکن کم و بیش خواجہ احمد عباس اسی کتابوں کے مصنف کہے جا سکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس ہندی میں براہِ راست نہیں لکھتے تھے، ان کی جو کتابیں ہندی میں موجود ہیں ان میں سے زیادہ تر اُردو یا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک کتاب ہندی میں ''آدھا انسان'' کے نام سے ملتی ہے جسے نیلابھ پرکاشن، الہ آباد نے 1953 میں ناول کے نام سے شائع کیا ہے جب کہ یہ ناول نہیں ہے بلکہ خواجہ احمد عباس کا مشہور افسانہ ''مسوری1952'' ہے جو ان کے طویل افسانوں پر مشتمل مجموعے ''کہتے ہیں جس کو عشق'' میں شریکِ اشاعت ہے لیکن نام مختلف ہونے کی بنا پر لوگ اسے بھی الگ کتاب شمار کرتے ہیں۔ میں نے خواجہ احمد عباس کے حوالے سے تحقیق و تلاش کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ان کی زیادہ تر تخلیقات کو یکجا طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کی تمام تحریروں کو پالیا ہے۔ ممکن ہے کل ان کی کوئی اور تحریر سامنے آجائے لیکن سرِ دست میری تحقیق کا حاصل یہی ہے۔

امید ہے خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی تحریروں سے دلچسپی رکھنے والوں کو میری یہ کوشش پسند آئے۔ اتنا بڑا کام جو آپ کے سامنے ہے ظاہری بات ہے یہ اس وقت تک مکمل نہیں

ہوسکتا تھا جب تک ہمیں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ذاکر حسین لائبریری اور ادارۂ ادبیات حیدرآباد سے مدد نہ ملی ہوتی۔ جو افراد اور احباب اس سلسلے میں معاون ثابت ہوئے ہیں ان کا فرداً فرداً نام لینا مشکل تو ہے مگر ضروری بھی۔ اس میں اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کچھ ناموں کا ذکر نہ ہو سکے۔ لیکن پھر بھی فوری طور پر جناب ابوذر ہاشمی کلکتہ، جناب یحیٰی نشیط، جناب صفدر امام قادری، ڈاکٹر زاہدالحق، محترمہ زدیا زیدی، جناب مہر ندیم الٰہی، جناب عطا خورشید، محترمہ نوشین عثمانی، پاکستان کے ہمارے دوست جناب رفاقت علی شاہد وغیرہم کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو مناسب بات نہ ہوگی۔

میں خصوصی طور پر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا سراپا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کلیات خواجہ احمد عباس کی اشاعت کے حقوق راقم کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کیے۔ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا تعلق خواجہ احمد عباس کے خانوادے سے ہے انہوں نے خواجہ احمد عباس میموریل ٹرسٹ بھی قائم کر رکھا ہے اور وہ خود بھی ادب کی بہت اچھی پارکھ رہی ہیں۔ نیز آپ سماجی، سیاسی اور ادبی اعتبار سے نہ صرف بہت فعال ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً جلسوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کا بھی انعقاد کرتی رہتی ہیں۔ وہ پلاننگ کمیشن آف انڈیا کی بہت فعال ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اوپن یونی ورسٹی حیدرآباد کی چانسلر بھی رہ چکی ہیں۔ میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی اجازت کے بغیر اتنا اہم کام شائع نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھے یقین ہے اس کام میں کمیاں ہوں گی مگر یہ بھی توقع ہے کہ اس کام کو دوسرے لوگ بہتر طریقے سے کرسکیں گے۔

مجھ سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب میں نے قدم رکھا یہ خاک داں ویراں تھا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

چار دل، چار راہیں

(ایک ناول، ایک فلم)

کہتے ہیں کہ ہر انسان کی زندگی ایک کہانی ہوتی ہے۔ ہر انسان کی ہی نہیں دنیا میں ہر چیز کی ایک کہانی ہے۔ ہر عمارت کی ایک کہانی ہے چاہے وہ آگرے کا تاج محل ہو جو شاہ جہاں بادشاہ نے اپنی پیاری بیوی کی یادگار میں لاکھوں معماروں اور مزدوروں سے بنوایا، یا بھیکو چمار کا جھونپڑا، جو اس نے لاجو کو بیاہنے کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنایا کیونکہ لاجو کے باپ کی شرط تھی کہ بیٹی اسے دوں گا جس کا اپنا گھر ہوگا۔ ہر کرسی کی ایک کہانی ہوتی ہے خواہ وہ لیڈر کی کرسی ہو (جس کی کہانی کرشن چندر نے لکھی ہے) یا تخت طاؤس ہو (جو بہرحال ایک کرسی کا کام ہی دیتا تھا) یا امریکہ کے سنگ سنگ قید خانے کی خطرناک بجلی کے تاروں سے بنی ہوئی وہ آہنی کرسی ہو جس پر بٹھا کر بے گناہ روزنبرگ اور اس کی معصوم بیوی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ہر میز کی ایک کہانی ہوتی ہے خواہ وہ گول میز ہو جس پر برطانوی سامراج کبھی کانفرنس کا ناٹک کیا کرتا تھا یا ماؤنٹ بیٹن کی وہ چوکور میز ہو جس پر ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہوا۔ یا تین ٹانگ کی وہ میز ہو جو میں نے بیس سال ہوئے کباڑی کی دوکان سے چھ روپیہ میں خریدی تھی اور جو اس عرصے میں ڈائننگ ٹیبل، رائٹنگ ٹیبل، ڈریسنگ ٹیبل اور کبھی کبھی سونے کے لیے پلنگ کا کام دیتی رہی ہے۔

اسی طرح ہر سڑک کی ایک کہانی ہوتی ہے خواہ وہ شیر شاہ بادشاہ کی بنائی ہوئی شاہراہ ہو جو کلکتے سے دہلی، امرتسر، لاہور ہوتی ہوئی پیشاور جاتی ہے یا جاتی تھی (اور اس "تھی" میں بھی ایک المیہ کہانی ہے) اور خواہ وہ صرف تین فرلانگ لمبی سڑک ہو جو بڑگاؤں کے کسانوں نے اپنے

ہاتھوں سے بنائی ہے تا کہ برسات کے موسم میں دنیا سے ان کے گاؤں کا رشتہ نہ ٹوٹ جایا کرے۔ تو پھر ہر چوراہے کی بھی ایک کہانی ہونا چاہیے ایک نہیں چار کہانیاں بلکہ پانچ کہانیاں کیونکہ ہر راستے کی ایک الگ کہانی ہوتی ہے اور جس جگہ وہ ملتے ہیں وہاں یہ سب کہانیاں مل کر ایک نئی اور بڑی دلچسپ کہانی کو جنم دیتی ہیں۔

جس چوراہے کی کہانی میں لکھ رہا ہوں وہ یوں سمجھیے کہ ہندوستان کے تقریباً وسط میں کسی جگہ ہے۔ لیکن آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ چوراہا سارے ہندوستان میں پایا جاتا ہے، نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پاکستان میں بھی اور پاکستان کی طرح دنیا کے بیشتر ملکوں میں۔

یہ چوراہا صرف چوراہا ہے۔ نہ یہاں شہر ہے نہ قصبہ، نہ گاؤں — چار سڑکیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور بس۔ یہاں جو کچھ زندگی ہے وہ ان سڑکوں سے اور ان سڑکوں سے گزرنے والی سواریوں اور مسافروں سے متعلق ہے۔ ایک پٹرول پمپ ہے جس کا ٹھیکہ لالہ دنی چند نے پانچ سو روپے رشوت دے کر حاصل کیا ہے۔ یہاں لاریوں اور موٹروں کے لیے وہ پٹرول بکتا ہے جو عرب اور ایران کے صحراؤں میں سے انگریز اور امریکن سرمایہ دار پانی کے داموں نکالتے ہیں اور دنیا بھر میں سونے کے داموں بیچتے ہیں۔ ایک رام بھروسے ہندو ہوٹل ہے جو پنڈت کرپا رام چلاتے ہیں اور جہاں پوری، بھاجی، ریوڑی مٹھائی بکتی ہے اور جہاں دیواروں پر بھگوان کرشن، گاندھی جی، سبھاش بوس، سائیں بابا، نرگس، وجینتی مالا اور مینا کماری کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ محمد و باورچی کا شان اسلام ہوٹل ہے جہاں روٹی گوشت، قورمہ، قلیہ، قیمہ، بھیجہ فرائی بکتا ہے اور جس کی دیواروں پر قائد اعظم محمد علی جناح، نواب صاحب سلطان آباد، اجمیر شریف، گاما پہلوان، نرگس، وجینتی مالا اور مینا کماری کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ پیاری پٹوارن کی ایک پان کی دوکان ہے جہاں سگریٹ، بیڑی، دیا سلائی، پوسٹ کارڈ لفافے، لاری کے ٹکٹوں اور پیاری کی مسکراہٹوں کی بکری بھی ہوتی ہے۔ ٹین کے چھپر کے نیچے جان فرنٹڈ یز کی "فرنٹڈ یز موٹر سروس" کا گیراج ہے جہاں ٹائروں میں پنکچر لگائے جاتے ہیں اور موقعہ ملنے پر موٹروں کے نئے پرزوں کی جگہ پرانے پرزے فٹ کردیے جاتے ہیں اور گیراج کے پیچھے چھپی ہوئی بھٹی ہے جہاں سڑے ہوئے گڑ، نارنگی کے چھلکوں اور پرانے ٹائروں کو ابال کر شراب بنائی جاتی ہے۔ جو

ٹرک ڈرائیوروں اور بس کے مسافروں کو انگوروں کے نام سے تین روپے فی بوتل مل سکتی ہے اور پرائیویٹ موٹر والوں کو ولایتی شراب کی پرانی بوتلوں میں بھر کر وہسکی کے نام سے پینتالیس روپے فی بوتل کے حساب سے سپلائی کی جاتی ہے اور ان دوکانوں کے سامنے منڈلاتا ہوا بھک منگا بھیکو ہے جو اپاہج ہے اور اپنی مفلوج ٹانگوں کے بجائے ہاتھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے۔

یہ سب ہے اور چار سڑکیں ہیں اور ان پر اڑتی ہوئی دھول ہے اور اسی دھول میں اڑتی ہوئی وہ چار کہانیاں ہیں جو اسی چوراہے پر آکر ہانپتی ہوئی بسوں کی طرح ایک گھڑی دم لیتی ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتی ہیں نہ جانے کس منزل مقصود کی طرف۔

ان سڑکوں میں سے ایک سڑک پرانے کھنڈروں میں سے ہوتی ہوئی رام کنڈ کے تیرتھ کو جاتی ہے۔ دوسری کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی ریاست سلطان آباد کی راجدھانی سلطانپور کو جاتی ہے۔ تیسری چھوٹا پربت پہاڑی کی ڈھلان پر چڑھتی ہوئی ہوٹل پربت پر جا کر رک جاتی ہے۔ برسوں ان تینوں سڑکوں پر چہل پہل رہی۔ رام کنڈ کی طرف بسیں تانگے اور اونٹ گاڑیاں جاتی رہتی تھیں۔ سلطان آباد کی طرف بسوں کے علاوہ نواب صاحب کی ایک سو ستر ہ پرائیویٹ موٹریں دوڑتی رہتی تھیں، کبھی کبھی نواب صاحب کے درباری ہاتھی بھی جھومتے جھامتے نظر آتے تھے اور ہوٹل پربت والی سڑک پر تو بڑھیا سے بڑھیا اور نئی سے نئی امریکن کاروں کے علاوہ کوئی گھٹیا سواری نظر ہی نہ آتی۔ سنسان تھی تو چوتھی سڑک جو دراصل سڑک نہیں تھی صرف ایک ٹیڑھی میڑھی اونچی نیچی پگڈنڈی تھی جو تھوڑی دور جا کر پہاڑی ندی کے ساتھ چل کر ایک گنجان جنگل میں کھو جاتی تھی، جنگل خوفناک تھا۔ وہاں شیر چیتوں اور بھیڑیوں کی بستی تھی، اس لیے اس راستے پر دو چار نڈر شکاریوں یا اکا دکا لکڑہاروں کے علاوہ اور کوئی جاتا نظر نہ آتا تھا۔ مدت تک تو لوگ یہی سمجھتے رہے کہ نہ یہ سڑک ہے اور نہ اس کی کوئی کہانی ہو سکتی ہے۔ مگر ہوا یہ کہ یہ سڑک بھی بن گئی ہے اور اس کی کہانی میں جو وقت آنے پر آپ کو سنائی جائے گی، فی الحال آپ سنیے......

پہلی سڑک کی کہانی

رام بھروسے ہندو ہوٹل کے مالک پنڈت کرپارام کی زبانی............

میرا اصلی نام کرپارام نہیں گوبندہ ہے۔ میں پنڈت کہلاتا ہوں مگر دراصل میں جنم سے برہمن نہیں ہوں' اہیر ہوں' میرا باپ مندر میں پوجا پاٹ کرتا تھا، بھینس پالتا تھا اور دودھ بیچتا تھا۔ میں اہیر سے برہمن اور گوبندہ سے کرپارام کیسے بن گیا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اتنی لمبی جتنی وہ سڑک جو یہاں سے رام کنڈ تک جاتی ہے۔

ان سب سڑکوں میں جو اس چوراہے پر آکر ملتی ہیں، رام کنڈ والی سڑک سب سے پرانی ہے۔ کہتے ہیں اس راستے سے ہوکر بھگوان رام ستی سیتا مائی اور لکشمن جی بن باس کو گئے تھے۔ جس تالاب کو رام کنڈ کہتے ہیں اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں بھگوان رام نے اشنان کیا تھا۔ اس تالاب کے پاس ہی ایک پورے پہاڑ کو کاٹ کر وہ مندر بنا ہوا ہے جو دیوا ستھان کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پوری پوری چٹانوں کو تراش کر دیوی دیوتاؤں کی بڑی ہی سندر مورتیاں بنائی گئی ہیں۔ کہتے ہیں یہ مندر دو ہزار برس پرانا ہے اور اس کو پورا کرنے کے لیے پانچ سو برس لگے تھے۔

میں جس گاؤں میں پیدا ہوا تھا، وہ رام کنڈ سے بہت دور ہے۔ گاؤں میں ہماری ذات کے اہیر رہتے ہیں، جو گائے بھینس پالتے ہیں اور دودھ، دہی، گھی، مکھن کا بیوپار کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ چند گھر برہمنوں کے بھی ہیں جو اہیروں کی طرح خوش حال تو نہیں لیکن پھر بھی اونچی ذات کے کارن سارے علاقے میں ان کا بڑا رعب ہے۔ ان کے علاوہ گاؤں کے باہر چند جھونپڑے چماروں کے ہیں جو ذات کے شودر ہیں اور مردہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی کھال کھینچ کر جوتے بناتے ہیں۔ اس لیے ان سے نہ صرف برہمن بلکہ اہیر بھی چھوت چھات برتتے ہیں یا کم سے کم برتتے تھے۔ ان دنوں میں، جب میں اپنے گاؤں میں رہتا تھا۔ اب تو مجھے گھر چھوڑے کتنے ہی برس ہوگئے ہیں اور سنتا ہوں کہ اتنے دنوں ہی میں دنیا پلٹ گئی

ہے۔ سلطان آباد کے نواب صاحب اب بمبئی میں جوتوں کا بیوپار کرتے ہیں۔ انگریزی سرکار اپنا بوریا بستر سمیٹ کر سات سمندر پار چلی گئی ہے اور سفید چمڑی والوں کی حکومت کے بجائے اب سفید ٹوپی والوں کا راج ہے جسے سوراج بھی کہتے ہیں اور جن راج بھی مگر ہمارے چوراہے پر اب بھی جب کبھی ترنگی جھنڈی لگائے کوئی موٹر گزرتی ہے تو ہم لوگ ہر سفید ٹوپی والے کو مہاراج مہاراج کہہ کر سلام کرتے ہیں۔

بچپن میں مجھے گھر کا دودھ پینے کو اور گھی کھانے کو ملا تھا اور اس لیے میں گاؤں کے دوسرے چھوکروں سے زیادہ تگڑا تھا، دن بھر گائے بھینس چراتا اور شام کو اکھاڑے میں ڈنڈ پیلتا تھا۔ کبڈی اور کشتی میں کوئی میرے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں ہی میں بڑے بڑے پہلوانوں سے ٹکر لیتا تھا۔ صبح سویرے جب میں نہا دھو کر چٹی دھوتی چٹا کرتا پہن کر نکلتا تو میری ماں ایک کالا ٹیکہ میرے ماتھے پر لگا دیتی تھی کہ کہیں اس کے لال کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ہماری ذات برادری میں لڑکوں کی شادی چودہ پندرہ برس کی عمر ہی میں کر دی جاتی ہے، لیکن میں تو پہلوان بننے کے شوق میں ہنومان جی کا بھگت بنا ہوا تھا اور دل میں سوچ لیا تھا کہ جب تک سارے علاقے کے پہلوانوں کو چت نہ کروں گا برہمچاری ہی رہوں گا۔ ماں نے بہت اصرار کیا پر میں بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوا۔

اور پھر ایک دن بابا نے کہا ارے گوبندا پنڈت ہیرالال کے ہاں ایک کلسی دودھ کی دے آ۔ ان کے ہاں پوجا ہے۔ بھگوان کا پرشاد بنے گا۔ پنڈت ہیرالال ذات کے برہمن ہی نہیں اچھے خاصے زمیندار بھی تھے، گاؤں میں بس ان کا ہی ایک پکا مکان تھا۔ سرکاری دربار میں بھی ان کی رسائی تھی اور جب کبھی تحصیل دار، تھانے دار دورہ کرتے ہوئے ہمارے گاؤں سے گزرتے وہ ہمیشہ پنڈت ہیرالال کے ہاں ہی ٹھہرتے تھے۔ سنا تھا کہ پنڈت جی کے گھر میں افسروں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں میزیں ہیں۔ جھاڑ فانوس ہیں، انگریزی باجا ہے بادشاہ اور ملکہ اور بڑے لاٹ صاحب کی تصویریں دیواروں پر لگی ہیں۔ سو میں بڑا خوش ہوا کہ آج تو مجھے پنڈت جی کا گھر اندر سے دیکھنے کا موقعہ ملے گا۔ سو میں نے نہا کر نئی لال کنارے والی دھوتی پہنی کلف لگا ململ کا کرتا پہنا، پیتل کی کلسی کو مانجھ کر سونے کی طرح چمکایا۔ دودھ نکالتے وقت جی میں آیا تھوڑا پانی

بھی ملالوں مگر پھر سوچا کہ کہیں پنڈت جی کو پتہ چل گیا اور انھوں نے شراب دے دیا تو جان پر بن جائے گی، پانی گھڑے میں واپس انڈیل دیا، جے ہنومان کہہ کر کلسی اٹھائی اور پنڈت جی کے گھر کا راستہ لیا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا دودھ میں پانی نہ ملا کر میں اتنی بڑی آفت مول لے رہا ہوں جو مجھے نہ صرف گھر سے بے گھر کرے گی بلکہ ایک اصل نسل کے کھرے اہیر جوان کو ایک نقلی پاکھنڈی براہمن بنا کر رہے گی۔

اپنے بھوشیہ سے بے خبر میں پنڈت جی کے لال اینٹوں والے مکان پر پہنچا دروازے پر کنڈی کھنکھٹائی تو اندر سے ایک چھاگل بجنے کی آواز آئی، پھر چوڑیاں کھنکیں اور دھڑ سے کواڑ کھل گئے۔

''کیا ہے رے، کیوں کنڈی پیٹ رہا ہے؟''

ایک دبلی سی پیلی سی لڑکی مگر اس کی آواز میں کتنا گھمنڈ اس کی کاجل لگی آنکھوں میں کتنا ابھیمان، جیسے میں گو بندا نگڑا اہیر جوان نہیں، موری کا کلبلاتا ہوا کیڑا ہوں۔ ایک پل کے لیے تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا ایک ایسا زناٹے کا تھپڑ دوں کہ چھوکری کا پیلا چہرہ لال ہو جائے پھر اپنے غصے کو پی کر میں نے کہا۔

''پنڈت جی نے دودھ منگایا تھا وہ لایا ہوں۔''

''اوہ''

اور اس دم میں نے دیکھا کہ اس کے پیلے چہرے پر لال لال بندی ایسا چمک رہی تھی جیسے برسات میں بیر بہوٹی چلتے چلتے رک گئی ہو یا لہو کی ایک بوند جم کر موتی بن گئی ہو، پھر میں نے دیکھا کہ اس کی گھمنڈ بھری آنکھیں کتنی بڑی بڑی ہیں، جیسے جنگلی ہرن کی اور اس کے ماتھے پر پڑی ہوئی کالے بالوں کی ایک لٹ کتنی اچھی لگتی ہے اور اس کی گردن کتنی پتلی ہے اور اس میں نیلی نیلی رگیں سانس کے آنے جانے سے کس طرح دھڑک رہی ہیں، جیسے اس کا دل سینے میں نہ ہو گلے میں ہو اور میرا جی چاہا کہ میں اس دبلی پتلی نازک گھمنڈی کالی کالی آنکھوں والی چھوکری کو دیکھتا ہی رہوں۔

پھر میں نے دیکھا کہ پیلے چہرے پر لالی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور آنکھیں جھکا کر وہ اندر بھاگ گئی۔

''ماں! ماں!!! اہیر کا چھوکرا دودھ لایا ہے۔''

"تو پھر کلسی اتر والے، میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے۔"

پھر چھاگل بجنے کی آواز آئی، پھر کانچ کی نیلی چوڑیاں کھنکیں اور کلسی اترواتے ہوئے دو پیلے ملائم ہاتھ ایک پل کے لیے میرے سخت کھردرے کالے ہاتھوں سے چھو گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ایک مدھم سی بجلی میرے بدن میں کوند گئی ہو مگر دل ہی دل میں، میں نے جے ہنومان کا جاپ کر کے اپنے ڈگمگاتے ہوئے برہم چاریہ آشرم کو سہارا دے لیا۔

اندر سے پنڈتائی جی کی آواز آئی۔

"اجی اور ذرا دودھ کو دیکھ کر لینا کہیں پانی نہ ملا رکھا ہو۔"

اور پھر پنڈت جی کا فیصلہ سنائی دیا۔

"دودھ اچھا ہے۔ اری او رادھا، چھوکرے سے کہہ دے روز دو سیر دودھ دے جایا کرے۔"

اور اس دن سے روز میں پنڈت جی کے ہاں دودھ پہنچانے لگا۔

اب مجھے دروازے پر کواڑ دھڑ دھڑانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ بس کنڈی کھٹکھٹائی کہ اندر سے چھاگل جھنکے، چوڑیاں کھنکیں اور دو پیلے ملائم ہاتھوں نے کلسی اتروائی۔ پھر تو میرے آنے کے وقت پر دروازہ کھلا ہی رہنے لگا۔ اور ایک دن میں دودھ لے کر پہنچا تو دیکھا وہ پہلے سے باہر کھڑی ہے۔

"میں کب سے باٹ دیکھ رہی ہوں، بہت دیر کر دی رے۔"

اس کی آواز میں اب بھی وہ پرانا ابھیمان تھا مگر کچھ اور بھی تھا۔ تھوڑا سا نخرہ، تھوڑی سی ضد اور ہٹ، تھوڑی سی جھلاہٹ، جیسے کوئی اپنے آپ پر غصہ کر رہا ہو اور شاید تھوڑا سا پیار مگر نہیں، میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا بامن کی چھوکری اور اہیر کے چھوکرے میں پیار کیسے ہو سکتا ہے اور نہ جانے کیوں میں ایک انجانے ڈر سے کانپ اٹھا۔ میں گوبندا، گاؤں کا سب سے تگڑا جوان، پانچ سیر دودھ پی کر ہزار ڈنڈے پیلنے والا پہلوان گوبندا جو آج تک نہ زہریلے کالے ناگ سے ڈرا تھا، نہ مرکھنے بیل سے، نہ شیر، چیتے بھیڑیے سے، جس کی لاٹھی کی مار کا دور دور شہرہ تھا، جس نے بڑے بڑے پہلوانوں کو چت کر دیا تھا، وہ ایک دبلی سی پتلی سی پیلی سی چھوکری کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ ایک براہمن کی بیٹی ہے اور براہمن، براہمن ہیں

اور دودھ بیچنے والے اہیر ہیں اور ان دونوں جاتوں کا میل نہیں ہو سکتا۔

رادھا کہتی رہ گئی۔ ''ارے او کہاں جارہا ہے کلسی تو لیتا جا۔''

مگر میں نہ رکا، گاؤں کے باہر جا کر ندی کے کنارے دم لیا۔ وہاں ہماری گائیں اور بھینسیں چر رہی تھیں، آؤ دیکھا نہ تاؤ بے زبان جانوروں پر لاٹھی برسانے لگا نہ جانے کب تک یہ اتیاچار کرتا رہا مگر اتنے میں کسی کے ہنسنے کی آواز سن کر میری لاٹھی ہوا میں رک گئی، مڑ کر دیکھا تو چمارن چاولی بے شرمی سے کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑی کھی کھی کھی کر رہی تھی۔

''ارے گوبندا بامن کی چھوکری کا گسہ (غصہ) ڈھور ڈنگروں پہ کیوں اتارتا ہے۔''

''تجھے کیسے معلوم؟''

ہنستے ہنستے رک کر وہ میرے پاس آئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

'یہ روگ مجھے بھی تو کھا رہا ہے رے گوبندے۔''

یہ سن کر میں ایک چھن کے لیے تو بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی آگ ایک ایسی بھوک تھی جس سے ڈر لگتا تھا۔

''ارے کیوں اس طرح دیدے پھاڑ رہا ہے جیسے پہلے کبھی چاولی کو دیکھا ہی نہیں۔ بھول گیا جب ہم چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور اسی جگہ گلی ڈنڈا کھیلتے پھریں تھے؟''

اس کا کہنا جھوٹ نہیں تھا۔ بچپن میں سچ مچ ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے بلکہ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں مجھے اس چمار کی چھوری کے ساتھ کھیلنا بڑا اچھا لگتا تھا۔ مگر برسوں ہوئے میرے ماں باپ نے اچھوتوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کو منع کر دیا تھا، پتا جی نے کہا تھا ''ارے' اہیر کا لونڈا ہو کر ان اچھوتوں، چماروں بھنگیوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ جانتا ہے۔ یہ لوگ ماس کھاتے ہیں اور گندا کوڑا اٹھاتے ہیں۔ چھی، چھی، چھی۔''

اس دن سے میں نے چاولی کے ساتھ کھیلنا بند کر دیا تھا۔ اب تو اس کو برسوں گزر چکے تھے اور ان دنوں میں میں نے چاولی کو صرف دور سے دیکھا تھا مگر اس کے بارے میں بہت کچھ سنتا رہتا تھا۔ وہ اپنی برادری ہی میں نہیں، سارے گاؤں میں بدنام تھی اس کی کہانی ہر کسی کو معلوم تھی، بچپن میں شادی ہوئی تھی، سال بھر بعد چھوکرا مر گیا اور وہ بیوہ ہو گئی۔ کئی برس سسر کے ٹکڑوں پر

پڑی رہی لیکن سال بھر سے وہ الگ ہوگئی تھی۔ ٹھیکے دار کے ہاں سڑک کوٹنے کی نوکری کر لی تھی۔ دن بھر دھرمٹ لے کر پتھر توڑتی شام کو ایک کرائے کی جھونپڑی میں سو جاتی۔ گاؤں میں جتنے منہ اتنی باتیں سب اسے آوارہ چھنال سمجھتے تھے۔ بھگوان جانے یہ سچ تھا یا جھوٹ، وہ خود بھی کسی الزام کو جھٹلاتی نہیں تھی۔ مگر ایک بار اسے یہ کہتے ہوئے ضرور سنا گیا تھا" کچھ تو سمجھ کی بات کرو بھلے مانسو۔ اگر اجت (عزت) بیچ کر گجارہ (گذارہ) کرنا ہوتا تو بارہ آنے کے لیے دس گھنٹے پتھر کیوں کوٹتی۔"

آج میں نے بہت دنوں کے بعد چاولی کو پاس سے اور غور سے دیکھا۔ اس کی رنگت مجھ سے بھی زیادہ کالی تھی۔ بالوں میں سڑک کی دھول اس کی میلی ساڑی کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی، لیکن اس کے شریر میں بھرپور جوانی کا خمار تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک، ایک ایسی آگ، ایک ایسی بھوک تھی جس کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ اگر وہ اس طرح مجھے گھورتی رہی تو اس چھنال کا جادو مجھ پر چل جائے گا۔ میں بے بس ہو جاؤں گا اور.........اور پھر میری نظروں کے سامنے رادھا آ کر کھڑی ہوگئی۔ دبلی سی پتلی سی نازک سی رادھا جس کی رگوں میں پوتر براہمنی خون تھا اور جس کی آنکھوں میں وہ گھمنڈ وہ ابھیمان تھا جو اسے براہمنوں کی سینکڑوں پیڑھیوں سے ورثے میں ملا تھا اور میں لاٹھی اٹھا کر پھر بھینسوں کو مارنے لگا۔

"ارے مارنا ہے تو مجھے مار ان بے جبان (زبان) ڈنگروں کو کیوں مارتا ہے۔"

اور اس نے ہوا میں اٹھی ہوئی لاٹھی کو پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ نے میرے ہاتھ کو چھوا جیسے کچھ دیر پہلے رادھا کے ہاتھ نے میرے ہاتھوں کو چھوا تھا۔ کتنا فرق تھا ان کے ہاتھوں میں؟ ایک پیلا دوسرا کالا، ایک ملائم اور نازک کانچ کی چوڑیاں پہننے والا ہاتھ، دوسرا سخت کھردرا، گٹا پڑا ہوا سڑک کوٹنے والا ہاتھ! رادھا کا ہاتھ ٹھنڈا رہتا تھا، جیسے برف میں لگی ہوئی ککڑی اور چاولی کا ہاتھ گرم تھا، جیسے بخار سے جل رہا ہو اور نہ جانے کیوں میں نے اس کا ہاتھ فوراً جھٹکا نہیں۔ شاید اس لیے کہ اس کی مضبوط پکڑ میں بچپن کی یاد تھی، بھروسہ تھا، وعدہ تھا، پیار تھا، بجلی کی ایک رو جو مدھم نہیں تھی، اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے ہاتھ سے ہوتی ہوئی سارے بدن میں دوڑتی رہی اور مجھے ایسا لگا کہ میرا ہاتھ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ—

"یہی بخار تیرے درد کی دوا ہے، یہی ہاتھ زندگی میں تجھے سہارا دے گا۔ اس ہاتھ کو مت چھوڑ۔"

مگر پھر میں نے چاولی کے سیاہ چہرے کو دیکھا اور اس میں مجھے اس کی برادری والے سب کالے کالے بوڑھے چمار نظر آئے جو مردار جانوروں کا ماس کھاتے تھے اور بدبودار تاڑی اور ٹھرّا پیتے تھے اور میرے اہیر خون نے مجھ سے میرے پتا کی آواز میں کہا۔

"ارے چمارن سے پریم کرے گا تو تیری برادری تجھ پر تھوتھو کرے گی اور دنیا تجھ پر ہنسے گی۔"

میں نے چاولی کا ہاتھ جھٹک دیا، بخار اتر گیا، بجلی کوند کر بجھ گئی اور رادھا کا پیلا مکھڑا ایک بار پھر میری نگاہوں میں گھوم گیا۔

"چلی جا یہاں سے۔"

میں چلّایا سچ مچ مجھے چاولی سے زیادہ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔

"جاتی ہوں پر جاتے جاتے یہ کھس کھبری (خوش خبری) دیتی جاؤں کہ اگلے مہینے بامن کی چھوکری کا بیاہ ہے پر کسی اہیر کے چھورے سے نہیں ہوگا سمجھا۔"

کہاوت ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے کچھ ایسے ہی دیوانے پن میں اس شام میں رادھا کے گھر پہنچا۔ جات، پات چھوت، چھات سماج برادری اس سمے میں سب کچھ بھلا بیٹھا تھا، من میں بس ایک ہی خیال گھوم رہا تھا، رادھا میری ہے، میں اس سے پریم کرتا ہوں، وہ مجھ سے پریم کرتی ہے۔ اگر کوئی زبردستی اس کا بیاہ کہیں اور کرے گا تو ـس اسے مار ڈالوں گا............

میں نے دروازے پر پہنچ کر دھیرے سے کنڈی کھٹکھٹائی چھاگل چھنکے، کانچ کی چوڑیاں کھنکیں اور دروازہ کھلا۔ رادھا میری کلسی لیے کھڑی تھی، مگر اس کے مکھڑ۔ ، پر مسکان نہیں تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے کلسی لیتے ہوئے میرے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو چھوا جو پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا اور پیلا تھا، جیسے اس میں خون ہی نہ وہ۔

"گوبندے"

د ... س ہوئی آواز میں بولی۔

"اب تو یہاں نہ آنا۔"

"کیوں؟"

میں غصے سے چلایا۔

''اس لیے کہ تیرا بیاہ ہونے والا ہے؟ دیکھتا ہوں کون مائی کالال گوبندے کے سامنے آتا ہے۔''

اور یہ کہہ کر میں نے اپنی لاٹھی کو زمین پر مارا اور دوسرے ہاتھ سے رادھا کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

چل ری یہاں سے بھاگ چلیں جب تک میری جان میں جان ہے کوئی تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''

''نہیں، نہیں گوبندے، یہ نہیں ہو سکتا، پاگل پن کی باتیں نہ کر۔''

وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی مگر میرے مضبوط ہاتھ سے اس کو چھٹکارا نہیں تھا۔

اور پھر پنڈت جی کی گمبھیر بھاری آواز سنائی دی۔

''کیوں رے اہیر کے لونڈے، تیری اتنی ہمت، برہمن کی بیٹی کی آبرو پر ہاتھ ڈالتا ہے۔''

رادھا کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، دوسرے ہاتھ سے لاٹھی بھی گر گئی۔ پنڈت جی نے اپنا جوتا نکال کر مجھے مارنا شروع کیا اور رادھا؟ اس نے مجھے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی، روتی ہوئی اندر بھاگ گئی اور میں پٹتا رہا، جوتوں سے پٹتا رہا۔ میری لاٹھی جس کی سارے علاقے میں دھوم تھی وہ زمین پر پڑی رہی اور میں تگڑا جوان پہلوان گوبندا بوڑھے، دبلے کبڑے برہمن کے ہاتھوں جوتے کھاتا رہا اور میری یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کا مقابلہ کروں اس لیے کہ وہ براہمن تھا اور میں نیچ ذات کا اہیر۔

میں جوتے کھاتا رہا اور میری لاٹھی زمین پر پڑی رہی مگر میرے دماغ میں بس ایک ہی دھن بجتی رہی۔ میں برہمن بنوں گا، میں براہمن کہلاؤں گا تب کوئی مجھے جوتے نہیں مار سکے گا۔ تب کوئی رادھا کو مجھ سے نہیں چھین سکے گا...... یہاں تک کہ پیٹتے پیٹتے پنڈت جی تھک گئے ان کا جوتا بھی ٹوٹ گیا اور وہ مجھے زمین پر دھکا دے کر دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے۔

بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو اٹھایا۔ لاٹھی اب بھی زمین پر پڑی تھی مگر مجھے اب اس کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس مگر مجھے بھینس نہیں رادھا چاہیے تھی سو یہ لاٹھی میرے لیے بیکار تھی مجھے تو چاہیے ایک جنیو ماتھے پر ایک نشان ایک جنم پتری جو اعلان کرے میں براہمن ہوں براہمن۔

اور اسی دھن میں میں راتوں رات اپنے گاؤں سے نکل گیا۔ اسی دھن میں میں نہ جانے کہاں کہاں خاک چھانتا پھرتا رہا۔ بھیک میں نے مانگی مہینوں مندروں کی سیڑھیوں پر میں نے گزارہ کیا، چاروں دھام کی یاترا میں نے کی اور دھیرے دھیرے میں اپنے آپ کو براہمن بننے کی تعلیم دیتا رہا، اشلوک منتر یاد کیے، جنیو گلے میں ڈالا، سر منڈا ڈالا، ڈاڑھی بڑھائی برسوں کی محنت سے جو بدن تیار کیا تھا وہ جان بوجھ کر فاقے کر کر کے دبلا اور کمزور کر ڈالا۔

اسی طرح گھومتا گھامتا میں اس سڑک پر آن پہنچا جو رام کنڈ کو جاتی ہے۔ یاتریوں کا قافلہ جا رہا تھا میں بھی اس کے ریلے میں بہتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور ان پوتر پراچین کھنڈروں میں آ کر مجھے ایسا لگا کہ میری یاترا کا انت ہو گیا ہے۔ میری منزل آ گئی ہے۔

رام کنڈ کے پوتر پانی میں اشنان کر رہا تھا کہ ایک آواز آئی

''پنڈت جی۔''

اہیر کے بیٹے گوبندے کو ابھی تک پنڈت جی کہلانے کی عادت نہیں پڑی تھی، یہی سمجھا کہ کسی اور کو کوئی آواز دے رہا ہے اور میں اشنان کرنے اور اشلوک پڑھنے میں مصروف رہا۔ پھر آواز آئی۔

''دیکھا تم نے پنڈت جی پوجا میں کتنے مگن ہیں؟ سچے دھرماتما ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

اشنان کر کے کنڈ سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا دو آدمی ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔

''پنڈت جی''

ایک جو دوسرے سے بھی زیادہ موٹا تھا بولا:

''پنڈت جی! نمبر؟''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بک رہا ہے۔

''کیا نمبر؟''

''جی، وہ نیویارک کاٹن......اوپن، کلوز......''

''سٹہ؟ شرم نہیں آتی بھگوان کے مندر میں سٹے کی بات کرتے ہوئے؟''

میں نے ڈانٹ کر جواب دیا۔

''چلو نکلو یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔''

'نو دو گیارہ''

دونوں بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

''نو دو گیارہ''

دوسرے دن میں پھر اشنان کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں چلے آ رہے ہیں۔ ساتھ میں ایک نوکر ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا تھال لیے ہوئے......

مجھے دیکھتے ہی دونوں سیٹھ زمین پر ماتھا ٹیکنے لگے۔

''پنڈت جی' یہ بھینٹ سویکار کیجئے۔''

یہ کہہ کر تھال پر سے کپڑا ہٹایا۔ مٹھائی، میوہ، سیب، انگور، ریشمی دھوتی، ریشمی پگڑی اور چاندی کے ایک سو ایک روپے۔

''یہ سب کیا ہے''

میں نے پوچھا

'' آپ نے وہ نمبر بتائے تھے نا۔ نو دو گیارہ بس وہی آئے اور ہمیں پچپن ہزار کا فائدہ ہو گیا۔ آپ ہی کی کرپا تھی پنڈت جی کہ.....''

میں نے ڈانٹ کر کہا'' کرپا میری نہیں، کرپا رام کی ہے''

اور سیوا سدن سے میں پنڈت کرپا رام ہو گیا آس پاس کے شہروں قصبوں میں میری شہرت ہو گئی۔ اب تو ہر روز مجھ سے ملنے کے لیے کتنے ہی آدمی آنے لگے۔

کوئی کہتا:

''پنڈت جی میرا بچہ بیمار ہے۔''

اہیر کا بیٹا جواب دیتا:

''اسے دودھ پلاؤ'

دو دن بعد وہ چڑھاوا لیے آ رہا ہے۔

''پنڈت جی آپ نے تو چمتکار کر دیا، بچے کی جان بچ گئی ورنہ ڈاکٹروں نے تو جواب دے

دیا تھا۔

ایک سیٹھ صاحب آئے۔

''پنڈت جی مہاراج میں نے ایک بہت بڑے ٹھیکے کے لیے ٹنڈر دے رکھا ہے۔''

میں نے کہا:

''تو میں کیا کر سکتا ہوں، جا کر کسی منسٹر کے سالے کی مٹھی گرم کرو۔''

اگلے مہینے وہ آیا اور کہنے لگا۔

''مہاراج آپ کی کرپا سے کام ہو گیا، وزیر کے سالے کو ہزار روپے کھلائے اور ٹھیکہ مل گیا۔''

بمبئی سے ایک فلم پروڈیوسر آیا اور کہنے لگا

''پنڈت جی میری دو پکچریں فیل ہو چکی ہیں اب کیا بناؤں کہ کچھ فائدے کی صورت نظر آئے۔''

میں نے کہا

''یہ فلم کا دھندا نہیں ہے یہ دیوانہ پن ہے اور تم سب پاگل ہو۔''

پانچ مہینہ کے بعد وہ دو اور پروڈیوسروں کو ساتھ لایا اور بولا

''پنڈت جی آپ کے منہ میں گھی شکر، پکچر ہٹ ہو گئی ہے۔''

میں نے کہا:

''کون سی پکچر؟''

وہ بولا ''وہی جو آپ کے کہنے سے بنائی ہے 'ہم سب پاگل ہیں' سب پرانے قرضے اتر گئے اور دو لاکھ کا منافع اوپر سے۔''

اور چپکے سے دو ہزار کے نوٹ چھوڑ گیا۔ انہیں روپیوں سے میں نے یہ رام بھرو سے ہندو ہوٹل کھولا ہے۔

لیکن آپ کہیں گے، رام کنڈ کا تیرتھ چھوڑ کر تم یہاں چورا ہے پر کیسے آ گئے، سو بھئی ہوا یہ کہ ایک بڑی توند والے ادھیڑ عمر کے سیٹھ صاحب اپنی جوان سیٹھانی کو لے کر آ گئے۔ کہنے لگے:

''مہاراج میں بھی براہمن ہوں مگر آپ جیسی شکتی میرے پاس نہیں ہے۔ کرپا کر کے میرا جیون سپھل کر دیں۔

میں نے کہا:

''بول بچہ کیا چاہتا ہے؟ کیا تیری پتنی بھی بانجھ ہے؟''

اس نے جواب دیا:

''یہ تو میں نہیں جانتا مہاراج لیکن وہ مجھ سے پریم نہیں کرتی۔''

میں نے کہا:

''بھلی استریاں پتی سے پریم نہیں کرتیں، وہ تو کیول پتی کی سیوا کرتی ہیں۔''

وہ بولا:

''مہاراج اب آپ کو کیسے سمجھاؤں' کہتے شرم آتی ہے ہمارے بیاہ کو چھ برس ہونے کو آئے مگر وہ مجھے اب تک ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔''

میں نے کہا:

''تو اپنی استری کو بھیج دو''

وہ میری گپھا سے باہر گیا ہی تھا کہ چھاگل کھنکنے اور چوڑیاں چھنکنے کی آواز آئی۔

''رادھا''

''کون؟ ارے گوبندے تو!''

''ہاں رادھا— میں— مگر یہ تیرا پتی کیا کہتا ہے' کیا سچ مچ تو نے آج تک......''

''ہاں— مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اپنے من میں مندر جس دیر جوان کی پوجا کرتی ہوں وہ ایک ڈھونگی اور پاکھنڈی نکلے گا۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔''

میں چلاّ تا ہی رہا۔

رادھا۔ رادھا۔ سن تو سہی' میں نے یہ سارا ڈھونگ رچایا صرف تیرے لیے۔''

مگر اس نے ایک نہیں سنی اور اس کے چھاگل اور چوڑیوں کی چھنک دور ہوتی گئی' یہاں تک کہ غائب ہو گئی اور میرے جیون میں سناٹا چھا گیا۔ نہ جانے کتنے گھنٹے یا کتنے دن میں چپ سادھے بیٹھا رہا، لوگ سمجھتے میں سمادھی لگائے بیٹھا ہوں اور اس لیے گپھا میں جھانک کر واپس چلے جاتے اور پھر ایک دن وہ موٹا تازہ برہمن آیا اور میرے سامنے مٹھائی کا تھال رکھتے ہوئے بولا:

''مہاراج آپ نے تو سچ مچ چمتکار کر دیا۔''

''کیوں، تمھاری پتنی تم سے پریم کرنے لگی؟''

''ہاں مہاراج بالکل، بلکہ آپ کی دیا سے اب تو اس کا پاؤں بھی بھاری ہو گیا ہے۔ اسی خوشی میں تو یہ مٹھائی لایا ہوں، بچہ ہو گا تو اور دکشنا دوں گا۔''

وہ مٹھائی میرے لیے زہر تھی سو میں نے کھالی۔

اور اس رات کو میں رام کنڈ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا۔ کئی دن تک اس سڑک پر چلتا رہا، یہاں تک کہ اس چوراہے پر پہنچ گیا۔ یہاں سے کدھر جاؤں یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے یہیں رہ پڑا۔ رام کی کرپا سے میں پنڈت کرپا تھا۔ اب رام کے بھروسے یہ ہندو ہوٹل کھول دیا جہاں اصلی گھی کی پوری کچوری، مٹھائی بکتی ہے لیکن کسی سے کہیے گا نہیں۔ دودھ میں پانی ضرور ملاتا ہوں کیونکہ ایک بار پانی نہ ملا کر اتنی مصیبتیں اٹھا چکا ہوں۔

دوسری سڑک کی کہانی

پیاری پنواڑن کی زبانی

اے حضور ادھر آیئے، آیئے ادھر تشریف لایئے۔

دست نازک بڑھایئے سرکار— پان حاضر ہے کھایئے سرکار...... یہ پان پیاری پنواڑن کے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے جس کی قیمت کبھی ایک سو روپے ہوتی تھی، اب صرف ایک پیسہ ہی ملتا ہے۔ وہی پان کا پتہ ہے، وہی کتھہ، وہی چونا، وہی سپاری، پان بنانے والے ہاتھ بھی وہی ہیں، صرف وقت بدل گیا ہے۔ میرے مالک، میرے آقا، میرے سرکار، فرزند دلبند دولت انگلشیہ، آفتاب الملک سلطان ابن سلطان سکندر ثانی نواب سر عظیم الدولہ خان بہادر فرمانروائے مملکت سلطان آباد اب بمبئی کی میرین ڈرائیو پر تین کمروں کے ایک فلیٹ میں رہتے ہیں اور جوتوں کی تجارت کرتے ہیں اور ان کی چہیتی پیاری اب اس چوراہے پر ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے لیے پان بناتی ہے اور ان کے عوض جو پیسے پاتی ہے ان میں سے بھی بیشتر کھوٹے ہوتے ہیں۔

بہت عجیب، بڑی دکھ بھری کہانی میری، حضور — اپنی دوکان پر بیٹھی بیٹھی جب کبھی سامنے والی سلطان آباد کی سڑک کی طرف نگاہ کرتی ہوں تو سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ مگر افسوس کرنے سے بھی کیا حاصل ہے، شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے ؎

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں — اور...... اور اگلا مصرعہ اب مجھے یاد نہیں رہا، نہ جانے میری یاد کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا غالب، سودا، میر، ذوق کے دیوان مجھے حفظ تھے۔ میری گائی ہوئی غزلیں سننے کے لیے دور، دور سے نواب، امیر، رئیس ہی نہیں بڑے، بڑے جید شاعر اور ادیب بھی میرے کوٹھے پر آتے تھے۔ کوٹھے کا ذکر سن کر گھبرایئے نہیں حضور، شرمایئے بھی نہیں۔ جوانی میں ایک بار تو آپ بھی کسی کوٹھے پر گئے ہوں گے، صرف گانا سننے؟ میں بھی تو گانے، بجانے کا ذکر کر رہی ہوں۔ آپ کی پیاری بھی تو کوئی نکیائی تھوڑا ہی ہے۔ خاندانی طوائف ہے، یا کہنا چاہیے تھی کیونکہ اب تو طوائفیں ختم ہو چکی ہیں، صرف طوائف الملو کی باقی رہ گئی ہے۔ پہلے صرف ہمارے گھروں میں گانا بجانا ہوتا تھا، اب تو بڑے بڑے شریف گھروں میں طبلے کی تھاپ اور گھونگروؤں کی جھنک سنائی دیتی ہے۔ پہلے صرف طوائفیں منہ پر غازہ سرخی مل کر بدن کے ابھاروں کو نمایاں کر کے حسن کے بازار میں نکلتی تھیں، مگر اب تو شریف زادیاں، شریمتیاں، رانیاں، مہارانیاں ہمیں مات کرتی ہیں۔ ہم بیچاریاں کیا کھا کر ان کے پینٹ، پاؤڈر، سرخی، لپ اسٹک، کٹے ہوئے بالوں اور نقلی سینوں کا مقابلہ کریں گی۔

میں بھی کہاں سے کہاں پہونچ گئی...... چلی تھی آپ کو اپنی اور سلطان آباد والی سڑک کی کہانی سنانے...... اور لگی جلے پھپھولے پھوڑنے...... معاف کیجئے گا سرکار اب میں بھی ادھر اُدھر کی بات کروں تو جو چور کی سزا سو میری۔ تو پھر سنیے اس سڑک کی کہانی —

سڑک بھی تو طوائف کی طرح ہوتی ہے۔ حضور یا یوں کہیے طوائف بھی سڑک کی طرح ہوتی ہے۔ وہ تو آپ نے دیکھا ہوگا کوٹھیوں کے پھاٹکوں پر لکھا رہتا ہے، یہ شاہراہ عام نہیں ہے، سو شریف عورتوں کے ماتھوں پر تو یہ تختی لگی رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اندھیرے اجالے ان محل سراؤں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور پہرے دار دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں مگر طوائف اور سڑک کی بات اور ہے، ہر کوئی اس کے سینے کو روندتا ہوا چلتا ہے اور پل بھر کے لیے بھی یہ نہیں

دیا تھا۔

ایک سیٹھ صاحب آئے۔

''پنڈت جی مہاراج میں نے ایک بہت بڑے ٹھیکے کے لیے ٹنڈر دے رکھا ہے۔''

میں نے کہا:

''تو میں کیا کر سکتا ہوں، جا کر کسی منسٹر کے سالے کی مٹھی گرم کرو۔''

اگلے مہینے وہ آیا اور کہنے لگا۔

''مہاراج آپ کی کرپا سے کام ہو گیا، وزیر کے سالے کو ہزار روپے کھلائے اور ٹھیکہ مل گیا۔''

بمبئی سے ایک فلم پروڈیوسر آیا اور کہنے لگا

''پنڈت جی میری دو پکچریں فیل ہو چکی ہیں اب کیا بناؤں کہ کچھ فائدے کی صورت نظر آئے۔''

میں نے کہا

''یہ فلم کا دھندا نہیں ہے یہ دیوانہ پن ہے اور تم سب پاگل ہو۔''

پانچ مہینے کے بعد وہ دو اور پروڈیوسروں کو ساتھ لایا اور بولا

''پنڈت جی آپ کے منہ میں گھی شکر، پکچر ہٹ ہو گئی ہے۔''

میں نے کہا:

''کون سی پکچر؟''

وہ بولا ''وہی جو آپ کے کہنے سے بنائی ہے' ہم سب پاگل ہیں' سب پرانے قرضے اتر گئے اور دو لاکھ کا منافع اوپر سے۔''

اور چپکے سے دو ہزار کے نوٹ چھوڑ گیا۔ انہیں روپیوں سے میں نے یہ رام بھرو سے ہندو ہوٹل کھولا ہے۔

لیکن آپ کہیں گے، رام کنڈ کا تیرتھ چھوڑ کر تم یہاں چورا ہے پر کیسے آ گئے، سو بھئی ہوا یہ کہ ایک بڑی توند والے ادھیڑ عمر کے سیٹھ صاحب اپنی جوان سیٹھانی کو لے کر آ گئے۔ کہنے لگے:

''مہاراج میں بھی براہمن ہوں مگر آپ جیسی شکتی میرے پاس نہیں ہے۔ کرپا کر کے میرا جیون سپھل کر دیں۔

میں نے کہا:

''بول بچہ کیا چاہتا ہے؟ کیا تیری پتنی بھی بانجھ ہے؟''

اس نے جواب دیا:

''یہ تو میں نہیں جانتا مہاراج لیکن وہ مجھ سے پریم نہیں کرتی۔''

میں نے کہا:

''بھلی استریاں پتی سے پریم نہیں کرتیں' وہ تو کیول پتی کی سیوا کرتی ہیں۔''

وہ بولا:

''مہاراج اب آپ کو کیسے سمجھاؤں' کہتے شرم آتی ہے ہمارے بیاہ کو چھ برس ہونے کو آئے مگر وہ مجھے اب تک ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔''

میں نے کہا:

''تو اپنی استری کو بھیج دو''

وہ میری گپھا سے باہر گیا ہی تھا کہ چھاگل کھنکنے اور چوڑیاں چھنکنے کی آواز آئی۔

''رادھا''

''کون؟ ارے گوبندے تو!''

''ہاں رادھا— میں— مگر یہ تیرا پتی کیا کہتا ہے' کیا سچ مچ تو نے آج تک......؟''

''ہاں— مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اپنے من میں مندر جس ویر جوان کی پوجا کرتی ہوں وہ ایک ڈھونگی اور پاکھنڈی نکلے گا۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔''

میں چلاتا ہی رہا۔

رادھا۔ رادھا۔ سن تو سہی' میں نے یہ سارا ڈھونگ رچایا صرف تیرے لیے۔''

مگر اس نے ایک نہیں سنی اور اس کے چھاگل اور چوڑیوں کی چھنک دور ہوتی گئی' یہاں تک کہ غائب ہوگئی اور میرے جیون میں سناٹا چھا گیا۔ نہ جانے کتنے گھنٹے یا کتنے دن میں چپ سادھے بیٹھا رہا، لوگ سمجھتے میں سمادھی لگائے بیٹھا ہوں اور اس لیے گپھا میں جھانک کر واپس چلے جاتے اور پھر ایک دن وہ موٹا تازہ برہمن آیا اور میرے سامنے مٹھائی کا تھال رکھتے ہوئے بولا:

سوچتا کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ سو میری زندگی بھی اس سامنے والی سڑک کی طرح ہے۔ ہم دونوں چلے تھے سلطان آباد سے اور چلتے چلتے اس چوراہے پر پہنچے ہیں۔ آگے ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے، یہ نہ مجھے معلوم ہے نہ اس سڑک کو۔

میری ماں کہا کرتی تھی کہ جس برس میں پیدا ہوئی تھی اسی سال یہ سڑک پہلی بار بنی تھی۔ اس وقت تک یہ کچا راستہ تھا جس پر شاہی ہاتھیوں کے علاوہ صرف بہلیاں یا اونٹ گاڑیاں چل سکتی تھیں، لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ بڑے نواب صاحب مرحوم (موجودہ نواب کے والد) بادشاہ سلامت سے ملنے کے لیے لندن گئے اور واپسی میں ولایت سے ایک بڑی بھاری موٹر خرید کر لے آئے لیکن جب وہ موٹر بمبئی میں جہاز سے اتار کر سلطان آباد کی طرف روانہ کی گئی تو پتہ چلا کہ اس کچے دیسی راستے پر اس ولائتی موٹر کا چلنا محال بلکہ ناممکن ہے، سو نواب صاحب کے وزیر اعظم یمین الدولہ نے رعیت پر ایک نیا ٹیکس لگا دیا اور اس ٹیکس کی آمدنی سے یہ سڑک بننی شروع ہوگئی۔ آس پاس کے گاؤں کے ہزاروں کسان بیگاری میں پکڑے گئے اور تب جا کر کئی مہینے میں سڑک تیار ہوئی اور نواب صاحب کی موٹر سلطان آباد پہنچ پائی۔

لیکن یہ سب تو سنی سنائی باتیں ہیں۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا اپنی ماں کے کوٹھے پر سے نیچے سڑک پر نواب صاحب اور ان کے وزیروں کی ایک نہیں درجنوں موٹروں کو دوڑتے دیکھا۔ وہ میری تعلیم کا زمانہ تھا۔ دن رات محنت کرنا پڑتی تھی۔ صبح سویرے گانے کا ریاض۔ استادوں کی غزلوں کا رٹنا، پھر ناچ اور مجرے کی مشق محفلوں کے ادب، آداب، تسلیم کرنے کے انداز، پان کی گلوریاں بنانے اور پیش کرنے کے قاعدے قانون۔۔۔ اسی کارآمد فن کی روٹیاں آج بھی کھا رہی ہوں۔ کسی اسکول کالج میں تعلیم کیا سخت ہوتی ہوگی جو ہمارے گھر میں ہوتی تھی، میں اپنی ماں کی اکلوتی لڑکی تھی، وہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتی تھی مگر کیا مجال ہے کہ تعلیم سے ایک منٹ کے لیے غفلت کرسکوں، فوراً ڈانٹ پڑتی......

''اری کمبخت اپنا تلفظ تو ٹھیک کر، اسک نہیں، عشق...... عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب۔ سمجھی...... غالب۔ گالب نہیں۔ جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ سمجھی۔''

اور میں کہتی:

''ماں! اسک — عشق کیا ہوتا ہے؟''

اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتی:

''وہ بھی ایک دن معلوم ہو جائے گا بیٹی...... چل اب جلدی جلدی غزل یاد کر لے......''

ہاں تو اس تعلیم اور ریاض کے زمانے میں مجھے یاد نہیں کہ کبھی گڑیا کھیلنے کا وقت بھی ملا ہو لیکن جب بھی موقع ملتا میں غزل یاد کرنے کے بہانے سے کوٹھے کے برآمدے میں آ بیٹھتی اور نیچے آنے جانے والوں کو تکا کرتی...... دن میں بھی راہ چلتے کوئی آواز لگا دیتا۔''

''ارے جانتا ہے یہ چھمیا جان کا کوٹھا ہے' کیا چیز تھی کسی زمانے میں مگر اب تو جوانی ڈھل چکی ہے۔''

اور کوئی دوسرا کہتا:

''فکر نہ کر یار' دیکھتا نہیں؟ مرغی بڈھی ہو گئی تو کیا ہوا' چوزہ تیار ہو رہا ہے۔''

طوائف کی بیٹی کو تو بچپن سے ایسے فقرے سننے کی مہارت ہوتی ہے، سو میں ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دیتی۔ مجھے تو دلچسپی تھی سڑک پر گزرنے والی موٹروں میں' رنگ برنگ کی موٹریں، چمکیلی کالی موٹریں، لال موٹریں، نیلی موٹریں، ہری موٹریں، ہاتھی جیسی بڑی موٹریں، مچھلی کی طرح سڈول موٹریں، چڑیا کی طرح اڑنے والی موٹریں، پردے دار بند موٹریں، کھلی موٹریں جن میں بیٹھے ہوئے منچلوں کی نگاہیں ہمارے کوٹھوں کی طرف لگی رہتی تھیں۔ دن بھر میں جب بھی موقع ملتا، میں ان موٹروں کو لالچی نگاہ سے دیکھتی اور رات کو جب دن بھر کی محنت کے بعد سوتی تو یہی موٹریں خواب میں نظر آتیں اور اب میں خود ان میں سب سے بڑھیا اور خوب صورت موٹر میں سوار ہوتی اور دفعتاً اس میں پر لگ جاتے اور میں کوٹھوں اور کوٹھیوں اور سڑکوں اور بازاروں پر سے اڑتی ہوئی نیلے آسمان کا رخ کرتی مگر اسی وقت میری ماں جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیتی۔

''اری کمبخت' سورج سر پر چڑھ آیا۔ ابھی تو تیرا رات کا دھندا نہیں شروع ہوا' تب بھی یہ عالم ہے کہ دس بجے تک سوتی رہتی ہے۔''

چودہ برس کی تھی جب میرا پہلا مجرا ہوا۔ اس دن میری ماں پھولی نہیں سما رہی تھی۔ دوسری ماؤں کی جو حالت بیٹی کے بیاہ کے دن ہوتی ہے' وہی طوائف کی حالت اپنی بیٹی کے پہلے مجرے

کے دن ہوتی ہے۔ وہ خوش ہوتی ہے کہ آج سے بیٹی کی نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ لیکن اس خوشی میں ایک غم کی کیفیت بھی ہوتی ہے جو صرف ایک طوائف ہی محسوس کر سکتی ہے۔ اس دن میری ماں نے اپنے ہاتھ سے میرا سنگار کیا، نئی پشواز پہنائی، اپنے سارے زیور مجھے پہنائے، بالوں میں پھول پروے اور میرا ہاتھ پکڑ کر محفل میں لے گئی۔ گھبراہٹ کے مارے میں کانپ رہی تھی۔ ایک ایک پیر من بھر کا لگتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نہ میرے حلق سے آواز نکلے گی نہ میرے ہاتھ بھاؤ بتا سکیں گے، نہ میرے پیر زت کے توڑے ادا کر سکیں گے لیکن جب ہمارے سارنگئے خدا بخشے استاد فضلو نے دھن چھیڑی اور رام لال طبلچی کی طبلے پر تھاپ پڑی تو میرے سارے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہوگئی اور میں خود حیران رہ گئی کہ جو آواز میرے حلق سے نکلی وہ سُر میں تھی۔

اس رات جس ٹھمری سے میں نے مجرے کی ابتدا کی وہ آج تک مجھے یاد ہے۔

''مرلی والے شیام۔''

اور پھر واہ واہ کے شور میں جب غزل کی فرمائش ہوئی تو میں نے غالب مرحوم کی ایک غزل چھیڑی......

سو حضور! اس رات کو میری نئی زندگی شروع ہوئی۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ محفل کی واہ، واہ میں بھی ایک نشہ ہوتا ہے۔ بیان میں گستاخی ہو تو معاف کیجئے گا سرکار! طوائف کی آپ بیتی ہے۔ اگر سچ بولنا ہے تو تھوڑی سی بے حیائی سے کام لینا پڑے گا۔ مجرے کے دوران میں لوگوں کی نگاہیں میرے جوان جسم کا جائزہ لے رہی تھیں کہ مجھے گدگدی سی محسوس ہونے لگی اب اتنے برسوں کے بعد جھوٹ کیوں بولوں! اس گدگدی میں میرے لیے خفت ضرور تھی مگر لذت بھی تھی۔ مجھے ان دیدہ دلیروں پر غصہ آرہا تھا اور ساتھ ہی ان کی نظر بازی میں مزا بھی آرہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہر عورت کی فطرت میں یہ تضاد پایا جاتا ہے کہ ایک طرف تو وہ چاہتی ہے کہ اس کے حسن کو سراہا جائے لیکن جب حسن پرست دیدہ بازی سے آگے بڑھ کر پیش دستی پر اتر آتے ہیں تو وہ برداشت نہیں کر پاتی جیسے، جیسے ایسے موقعوں پر عورت کا غصہ کم ہوتا جاتا ہے اور اسے زیادہ مزا آنے لگتا ہے، وہ طوائف بن جاتی ہے......خواہ وہ کوٹھے پر رہتی ہو یا کسی کوٹھی میں، خواہ وہ پشواز پہن کر محفل میں مجرا کرتی ہو یا سلیکس پہن کر ہاسٹل روم میں انگریزی ناچ ناچتی ہو......

سو میں طوائف زادی سے طوائف بن گئی اور میری پان کی تھالی میں چاندی کے روپوں کے بعد دس کے نوٹ اور دس کے نوٹوں کے بعد سو کے نوٹ پڑنے لگے، سارے شہر میں میرا شہرہ ہوگیا۔ شام کو ہمارے کوٹھے پر بھیڑ لگنے لگی۔ بیوپاری، رئیس، طالب علم، شاعر اور ادیب، چھوٹے موٹے نواب، سب ہی پیاری کا گانا سننے آنے لگے۔ دو چار نے مجروں کے بعد میل، ملاپ بڑھانے کی بھی کوشش کی لیکن ماں نے خوب صورتی سے ٹال دیا یہ کہہ کر کہ ابھی تو میری پیاری بچی ہی ہے۔

مگر ایک شام کو میں مجرے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ میری ماں نے کہا

''آج گھر میں محفل نہیں ہوگی' تجھے باہر جانا ہے۔''

''کہاں ماں؟''

''حضور نواب صاحب کے محل میں۔''

''کون' پرانے نواب صاحب؟''

''اری کس دنیا میں پڑی رہتی ہے؟ بڑے نواب صاحب کا تو دو مہینے ہوئے انتقال ہوگیا ہے۔ اب تو ولی عہد بہادر تخت پر بیٹھے ہیں......وہی نواب صاحب کہلاتے ہیں۔''

''تو میں ان کے محل میں کیا کروں گی؟''

''مجرا بھی ہوگا شاید! مگر آج تو حضور نے تجھے دیکھنے کو بلایا ہے۔''

اور پھر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے میری طرف غور سے دیکھا......میرے بالوں کو پھر سے سنوارا پھر میری بلائیں لے کر بولی۔

''قربان جاؤں بیٹی آج برسوں کی دعاؤں کے بعد پروردگار نے یہ دن دکھایا ہے۔ دیکھ ہزار، دو ہزار کا لالچ مت کیجیو......اگر تو نے ہوشیاری سے کام لیا تو تو جلد ہی شاہی محل میں راج کرے گی راج۔۔۔اور تیری ماں کے سب دلدر دور ہو جائیں گے۔''

میں اور کچھ پوچھنا چاہتی تھی' مگر ایک دم ایک موٹر کا ہارن بجنے کی آواز آئی۔

''لے بسم اللہ کر، تیرے لیے نواب صاحب نے خاص اپنی موٹر بھیجی ہے۔''

میں نیچے اتری تو میں نے دیکھا میرے سپنوں میں اڑنے والی موٹر ہمارے کوٹھے کے

سامنے سڑک پر کھڑی ہے، برابر میں فوجی قسم کی وردی پہنے ایک ڈرائیور کھڑا پان کھا رہا تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا اس لیے اس کی صورت تو نظر نہ آئی مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش نہیں تھا۔ اس نے موٹر کا دروازہ کھولا اور میں پچھلی سیٹ کے مخملی گدّوں پر بیٹھی ہی تھی کہ دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا اس دھڑاکے میں غصہ بھی تھا اور نفرت بھی۔

موٹر روانہ ہوئی تو اس تیز رفتاری سے کہ میں تو سمجھی کہ محل میں پہنچنے سے پہلے ہی ٹکر ہو کر میرا کام تمام ہو جائے گا۔ اس نے نہ سڑک پر بھیڑ کی پرواہ کی نہ پولیس والوں کے اشارے کی۔ مستقل ہارن بجاتا، لوگوں کو تتر بتر کرتا چلا گیا۔ ایک موڑ پر تو اتنی تیزی سے پہیہ گھمایا کہ سیٹ پر سے اچھل کر میرا سر پہلے چھت اور پھر دروازہ سے ٹکرایا۔

''ارے بھائی ذرا سنبھال کے''

میں چلائی......

''میں تمھاری جیسیوں کا بھائی نہیں ہوں''

اس نے موٹر کی رفتار کسی قدر کم کرتے ہوئے کہا......

ان دو لفظوں ''تمھاری جیسیوں'' میں اتنی حقارت اور اتنی نفرت بھری ہوئی تھی کہ میں غصے سے کانپ اٹھی' جی چاہتا تھا کہ اسے کچھ الٹا سیدھا سنا دوں مگر اسی وقت میں نے دیکھا کہ موٹر محل والی سڑک کو چھوڑ کر شہر کے باہر کی طرف جا رہی ہے۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

میں گھبرا کر چلائی

''یہ محل کا راستہ نہیں ہے۔''

''ابھی سے تمھیں محل کے راستے معلوم ہو گئے؟''

اور یہ کہتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ موٹر کے اندر اندھیرا تھا، مگر اس نے کوئی بٹن دبایا اور روشنی ہو گئی پہلی بار میں نے اس کی صورت دیکھی۔ کوئی چوبیں پچیس برس کا جوان تھا۔ گورا رنگ گہری گہری چمکیلی آنکھیں، چھوٹی چھوٹی مونچھیں اور موٹے، طنز بھرے ہونٹ۔ اس نے پہلی بار میری صورت دیکھی اور شاید اسے بری نہیں لگی کیونکہ اس کے ہونٹوں کا طنز ایک دھیمی

سی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ ڈرائیور تو مڑ کر میری طرف دیکھ رہا ہے اور موٹر سڑک چھوڑ کر خطرناک تیزی کے ساتھ کنارے لگے ہوئے پیڑوں کی طرف جا رہی ہے میں نے ایک چیخ ماری، دفعتاً بریک لگنے کی آواز آئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ موٹر ایک بڑے، موڑ سے چند انچ کے فاصلے پر رک گئی مگر اس تمام عرصے میں ڈرائیور نے اپنی آنکھیں میرے چہرے سے نہیں اٹھائیں۔

میں غصے سے بولی

''تم بالکل پاگلوں کی طرح موٹر چلاتے ہو......اگر میں مر جاتی تو؟''

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تو ہمارے سرکار کی دو چار لاکھ روپے کی بچت ہو جاتی۔''

میں نے پوچھا

''کیا مطلب......؟''

سگریٹ کا دھواں میری طرف چھوڑتے ہوئے وہ بولا:

'' مطلب یہ کہ ہمارے سرکار اپنا روپیہ لٹانے کے لیے کوئی نہ کوئی زہریلی، سنہری ناگن ڈھونڈ ہی نکالتے ہیں۔''

اور پھر موٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا:

''تم پہلی تھوڑا ہی ہو کیا......''

میں نے پوچھا

''اور کون ہیں؟''

وہ سامنے دیکھتے ہوئے موٹر چلاتا رہا اور بولتا رہا۔

''ہیں— نہیں تھیں......ولی عہدی کے زمانے سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ آج ایک تو کل دوسری— ایک اینگلو انڈین لڑکی پر کئی لاکھ لٹائے، بمبئی میں ایک فلم ایکٹریس کو ہیروں کا ہار دے ڈالا۔ لندن گئے تو وہاں سے ایک ڈانسر بھگا لائے۔ اس نے کتنے ہزار پاؤنڈ وصول کیے۔ واپس آئے تو ایک فرانسیسی لڑکی کو سکریٹری بنا کر ساتھ لے آئے جو شاہی جواہرات چرا کر بھاگ گئی،

تمھاری جیسوں کی تو گنتی ہی نہیں درجنوں کی تعداد ہے اور ہر ایک دس، بیس ہزار وصول کر چکی ہے......"

میں نے جل کر کہا

"تم جیسوں سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"طوائفیں اور کیا"

اور اس نے طوائفیں کے لفظ کو ایسے ادا کیا جیسے تے کر رہا ہو۔

"تمھیں طوائفوں سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

میں نے پوچھا۔

وہ بولا:

"اس لیے کہ دلاور خاں اپنے مالک کا خیر خواہ ہے۔ عمر بھر ان کا نمک کھایا ہے۔ میرا باپ بڑے نواب صاحب کا ڈرائیور تھا۔ میں ولی عہد کے زمانے سے چھوٹے نواب صاحب کے ساتھ رہا ہوں یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے کہ واہ پنا روپیہ اور جوانی بازاری عورتوں پر لٹا رہے ہیں۔"

میں غصے میں بھری ہوئی بولی۔

"اور اس میں قصور کس کا ہے؟ ان کا جن کو تم بازاری عورتیں کہتے ہو یا تمھارے نواب صاحب کا؟"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ایسا لگا جیسے اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا ہو اور اتنے میں موٹر ایک عالیشان بنگلے کی برساتی میں جا کر رک گئی۔

یہ نواب صاحب کا خاص محل نہیں تھا بلکہ شہر سے دور جنگل میں ان کی شکار گاہ تھی، دیواروں پر بارہ سنگھوں اور جنگلی بھینسوں کے سر لگے ہوئے تھے، شیروں، چیتوں کی کھالیں لٹکی ہوئی تھیں، پرانے زمانے کے تیر کمان، ڈھال، تلوار، زر بکتر سجے ہوئے تھے۔ موجودہ نواب کے والد کو شکار کا بہت شوق تھا وہ کافی وقت اپنی شکار گاہ میں بسر کرتے تھے، ان کی نشانہ بازی کا بہت شہرہ تھا اور کہا جاتا تھا کہ ان کی اور ان کے شکاریوں کی رائفلوں نے جنگل کے جنگل صاف کر دیے تھے۔ مگر لگتا تھا چھوٹے صاحب کو کسی اور قسم کے شکار کا شوق ہے۔ ہر طرف دیواروں پر ننگی عورتوں کی

قد آدم تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ کتنی تو اتنی بے حیائی کے انداز میں تھیں کہ میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گئی سمجھ میں نہ آئے کہ کدھر دیکھوں۔ جدھر نظر جاتی تھی بے حیائی کے اشتہار نظر آتے تھے۔ آپ کہیں گے "تو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ طوائف کو دیکھو پاکبازی کا جامہ پہننے کی کوشش کر رہی ہے۔" لیکن بات یہ ہے حضور، میں بہت ٹھسے دار خاندانی گانے والی کی بیٹی ہوں، کسی گھٹیا ٹکیائی رنڈی کی نہیں۔ طوائف کے گھر میں بے شری کی بات چیت بھی تہذیب کے دائرے میں ہوتی ہے۔ ان تصویروں میں تو ایسا لگتا تھا عورتیں نہیں ہیں بوچڑ خانے میں کٹی ہوئی گایوں، بکریوں کو کھال اتار کر لٹکا دیا ہے۔

دلاور خاں ڈرائیور تو موٹر کے پاس برساتی ہی میں رہ گیا تھا اور اب مجھے نواب صاحب کا ایک ملازم خاص ساتھ لیے جا رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا چندھی آنکھوں والا آدمی تھا راستے ہی میں مجھ سے کہنے لگا۔

"پیاری— میری جان۔ مجھے مت بھولنا۔ میرا نام ہے عزت بیگ نواب صاحب سے تیری سفارش میں نے ہی کی ہے پوری کمیشن لوں گا ہاں......"

میں ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ ہم نواب صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئے اور عزت بیگ مجھے چھوڑ کر نواب صاحب کو اطلاع دینے چلا گیا۔ چاروں طرف دیواروں پر قد آدم شیشے لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف مجھے اپنی ہی صورت گھورتی ہوئی نظر آئی کیونکہ شیشے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ سو ایک عکس دوسرے میں اور دوسرے کا تیسرے میں، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پیاری کی بجائے درجنوں پیاریاں ان آئینوں میں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ وہ لندن کی ناچنے والی میم، وہ کلکتے والی اینگلو انڈین چھوکری، وہ بمبئی کی فلم ایکٹرس...... وہ فرانسیسی سکریٹری اور وہ ساری کی ساری مجھ جیسی بے نام طوائفیں اور طوائف زادیاں۔ ان سب نے ان شیشوں میں اپنے عکس دیکھے ہوں گے اور ایک پل کے لیے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ سب عورتیں جن کا دلاور خاں نے ذکر کیا تھا ابھی تک وہاں قید ہیں اور ان شیشوں میں سے جھانک کر مجھے گھور رہی ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں شیش محل میں نہیں ہوں بلکہ بھوت خانے میں ہوں اور میرا جی چاہا میں وہاں سے بھاگ جاؤں مگر اسی وقت اندر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ہر آئینے میں مجھے نواب صاحب کا پیلا اور قبل

از وقت مرجھایا ہوا چہرہ نظر آیا۔

میں نے سنا تھا نواب صاحب نوجوان ہیں مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ نہ جانے کہاں— اور کیسے— اور کس بازار میں اپنی جوانی کو بیچ آئے ہیں۔ نہ چہرے پر رونق تھی نہ آنکھوں میں چمک کمر میں خم آچکا تھا۔ آنکھوں میں یقیناً شراب کی کثرت سے لال لال ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ چال لڑکھڑاتی ہوئی۔ شاید سرشام ہی خم لنڈھا چکے تھے۔ میں جھک کر آداب بجالائی......

وہ میری طرف بڑھے، ان کی نگاہیں مجھ پر تھیں، میرے انگ انگ کا معائنہ کر رہی تھیں، جیسے قصائی بکری کی جانچ کرتا ہے، مگر ایک طوائف زادی ایسے جائزے کی عادی ہوتی ہے، وہ جانتی ہے کہ جس بازار میں وہ بکتی ہے وہاں ہر گاہک سودا کرنے سے پہلے اسی طرح اپنی نگاہوں سے اس کے بدن کے ہر حصے کو چھو کر ٹٹول کر دیکھتا ہے۔

معائنہ کرتے کرتے نواب صاحب میرے اتنے قریب آگئے کہ ان کا گرم گرم وہسکی کے بھبکے والا سانس میں اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی تھی۔ مگر جلد ہی وہ کھڑے کھڑے تھک گئے اور کرسی پر بیٹھ کر بولے۔

''ہمیں تم پسند آئیں......''

میں نے تین بار جھک کر دوبارہ سلام کرتے ہوئے کہا

''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے سرکار ورنہ یہ لونڈی کس قابل ہے۔''

ماں نے ایسے موقع کے لیے مجھے یہی جملہ رٹایا ہوا تھا۔

پھر انھوں نے فرمایا

''دیکھو پیاری آج ہم تھکے ہوئے ہیں ان دنوں طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ نیند نہیں آتی اور ڈاکٹروں نے بھی منع کیا ہے۔''

میں سچ مچ گھبرا کر بولی۔

''حضور تو پھر آپ آرام فرمائیے میں پھر کبھی مجرے کے لیے حاضر ہو جاؤں گی۔''

وہ مسکرائے اور کہا۔

''ابھی تم بہت بھولی ہو پیاری مگر سنا ہے گاتی خوب ہو سناؤ کچھ۔

میں نے عذر پیش کیا کہ بنا سازندوں کے مجرے میں مزا نہیں آئے گا مگر نواب صاحب بولے ''ہمیں تمھاری آواز سننے سے غرض ہے، سارنگی کی ریں ریں سننے سے نہیں پھر مسند پر نیم دراز ہوتے ہوئے انھوں نے حکم دیا۔

'گاؤ'

اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

یہ مجرا بھی میرے لیے عجیب و غریب تھا۔ نہ سارنگی کا سہارا نہ طبلے کی تھاپ، نہ بدن پر پشواز نہ پاؤں میں گھونگرو، مگر شاہی حکم کو کیسے ٹالتی، چاروناچار گانا ہی پڑا......دھیمی آواز میں ایک دھن چھیڑی، یاد نہیں کون سی ٹھمری تھی۔ جب گانا ختم ہوا تو دیکھا کہ نواب صاحب خراٹے لے رہے ہیں۔ ان کی نیند میں مخل نہ ہوں، اس لیے میں نے سوچا کہ دبے پاؤں کمرے سے نکل جاؤں مگر اسی وقت خراٹوں کا سُر تبدیل ہوا اور آنکھیں کھولے بغیر انھوں نے حکم دیا

''خاموش کیوں ہوگئیں، گاتی رہو جب تک ہم تمھیں گانا بند کرنے کا حکم نہ دیں۔''

سورات بھر یہ عجیب و غریب مجرا چلتا رہا۔ ٹھمری کے بعد غزل، غزل کے بعد ترانہ، ترانہ کے بعد قوالی۔ سانس لینے کو ذرا رک جاتی تو نواب صاحب کے خراٹوں میں فوراً تبدیلی ہوجاتی اور میں ڈر کے مارے پھر کوئی نئی چیز چھیڑ دیتی۔ سو پھر ایک اور غزل، پھر ایک اور ٹھمری پھر ایک اور غزل، غالب کے بعد داغ، داغ کے بعد سودا۔ پھر میر پھر غالب اور اس تمام عرصے میں نواب صاحب سوتے رہے اور ان کے شاہی خراٹے میرے گانے میں سر، تال دیتے رہے۔ یہاں تک کہ دور گاؤں میں مرغے اذان دینے لگے۔ آموں کے باغوں میں کوئل صبح کا ترانہ گانے لگی اور کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے آسمان پر پھیلتا ہوا اجالا دکھائی دینے لگا۔ گاتے گاتے میرا گلا سوکھ گیا، سر میں چکر آنے لگے، کھڑے کھڑے ٹانگیں سن ہوگئیں اور میں گاتی رہی مگر آخر کار گلے نے جواب دے دیا اور پیر لڑکھڑانے لگے۔ کمزوری کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی اور گرتے گرتے مجھے کرسی کا سہارا لینا پڑا میں نے سوچا سرکار تو آرام سے سو رہے ہیں میں پانچ منٹ سستا لوں مگر سوجی ہوئی ٹانگوں کو سہارا دینے کے لیے کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ نواب صاحب کی آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

میں ڈر کے مارے کرسی سے اچھل کر کھڑی ہوگئی اور پھر بالکل بے سری آواز میں گانے لگی۔

''مرلی والے شیام''

مگر نواب صاحب نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

''بس رہنے دو......''

میں خوف کے مارے کانپ رہی تھی کہ نہ جانے کیا سزا ملے گی مگر نواب صاحب کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر جان میں جان آ گئی۔ فرمانے لگے۔

''شاباش پیاری تم بہت اچھا گاتی ہو۔''

میں نے پھر ماں کا سکھایا ہوا سبق دہراتے ہوئے کہا۔

''یہ تو سرکار کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ لونڈی کس قابل ہے۔''

اور دل میں سوچا مگر نواب صاحب نے تو میرا گانا سنا ہی نہیں وہ تو برابر سوتے رہے۔ پھر انھوں نے فرمایا۔

''جانتی ہو آج کتنی دنوں بعد نیند آئی ہے، تمھاری آواز میں تو شراب سے بھی زیادہ نشہ ہے۔ مانگو کیا مانگتی ہو۔''

کہانیوں میں سنا تھا کہ جب بادشاہ کسی سے خوش ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مانگ کیا مانگتی ہے اور کم سے کم کہانیوں میں ہمیشہ وہ چیز مل ہی جاتی ہے۔ چاہے وہ شہزادی سے شادی ہو، یا سات دن کی بادشاہت یا صرف جاگیر اور انعام ہو، لیکن آج میں خود یہ لفظ ایک بادشاہ کی زبانی نہیں تو کم از کم ایک نواب کی زبانی سن رہی تھی، میرے جی میں آیا کہہ دوں مجھے پچاس ہزار روپے دیدیجیے ایک عالیشان مکان بنوا دیجیے تا کہ باقی تمام زندگی ماں اور میں آرام سے کاٹ سکیں اور روز روز ہرایرے غیرے نتھو خیرے کے لیے ناچنا نہ پڑے۔ نہیں یہ سب کچھ نہیں میری اصلی دلی خواہش جو تھی وہ کیوں نہ ظاہر کردوں کہوں سرکار مجھے اپنی یہ بڑی والی موٹر دے دیجیے جس میں رات کو دلاور خاں مجھے یہاں لے کر آیا تھا۔ مگر دلاور خاں کا خیال آتے ہی مجھے وہ ساری بات چیت یاد آ گئی جو راستے میں ہوئی تھی اور اس کا وہ نفرت اور حقارت بھرا لہجہ یاد آ گیا

جس میں اس نے تم جیسیوں کہا تھا، جیسے قے کر رہا ہو۔ اور مجھے یاد آگیا اس نے کہا تھا تم جیسیوں کی تو گنتی ہی نہیں اور ہر ایک دس بیس ہزار روپے وصول کر چکی ہے اور پھر اس نے یہ بھی تو کہا تھا ہمارے سرکار اپنا روپیہ لٹانے کے لیے کوئی نہ کوئی سنہری ناگن ڈھونڈ ہی نکالتے ہیں۔ تم پہلی تھوڑا ہی ہو............ اور نہ جانے کیوں مجھے اس وقت یہ خیال آیا میں کوئی ایسی بات کر دوں جس سے میرے بارے میں دلاور خاں کی رائے غلط ثابت ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ اب تک ایک کانٹے کی طرح میرے دل میں کھٹک رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ جو اس نے کہا تھا وہ غلط نہیں تھا سو میں نے کہا

''سرکار کی خدمت کرنا میرا فرض ہے میرے گانے سے حضور کو سکون ملا نیند آگئی بس لونڈی کے لیے یہی سب سے بڑا انعام ہے۔ اور کچھ نہیں چاہیے۔''

یہ سن کر نواب صاحب تھوڑی دیر کے لیے حیران رہ گئے۔ شاید اس لیے کہ ان کو یہ جواب سننے کی توقع نہیں تھی۔ پھر وہ مسکرا کر بولے:

''اچھا تو آج سے ہر رات تم یہاں آیا کرو۔ بس یہ تمھاری ڈیوٹی ہے۔ اب تم جا سکتی ہو۔''

اور یہ کہہ کر انھوں نے تالی بجائی اور الہ دین کے چراغ والے جن کی طرح عزت بیگ وہاں نمودار ہو گیا۔ نواب صاحب ایک لفظ بولے بغیر اندر چلے گئے۔

باہر جاتے جاتے عزت بیگ نے مجھ سے کہا

''میں سب سن رہا تھا، میرے کمیشن پر تم نے پانی پھیر دیا، تم بہت بیوقوف ہو۔''

اور پھر کچھ سوچ کر بولا:

''یا بہت ہوشیار ہو''

برساتی میں موٹر اسی جگہ کھڑی تھی اور چلانے والے پہیے پر سر رکھے دلاور خاں سو رہا تھا، عزت بیگ نے اسے جھنجھوڑا تب وہ اللہ کر کے اٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے موٹر کا اسٹارٹر دبایا اور جب موٹر شہر کی سڑک پر آگئی تب دلاور خاں، اسی پرانے حقارت بھرے انداز میں بولا:

''رات بھر رہی ہو کیوں کتنی رقم وصول کی؟''

میں نے بظاہر لاپرواہی سے جواب دیا۔

'ایک روپیہ بھی نہیں۔'

اور دل ہی دل میں سوچا اسی جواب کے لیے تو میں خالی ہاتھ جا رہی ہوں۔''

وہ بولا

'ہوں تو پھر کیا جاگیر مانگ لی۔'

''گھر بھی نہیں بنوایا، موتیوں کا ہار بھی وصول نہیں کیا اور تو اور یہ موٹر بھی نہیں مانگی اور اس کا ڈرائیور بھی نہیں مانگا۔''

وہ جل کر بولا۔

''یہ موٹر سولہ ہزار میں ملتی ہے مگر اس کا ڈرائیور بکاؤ نہیں ہے اور کسی قیمت پر بھی کوئی رنڈی اسے خرید نہیں سکتی سمجھیں اور میں یہ ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں کہ تم بالکل خالی ہاتھ جا رہی ہو۔''

میں نے جل کر کہا

''تو پھر بھاڑ میں جاؤ۔''

اس کے بعد سارے راستے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی رات بھر کی جاگی اور تھکی ہوئی تھی، نرم نرم گدوں پر سر رکھ کر سو گئی۔ جب موٹر ایک جھٹکے کے ساتھ گھر پر ٹھہری تب آنکھ کھلی میں ڈرائیور سے کچھ کہے بغیر کوٹھے کا زینہ چڑھنے لگی، موٹر کا دروازہ، دھڑ سے بند ہونے کی آواز آئی جیسے دلاور خاں مجھے گالی دے رہا ہو مگر جب مڑ کر دیکھا تو موٹر جا چکی تھی اور اس کا ڈرائیور بھی۔

ماں جو رات بھر میرے انتظار میں بیٹھی رہی تھی، مجھے دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائی میری بلائیں لے کر بولی۔

''قربان جاؤں آج خدا نے یہ دن دکھایا ہے۔''

ماں کا مطلب سمجھ کر میں نے جلدی سے کہا۔

''رات بھر کھڑی، کھڑی گانے پر گانا سناتی رہی اور سرکار سوتے رہے۔''

یہ سن کر ماں کا چہرہ اتر سا گیا۔ کسی قدر بجھی ہوئی آواز میں وہ بولی

''پھر کچھ انعام ملا''

میں نے کہا

''نہیں، سرکار نے فرمایا تھا مانگو کیا مانگتی ہو مگر میں نے کہا سرکار کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ میرے گانے سے حضور کو سکون ملا، نیند آ گئی۔ بس لونڈی کے لیے یہ سب سے بڑا انعام ہے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

میرا خیال تھا کہ ماں خفا ہو گی کہ انعام کیوں نہیں لیا مگر اس نے کہا 'شاباش' تو بڑی سمجھدار ہے۔ حضور نے پھر بلایا ہے۔ نا؟

میں نے بتایا

'ہاں' ہر شام کو آنے کو کہا ہے۔

ماں نے خوش ہو کر کہا:

''بس تو سمجھ لے بازی مار لی یاد رکھیو تو ایک دن شاہی محل کی بیگم بن کر رہے گی۔''

اگلے دن شام کو پھر وہی موٹر ہمارے کوٹھے کے نیچے کھڑی تھی۔

راستے میں دلاور خاں بولا۔

''عزت بیگ کہتا ہے کہ سچ مچ تو نے سرکار سے کوئی انعام نہیں مانگا۔''

میں نے کہا

''ہاں تو اور کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟''

وہ بولا ''میں تم جیسیوں کے ہتھکنڈے خوب سمجھتا ہوں۔ اس طرح اپنی قیمت بڑھانا چاہتی ہو۔''

میرے دل میں آیا کہ کہوں، دلاور خاں مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو۔ پھر میں نے سوچا اس کا خیال کچھ اتنا غلط بھی تو نہیں۔ میری ماں بھی تو یہی سمجھتی ہے کہ میں نے قیمت بڑھانے کے لیے اس طرح انکار کیا۔ اب یہ اسے کیسے سمجھاؤں کہ دلاور خاں تمھارے لیے تمھاری نظر میں اپنی قیمت بڑھانے کے لیے میں نے انعام لینے سے انکار کیا ہے۔

اس رات بھی نواب صاحب مسند پر دراز ہو کر خراٹے لیتے رہے اور میں کھڑی مختلف گانے گاتی رہی، صبح سویرے وہ اٹھے اور مجھ سے کچھ کہے بغیر اندر محل میں چلے گئے۔ باہر جاتے

ہوئے عزت بیگ نے میرے کان میں کہا:

'چھوکری! مجھے لگتا ہے تو بڑی ہوشیار بھی ہے اور خوش قسمت بھی، وقت آنے پر میرا کمیشن نہ بھولنا۔"

راستے میں دلاور خاں کافی دیر تک خاموشی سے موٹر چلاتا رہا۔ اس کے سامنے جو شیشہ لگا ہوا تھا آنے جانے والی گاڑیوں کو دیکھنے کے لیے اس میں میں نے دیکھا وہ آج پہلے سے زیادہ سنجیدہ اور فکرمند ہے۔ پھر وہ بولا، آج اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

"کیوں جی رات بھر کھڑے گاتی ہو تم تھکتی نہیں؟"

میں نے کہا:

"انسان ہوں تھکتی کیسے نہ مگر تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

وہ بولا:

"میں چپکے سے جھانک رہا تھا۔ سرکار سو رہے تھے اور تم گا رہی تھیں۔ ایک بار دم لینے کو بھی نہیں رکیں۔"

میں نے کہا:

'رکتی تو سرکار کی آنکھ جو کھل جاتی۔'

مجھے ایسا معلوم ہوا وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ مگر کہتے کہتے وہ رک گیا۔ پھر بولا "اچھا اب تم آرام کرلو شہر پہنچنے میں گھنٹہ بھر لگے گا میں موٹر آہستہ چلاؤں گا۔"

میں نے آنکھیں بند کرلیں مگر مجھے چلتی گاڑی میں نیند نہ آئی برابر یہی سوچتی رہی کہ دلاور خاں کو کیا ہوگیا ہے؟ اس کی وہ پرانی سختی اور نفرت کیا ہوئی۔ ایک بار مجھے یہ محسوس ہوا کہ گاڑی آہستہ آہستہ چلتے چلتے رک گئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی ہے اور دلاور پیچھے مڑ کر مجھے دیکھ رہا ہے۔ مگر جیسے ہی اس نے دیکھا میں جاگ رہی ہوں وہ کچھ کھسیا سا گیا میں نے پوچھا:

"کیوں کیا ہوا گاڑی کیوں روک دی؟"

وہ بولا

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں......وہ انجن میں کچھ خرابی تھی۔''

میں اس کا سٹپٹایا سا انداز دیکھ کر ہنس پڑی۔

''موٹر کے انجن میں خرابی ہے یا تمھاری عقل کے انجن میں؟''

اور پھر گاڑی چل پڑی اور جلدی گھر آ گیا۔

اب یہ ہر روز کا معمول ہو گیا۔ شام کے سات بجے گاڑی آتی، آٹھ بجے نواب صاحب کے بنگلے پر پہنچتی، دو تین گھنٹے مجھے انتظار کرنا پڑتا، دس گیارہ بجے نواب صاحب شراب پیے ہوئے آتے اور مجھے گانا شروع کرنے کا حکم دے کر مسند پر دراز ہو جاتے، میں گاتی رہتی اور وہ سوتے رہتے۔ صبح سویرے یہ عجیب و غریب مجرا ختم ہوتا اور پھر وہ اٹھ کر چلے جاتے اور میں دلاور خاں کے ساتھ موٹر میں گھر واپس آ جاتی اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس کے لہجے میں ایک نئی نرمی آتی گئی۔ وہ راستہ بھر موٹر آہستہ چلاتا کہ میں کچھ دیر سو لوں، مگر رات بھر کی تھکاوٹ کے باوجود مجھے نیند نہ آتی اور میں دلاور خاں کے بارے میں سوچتی رہتی کیونکہ اس کے کردار میں مجھے ایک تبدیلی نظر آئی۔ اب وہ اپنے نواب صاحب کے بارے میں پہلے کی طرح بات نہ کرتا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

''کیوں دلاور خاں تمھاری شادی ہو چکی ہے؟''

وہ ہنس کر بولا

''نہیں جی مجھ جیسے کو کون بیٹی دے گا۔''

میں نے کہا

''کیوں' تم میں کیا خرابی ہے۔''

اس نے کہا:

''سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ تنخواہ صرف پچاس روپے ماہوار ہے۔ اس میں سے پچیس روپے بوڑھے ماں باپ کو بھیجتا ہوں باقی پچیس روپے میں کیا خود کھاؤں گا کیا بیوی کو کھلاؤں گا۔''

میں نے کہا:

''پھر سرکار سے کیوں نہیں کہتے تمھاری تنخواہ بڑھا دیں تم تو ان کے بڑے پرانے وفادار

ملازم ہو۔''

وہ بولا:

'کہا تھا'

میں نے پوچھا:

'پھر'

''پھر یہ کہ سرکار کہنے لگے دیکھو ولاور یہ نئی گورنمنٹ جو بنی ہے اس نے ہم لوگوں کو بہت تنگ کر رکھا ہے۔ سب راجوں مہاراجوں کی آمدنی گھٹا دی ہے میں تو اسی لیے اس سال ولایت میں نہ جاسکا محل کے ملازموں میں بھی تخفیف کرنی پڑ رہی ہے۔''

یہ کہہ کر تھوڑی دیر وہ خاموش رہا اور پھر بولا

یہ نواب لوگ بھی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔

میں نے کہا:

'کیوں' اس لیے کہ تمھاری تنخواہ نہیں بڑھائی۔

وہ بولا:

نہیں' اس لیے کہ سرکار تو خود آرام سے سو جاتے ہیں اور تمھیں رات بھر کھڑے گانا پڑتا ہے۔

اتنے میں ہمارا گھر آ گیا اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

اس رات کو نواب صاحب معمول سے زیادہ شراب پی کر آئے میں نے جھک کر سلام کیا اور پوچھا۔

''حضور ٹھمری پیش کروں یا غزل؟''

انھوں نے فرمایا

''آج ہمارا گانا سننے کا موڈ نہیں ہے پیاری بیٹھ جاؤ۔''

میں نے عرض کیا

''لونڈی یہ جرأت کیسے کرسکتی ہے کہ سرکار کھڑے ہیں اور میں بیٹھ جاؤں۔''

اس پر وہ بولے

''پیاری اب ایسا ہی زمانہ آیا ہے۔تم خاندانی طوائف ہو، مجھے تو دو ٹکے کے آدمیوں کے لیے کھڑا رہنا پڑتا ہے۔''

میں نے کہا

''حضور کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا کس کی جرأت ہوسکتی ہے کہ سرکار کے سامنے ایسی گستاخی کر لے؟''

یہ سن کر وہ ہنس پڑے۔

''پیاری تو سچ مچ بڑی پیاری ہے بڑی بھولی ہے کیا تجھے معلوم نہیں دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ آسمان زمین پر آ رہا ہے۔زمین آسمان پر جا رہی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑے۔ میں سمجھی آج زیادہ پی گئے ہیں اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں مگر ہنستے ہنستے وہ خاموش ہو گئے اور پھر گہرے سنجیدہ انداز میں بولے

''کیا تو نہیں جانتی کل کے بیٹے اور وکیل اور ہزار روپلی پانے والے گورنمنٹ کے افسر آج ہم نوابوں، راجوں پر حکومت کرتے ہیں۔ایک ایک پیسے کے لیے ہمیں ان کی اجازت لینی پڑتی ہے۔معلوم ہے آج کیا ہوا؟''

میں نے سوچا آج کوئی بہت ہی سنگین واقعہ ہوا ہوگا جو سرکار اتنے پریشان ہیں مگر میں خاموش رہی،نواب صاحب فرمانے لگے۔

''دلی سے سرکار نے اپنا ایک منسٹر یہاں بھیجا ہے مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے کہ پنشن لے کر ریاست سے دست بردار ہو جاؤں۔سلطان آباد جیسی چھوٹی ریاستوں کو بڑے صوبہ میں ملایا جا رہا ہے ہم جانتے تھے کہ انگریز کے جانے کے بعد یہ برا وقت ہم پر پڑے گا مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ بادشاہوں کی اولاد کی اتنی توہین ہوگی۔''

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں پھر خاموش رہی نواب صاحب کے گلاس میں اور شراب انڈیلی اور سوڈا ملا کر پیش کی۔ایک بڑا گھونٹ پی کر انھوں نے فرمایا:

''جانتی ہو پیاری اس منسٹر کا باپ کون تھا؟ ایک معمولی دوکاندار یعنی بنیا اور یہ خود پہلے

معمولی وکیل تھا۔ پھر گاندھی کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر جیل گیا وہاں سے نکل کر کھدر کی دوکان کرتا تھا اور آج اس آدمی کے استقبال کے لیے مجھے اسٹیشن جانا پڑا اور بعد میں بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے ملنے محل میں آئے اس نے مجھے مہمان خانے میں بلایا جہاں اسے ٹھہرایا گیا ہے۔ اور جانتی ہو میں کون ہوں؟ فرزند دلبند دولت انگلشیہ آفتاب الملک سلطان ابن سلطان نواب سرعظیم الدولہ کو ہاتھ باندھ کر اس بلیے کے لونڈے کے سامنے حاضر ہونا پڑا۔ اس ریاست میں دس پشتوں سے ہمارے خاندان نے راج کیا ہے مگر اس واقعے کے بعد میں کیا منہ لے کر سلطان آباد میں رہ سکتا ہوں، سو جو کاغذ اس نے میرے سامنے رکھا اس پر میں نے دستخط کر دیے اور کل میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

یہ سن کر میرے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ نواب صاحب ہمیشہ کے لیے سلطان آباد چھوڑ کر چلے جائیں گے یہ تو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ مگر اس کے بعد جو نواب صاحب نے کہا وہ سن کر تو میں بالکل اچنبھے میں پڑ گئی فرمانے لگے:

"پیاری میں بمبئی جا رہا ہوں تو چلے گی میرے ساتھ؟"

حسب عادت میں نے کہا:

"حضور کی خدمت کرنا تو میری عین خوش قسمتی ہے بھلا سرکار کے حکم کو کیسے ٹال سکتی ہوں؟"

مگر نواب صاحب نے کہا:

"آج سے ہم تمھیں یا کسی کو حکم دینے کے قابل نہیں ہیں اب سلطان آباد کے نواب نہیں، ایک معمولی آدمی تم سے پوچھ رہا ہے پیاری کیا عمر بھر تم میرے ساتھ گزارہ کر سکتی ہو؟ مگر فوراً جواب دینا ضروری نہیں، اپنی ماں سے پوچھ لو اور کل سویرے مجھے جواب دو تم دونوں کے خرچ کے لیے عمر بھر ہزار روپے ماہانہ میں دے سکتا ہوں۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

میں نے پوچھا

کیا گانا نہ ہوگا حضور کو نیند کیسے آئے گی؟"

فرمانے لگے:

''آج کی رات ہم تمھارے گیت سن کر بھی نہیں سو سکتے آج ہم سونا بھی نہیں چاہتے۔آج سلطان آباد میں ہماری آخری رات ہے پیاری۔''

اور یہ کہہ کر وہ مجھے بھول گئے اور خالی گلاس قالین پر پھینک کر چلائے۔

''عزت بیگ ایک سلطانی پیگ اور''

گھر جاتے ہوئے راستے میں میں نے دلاور سے پوچھا

''کیا تم بھی بمبئی جا رہے ہو، سرکار کے ساتھ؟''

وہ بولا:

نہیں یہ میری نوکری کا آخری دن ہے کل سے مجھے جواب مل گیا ہے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا

''کیوں تم تو سرکار کے خاص ڈرائیور ہو۔''

وہ سامنے دیکھ کر موٹر چلاتا رہا اور بولتا رہا

''یہ عمر بھر کی خدمت کا انعام ملا پیاری تین مہینے کی تنخواہ بھی نہیں دی۔''

میں نے اصرار سے پوچھا۔

''کیوں کوئی وجہ تو ہوگی۔''

اس کا جواب سن کر میں حیران رہ گئی۔

''وجہ تم ہی تو ہو۔''

میں نے چلا کر کہا:

''میں! مجھ سے کیا تعلق؟''

ایک جھٹکے کے ساتھ موٹر سڑک کے کنارے رک گئی اس نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا:

''کیوں بھولی بنتی ہو پیاری نواب صاحب کو معلوم ہوگیا ہے کہ میں...... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔عزت بیگ ان کو ہر بات کی رپورٹ دیتا ہے۔''

میں نے کہا'' تم تو طوائفوں سے نفرت کرتے تھے۔''

معمولی وکیل تھا۔ پھر گاندھی کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر جیل گیا وہاں سے نکل کر کھدر کی دوکان کرتا تھا اور آج اس آدمی کے استقبال کے لیے مجھے اسٹیشن جانا پڑا اور بعد میں بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے ملنے محل میں آئے اس نے مجھے مہمان خانے میں بلایا جہاں اسے ٹھہرایا گیا ہے۔ اور جانتی ہو میں کون ہوں؟ فرزند دلبند دولت انگلشیہ آفتاب الملک سلطان ابن سلطان نواب سر عظیم الدولہ کو ہاتھ باندھ کر اس بنیے کے لونڈے کے سامنے حاضر ہونا پڑا۔ اس ریاست میں دس پشتوں سے ہمارے خاندان نے راج کیا ہے مگر اس واقعے کے بعد میں کیا منہ لے کر سلطان آباد میں رہ سکتا ہوں، سو جو کاغذ اس نے میرے سامنے رکھا اس پر میں نے دستخط کر دیے اور کل میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

یہ سن کر میرے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ نواب صاحب ہمیشہ کے لیے سلطان آباد چھوڑ کر چلے جائیں گے یہ تو کبھی میرے وہم وگمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ مگر اس کے بعد جو نواب صاحب نے کہا وہ سن کر تو میں بالکل اچنبھے میں پڑ گئی فرمانے لگے:

"پیاری میں بمبئی جا رہا ہوں تو چلے گی میرے ساتھ؟"

حسب عادت میں نے کہا:

"حضور کی خدمت کرنا تو میری عین خوش قسمتی ہے بھلا سرکار کے حکم کو کیسے ٹال سکتی ہوں؟"

مگر نواب صاحب نے کہا:

"آج سے ہم تمھیں یا کسی کو حکم دینے کے قابل نہیں ہیں اب سلطان آباد کے نواب نہیں، ایک معمولی آدمی تم سے پوچھ رہا ہے پیاری کیا عمر بھر تم میرے ساتھ گزارہ کر سکتی ہو؟ مگر فوراً جواب دینا ضروری نہیں، اپنی ماں سے پوچھ لو اور کل سویرے مجھے جواب دو تم دونوں کے خرچ کے لیے عمر بھر ہزار روپے ماہانہ میں دے سکتا ہوں۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

میں نے پوچھا

کیا گانا نہ ہوگا حضور کو نیند کیسے آئے گی؟"

فرمانے لگے:

''آج کی رات ہم تمھارے گیت سن کر بھی نہیں سو سکتے آج ہم سونا بھی نہیں چاہتے۔آج سلطان آباد میں ہماری آخری رات ہے پیاری۔''

اور یہ کہہ کر وہ مجھے بھول گئے اور خالی گلاس قالین پر پھینک کر چلائے۔

''عزت بیگ ایک سلطانی پیگ اور''

گھر جاتے ہوئے راستے میں میں نے دلاور سے پوچھا

''کیا تم بھی بمبئی جارہے ہو، سرکار کے ساتھ؟''

وہ بولا:

نہیں یہ میری نوکری کا آخری دن ہے کل سے مجھے جواب مل گیا ہے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا

''کیوں تم تو سرکار کے خاص ڈرائیور ہو۔''

وہ سامنے دیکھ کر موٹر چلاتا رہا اور بولتا رہا

''یہ عمر بھر کی خدمت کا انعام ملا پیاری تین مہینے کی تنخواہ بھی نہیں دی۔''

میں نے اصرار سے پوچھا۔

''کیوں کوئی وجہ تو ہوگی۔''

اس کا جواب سن کر میں حیران رہ گئی۔

''وجہ تم ہی تو ہو۔''

میں نے چلا کر کہا:

''میں! مجھ سے کیا تعلق؟''

ایک جھٹکے کے ساتھ موٹر سڑک کے کنارے رک گئی اس نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا:

''کیوں بھولی بنتی ہو پیاری نواب صاحب کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں...... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔عزت بیگ ان کو ہر بات کی رپورٹ دیتا ہے۔''

میں نے کہا''تم تو طوائفوں سے نفرت کرتے تھے۔''

وہ بولا:

"اب بھی کرتا ہوں مگر تم اور طوائفوں کی طرح تو نہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا:

"کیسے معلوم؟"

اس نے کہا:

"بس معلوم ہے، تو پھر کیا کہتی ہو؟"

میں نے کہا:

"تمھارا سوال ہی نہیں معلوم جواب کیا دوں؟"

"سوال یہ ہے کہ کیا تم ہزار روپے ماہوار پر ایک نواب کی داشتہ بننے کے بجائے ایک موٹر ڈرائیور کی بیوی بننے کے لیے تیار ہو جس کی تنخواہ صرف سو روپے ماہوار ہے۔"

اس نے اچانک ہی یہ سوال کر دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں مدت سے اس بات کا انتظار کر رہی تھی مگر جواب مجھے معلوم نہیں تھا۔ سو بات ٹالنے کے لیے میں نے کہہ دیا۔

"لیکن تمھاری تنخواہ تو سو روپے نہیں صرف پچاس روپے ماہوار ہے اس میں کیا خود کھاؤ گے کیا بیوی بچوں کو کھلاؤ گے؟"

دلاور بولا:

"پچاس روپے ماہوار تو نواب صاحب کی موٹر چلانے کے ملتے تھے مگر کل سے سو روپے ماہوار پر میں جین اینڈ کمپنی کی موٹر چلانے کا کام کرنے والا ہوں۔ بولو منظور ہے؟"

اس واقعہ کو پانچ برس گزر چکے ہیں مگر وہ لمحہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ جب دلاور نے یہ سوال مجھ سے کیا۔ جھوٹ کیوں بولوں سچ تو یہی تھا کہ میں دل ہی دل میں اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ ممکن ہے کہ آپ کو تعجب ہو کہ ایک طوائف ایک نواب کے مقابلے میں ایک ڈرائیور سے کیسے محبت کر سکتی ہے لیکن طوائف بھی تو عورت ہوتی ہے سرکار، اور عورت کس سے اور کیوں — اور کتنی محبت کرتی ہے یہ شاید اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تجھے دلاور سے محبت کیوں ہو گئی تو اس کا جواب دینا میرے لیے مشکل ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ نوجوان تھا۔ شاید اس

لیے کہ اس کی آنکھیں چمکیلی اور گہری تھیں۔ شاید اس لیے کہ اس کے بال کالے اور گھونگھر والے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ بڑی ہوشیاری سے موٹر چلاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتا تھا، کھری کھری بات کرتا تھا، چاہے وہ کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو اور شاید اس لیے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھ سے محبت اور شادی کی بات کی تھی اور سب تو محبت کا سودا کرنا چاہتے تھے۔

مگر طوائف زادی جس کو بچپن سے ایک خاص قسم کی تعلیم دی گئی ہو صرف عورت نہیں ہوتی ساتھ میں طوائف بھی ہوتی ہے اس لیے وہ محبت کرنے کے باوجود معاملے بازی سے باز نہیں آتی۔ وہ ہوشیار دوکاندار کی طرح اپنی زندگی کا سودا کرنے سے پہلے اس کی پوری قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔ سو میں نے کہا:

میں اس کا جواب فوراً نہیں دے سکتی کل سوچ کر دوں گی۔''

اور راستے میں ہمارا گھر آ گیا۔ سو دلاور نے کہا۔

''تو کل شام کو میں پھر تمھیں لینے آؤں گا جواب تیار رکھنا۔''

اپنے کوٹھے کے زینے پر چڑھتے ہوئے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی میں آخری بار میں یہ سیڑھیاں چڑھ رہی ہوں۔ دل ایک عجیب خوف سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا میں برابر سوچ جا رہی تھی کہ ماں کے سامنے اس معاملے میں کیسے زبان کھولوں گی اوپر پہنچی تو کمرے میں سے اونچی آواز میں بولنے کی آواز آئی۔

''چھمیا بائی اب میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔''

اور ماں کہہ رہی تھیں

''سیٹھ جی جہاں اتنی مہربانی کی تھوڑے دن اور ٹھہر۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا میری پیاری اب تو حضور نواب صاحب کے محل میں آنے جانے لگی ہے بس ہمارے دن پھرنے ہی والے ہیں۔''

اور بھاری آواز والے سیٹھ نے کہا۔

''نواب صاحب کی بات چھوڑو چھمیا بائی ان کے پاس رہا کیا ہے؟ جو کچھ تھا'' ان کے پاس سب اڑا چکے ہیں سود ملا کر سات لاکھ تو میرا قرضہ ہے جو فرانس جاتے ہوئے مجھ سے لیا تھا اور اب تو ہند سرکار نے ان کی پنشن کر دی ہے۔ پانچ ہزار روپے ماہوار، اس میں سے کیا خود

کھائیں گے، کیا تمھاری پیاری کو دیں گے؟"

جب وہ ساہوکار چلا گیا تو میں نے ماں سے پوچھا:

"یہ کون تھا ماں، کیا تم نے اس سے قرضہ لیا ہوا ہے؟"

وہ بولی:

"ہاں تو اور کیا۔ اتنے برسوں تیری پرورش کی ہے میرا دھندہ تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ پورے نو ہزار روپے دینے ہیں سیٹھ جی کے اب تو نواب صاحب ہی ہم پر دیا کریں تو ہمارے دلدر دور ہوں۔"

میں نے کہا:

"ماں، نواب صاحب تو بمبئی جا رہے ہیں اور مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا ہے۔ کہتے ہیں ہزار روپیہ ماہوار دیں گے۔"

خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں، کہنے لگیں۔

"پھر کیا ہے، ساہوکار کا سود بھی وہی چکا دیں گے۔"

میں نے کہا:

"پر ماں، میں ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتی مجھے وہ اچھے نہیں لگتے۔ ان کے منہ سے ہر وقت شراب کی بو آتی ہے۔"

حیرانی سے ماں نے کہا:

"نواب صاحب کے پاس نہیں رہے گی تو گزر کیسے ہوگی، قرضہ کیسے اترے گا۔ آج کل تو ویسے ہی گانے والیوں کا بازار مندا ہے نو ہزار روپے تو نو برس میں بھی جمع نہیں ہوں گے۔

میں نے الماری کھولی اور زیور کا صندوقچہ نکالا۔

"یہ سب بیچ ڈالو ماں، نو دس ہزار تو مل ہی جائیں گے۔"

"اری پاگل ہو گئی ہے، یہ تو ہمارا خاندانی زیور ہے جس طوائف کے پاس اتنا زیور بھی نہ ہو، بازار میں اس کی کیا خاک قدر ہوگی؟"

"مگر میں اب اس بازار میں نہیں بکوں گی ماں، میں تو شادی کروں گی۔"

''شادی کرے گی!''

ماں نے حیرانی سے پوچھا۔

''مگر طوائف زادی سے شادی کرے گا کون؟''

''ہے ایک ایسا۔''

''روپیہ ہے اس کے پاس؟'' ماں نے سوال کیا۔

''سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے شریف عزت دار آدمی ہے۔''

''ارے تو اس کی شرافت کو کیا چاٹے گی، سو روپے میں گزارہ کیسے ہوگا؟''

میں نے کہا:

''جیسے اور لاکھوں کروڑوں گزارہ کرتے ہیں۔ ماں یہ زیور مجھے نہیں چاہیے۔ یہ گھر یہ جھاڑ، فانوس، قالین، پردے کچھ نہیں چاہییں، یہ سب بیچ کر قرضہ چکادو۔ ہم عزت کی زندگی بسر کریں گے، تم نے عمر بھر میری خاطر تکلیف اٹھائی ہے، میں اور دلاور تمھاری خدمت کریں گے۔''

''دلاور کون، وہ ڈرائیور؟

''ہاں ماں وہی......''

''ہائے میری قسمت! میں نے تو تیرے لیے راج محل کے خواب دیکھے تھے۔'' اور یہ کہہ کر ماں نے مجھے گلے لگالیا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

شام کو بازار میں موٹر رکنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے زینہ اتر گئی۔ نیچے دیکھا تو ایک طرف نواب صاحب کی لمبی خوب صورت موٹر کھڑی تھی اور دوسری طرف ایک بے ڈھنگی، سامان ڈھونے کی ٹرک کھڑی ہے، جس میں دلاور بیٹھا مسکرا رہا ہے۔

نواب صاحب کی موٹر میں کوئی اور ڈرائیور تھا۔ وہ بولا۔

''نواب صاحب نے موٹر بھیجی ہے۔''

اور دلاور نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ''تمھارا کیا فیصلہ ہے پیاری؟''

اور کوئی جواب دیئے بغیر میں ٹرک میں دلاور کے برابر جا کر بیٹھ گئی اور اسی دم ٹرک روانہ ہوگئی۔ سلطان آباد کے کوٹھوں، کوٹھیوں بازاروں اور گلی کوچوں میں سے ہوتی ہوئی وہ ٹرک اسی

سڑک پر آ گئی جو کبھی نواب صاحب کی ولایتی موٹر کے لیے بنی تھی اور جس پر اب درجنوں ٹرکیں، اینٹیں، سیمنٹ لادے ہوئے جین نگر کی طرف جا رہی تھیں جہاں جین اینڈ کمپنی کا نیا روئی کا کارخانہ بن رہا تھا۔ ہماری ٹرک میں بھی اینٹیں بھری ہوئی تھیں راستے بھر دلاور خاموش بیٹھا ٹرک چلاتا رہا۔ جین نگر پہنچ کر اُس نے اینٹیں اتاریں اور پھر سلطان آباد کی طرف لوٹنے کے بجائے وہ اور آگے چلا میں نے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

اس نے کہا

'آگے ایک قصبہ ہے، وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ اس نے قاضی کا انتظام کیا ہوا ہے۔ آج رات ہی ہمارا نکاح ہو جائے گا۔''

نکاح!......صرف طوائف یا طوائف زادی ہی اس لفظ کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ لگا سکتی ہے۔ خوشی کے مارے میرا دل بھر آیا اور میں سسکیاں لے کر رونے لگی۔

دلاور نے اندھیرے میں میری طرف دیکھ کر کہا:

'ارے، تم تو رو رہی ہو، کیوں، کیا تمھیں مجھ سے ڈر لگتا ہے؟''

میں نے اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس کا اونی کوٹ کھردرا تھا مگر اس وقت میرے گالوں کو اس کھردرے پن میں ایک عجیب لذّت محسوس ہوئی اور میں نے اس کے کان میں کہا۔

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں دلاور۔''

اور پھر اس چوراہے پر پہنچ کر اس نے ٹرک ٹھہرائی۔ اس لیے کہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا' تاروں کی دھیمی روشنی میں تین سڑکیں اور ایک پگڈنڈی دھندلی' دھندلی نظر آ رہی تھی۔

''کیوں رُک گئے؟''

میں نے پوچھا۔

اس نے کہا۔

''راستہ بھول گیا ہوں' اندھیرے میں پتہ نہیں چلتا آگے کون سی سڑک پر جانا ہے یہاں کی دوکانیں بھی سب بند ہو گئی ہیں' کوئی راہ چلتا گزرے تو اس سے پوچھیں...... خیر کوئی بات نہیں،

صبح ہوتے پہنچ جائیں گے۔"

اندھیرا، سناٹا، دور آسمان پر جھلمل کرتے ستارے پیڑوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کی سائیں سائیں۔ وہ سماں میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میرا دل دلاور کی محبت سے اتنا بھرا ہوا تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ پھٹ جائے گا۔ وہ بولا۔

"کل ہمارا نکاح ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "پھر ہم رہیں گے کہاں؟"

اُس نے کہا "سلطان آباد میں تمھیں رکھنا نہیں چاہتا۔ سب لوگ اُنگلیاں اٹھائیں گے، اس لیے میں نے اس قصبہ میں مکان لے لیا ہے۔ تمھیں تکلیف تو ہو گی؟"

میں نے کہا "تکلیف کیسی، جہاں تم ہو وہیں میرے لیے آرام ہے۔"

اس نے کہا "صرف ایک ہی کمرہ، وہ بھی چھوٹا سا۔"

ایک کمرے کا ذکر سن کر میں ٹھٹھکی "ایک ہی کمرہ تو پھر ماں کہاں رہے گی؟"

"ماں؟" اس نے یہ لفظ ایسے دہرایا جیسے پہلی بار سنا ہو اور پھر اسی پرانے حقارت بھرے انداز میں بولا "کون چھمیا بائی؟"

جس طرح اس نے میری ماں کا نام لیا وہ مجھے اچھا نہیں لگا "وہ میری ماں ہے دلاور؟"

"ہو گی، مگر میرے گھر میں کوئی طوائف نہیں رہے گی۔"

میں نے کسی قدر ترشی سے کہا "مگر جس کو تم بیوی بنا کر گھر میں رکھ رہے ہو وہ بھی طوائف زادی ہے اور دنیا اس کو بھی طوائف سمجھتی ہے۔"

"تمھاری بات اور ہے پیاری، مجھ سے شادی کر کے تم ایک نئی زندگی اختیار کر رہی ہو، اس کے بعد تمھاری عزت میری عزت ہے لیکن تمھاری ماں کو گھر میں رکھ کر میں دنیا کے طعنے سننا نہیں چاہتا اور تو اور میرے ماں باپ ہی مجھ سے ملنا چھوڑ دیں گے۔"

"سو تم چاہتے ہو میں اپنی ماں کو چھوڑ دوں؟"

"شادی کے بعد ہر بیٹی اپنی ماں کو چھوڑتی ہے" اس نے بحث کا پہلو بدلتے ہوئے کہا "اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟"

میں نے کہا، ہر بیٹی اپنی ماں کو چھوڑ سکتی ہے لیکن طوائف کی بیٹی اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتی، اس لیے کہ ہر ماں کے پاس گھر ہوتا ہے، گھر والا ہوتا ہے، خاندان، برادری، پڑوسی سب کچھ اور سب کوئی ہوتا ہے لیکن طوائف کی ساری رشتہ داری اس کی بیٹی پر ختم ہو جاتی ہے۔ سو تمھارے لیے میں دنیا میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں مگر اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتی۔''

اس نے دوسری طرف سے حملہ کیا''تو اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟'

یہ سن کر میں جل ہی تو گئی۔ میں نے کہا'' میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں تمھارے لیے مری جا رہی ہوں؟''

وہ سٹپٹا گیا۔ بولا'' میں تو سمجھا تھا کہ تم......

میں نے کہا''تم غلط سمجھے تھے۔''

''تو پھر تم آئیں کیوں میرے ساتھ؟''

''اس لیے آئی تھی کہ میرا خیال تھا کہ تم نام ہی کے دلاور نہیں ہو، سچ مچ کے دلاور ہو، اس لیے آئی تھی کہ میں سمجھتی تھی کہ میں اور میری ماں، تمھارے سہارے ایک نئی زندگی اختیار کریں گے جہاں چند سکّوں کے عوض ہمیں اپنی عزت، آبرو نہیں بیچنی پڑے گی۔''

''تمھارے لیے تو میرے گھر کے دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔''

''جس گھر میں میری ماں کی عزت نہ ہو وہاں میں نہیں رہ سکتی۔''

''مگر میں ایک طوائف کی عزت نہیں کرسکتا۔''

''وہ طوائف نہیں ہے، میری ماں ہے۔'' میں چلا کر بولی اور مجھے جیسے ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔

''جہاں وہ نہیں جاسکتی، وہاں میں نہیں جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے ٹرک کا دروازہ کھولا اور نیچے سڑک پر اُتر آئی۔

''تو میں جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔

''چلنا ہے تو چلو، میں تمھیں واپس سلطان آباد پہنچا دوں۔ کہو تو نواب صاحب کے یہاں لے چلوں وہ کل بمبئی جا رہے ہیں، اب بھی وقت ہے۔''

میں نے کہا

''اب سلطان آباد نہیں جاؤں گی۔''

''پھر کہاں جاؤ گی؟''

''کہیں نہیں جاؤں گی، یہیں رہوں گی۔''

''یہاں اس چوراہے پر کیا کرو گی؟''

''تمھیں اس سے کیا؟ میں نوکری ڈھونڈوں گی، سڑک کوٹوں گی، پان بیچوں گی، مگر یہیں رہوں گی اور میری ماں میرے پاس رہے گی، جب تک تم ایک دن آکر یہ نہ کہو گے۔ میں غلطی پر تھا پیاری، اب میں تمھیں اور تمھاری ماں دونوں کو عزت سے آسرا دینے کو تیار ہوں۔''

''ایسا دن کبھی نہیں آئے گا۔''

وہ چلایا اور موٹر چلادی مگر آہستہ آہستہ، اس انتظار میں کہ اس سنسان سناٹے سے ڈر کر اس کے پیچھے دوڑوں گی مگر میں بھی کچھ کم ضدی نہیں ہوں۔ وہیں سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی رہی یہاں تک کہ ٹرک کی لال بتی اندھیرے میں گم ہوگئی۔ یہاں تک کہ صبح کا اجالا آسمان پر پھیل گیا اور ایک موٹر رام بھروسے ہندو ہوٹل کے سامنے آکر ٹھہری اور اس میں سے ایک عورت نے سر نکال کر پوچھا۔

''ارے یہاں کوئی پان کی دوکان ہے؟''

اور جب ہوٹل کے ایک چھوکرے نے جواب دیا'' یہاں تو پان نہیں ملتا۔ کہیے تو تازی تازی پوری بھاجی لاؤں۔''

تب میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس چوراہے پر پان کی دوکان کھولوں گی۔

سو میں پانچ برس سے یہاں بیٹھی یہ دوکان چلا رہی ہوں اور سامنے والی جھونپڑی میں میری ماں بیٹھی چھالیا کاٹا کرتی ہے۔ میں پان بناتی رہتی ہوں اور دلاور کا انتظار کرتی ہوں۔ اس کی ٹرک اس چوراہے سے اکثر گزرتی ہے لیکن وہ کبھی یہاں نہیں ٹھہرتا، لیکن مجھے یقین ہے ایک دن اس کی ٹرک یہاں ضرور ٹھہرے گی اور وہ پان کھانے میرے دوکان پر آئے گا اور اس دن ہماری زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوگا۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ پھر ہم کون سی سڑک پر جائیں گے؟

تیسری سڑک کی کہانی

فرینڈز موٹر سروس کے پروپرائٹر جان فرینڈز کی زبانی

میرا نام مسٹر جان فرینڈز ہے میرے ممی ڈیڈی مجھے جونی، جونی Johny, Johny پکارتے تھے، میرے دوست مجھے یو بلڈی سوائن جوانی You blody Swine Johnny کہتے تھے۔ مگر میری اسٹیلا مجھے ہمیشہ ڈارلنگ جونی Darling Johnny بلاتی تھی۔ ہمیشہ کا مطلب ہے جب تک وہ میری تھی، مگر اب وہ میری نہیں ہے کسی اور کی ہے اور میرے بجائے اسے ڈارلنگ کہتی ہے۔ اور اس کے اور میرے درمیان وہ سامنے والی سڑک ہے جو اس چوراہے پر سے پہاڑی کی چوٹی پر ہوٹل پربت تک جاتی ہے، کہنے کو صرف پچاس میل کا فاصلہ ہے اور دو ہزار فٹ کی چڑھائی ہے مگر یہ پچاس میل دنیا کے گرد گھوم سکتے ہیں اور دو ہزار فٹ کی اس چڑھائی میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اور اب میں اپنی اسٹیلا کو صرف اسی وقت پا سکتا ہوں جب یہاں سے لے کر ہوٹل پربت تک ایک چاندی کی سڑک بنا سکوں، یہ سڑک پچاس میل لمبی ہے اور ایک میل میں سترہ سو ساٹھ فیٹ ہوتے ہیں اور ایک فیٹ میں بارہ انچ ہوتے ہیں، سو ایک لاکھ پانچ ہزار چھ سو چاندی کے روپے ہوں تو میں ان کو اس سڑک پر برابر رکھتا ہوا ہوٹل پربت تک جاؤں اور وہاں سے اپنی اسٹیلا کو لے کر پھر آؤں۔

اس چوراہے پر میرا ٹین کی چھت والا گیرج ہے جس پر فرینڈز موٹر سروس کا سائن بورڈ لگا ہے۔ یہاں میں ٹائروں پر پنکچر لگاتا ہوں، موٹروں کے بگڑے ہوئے انجنوں کی ریپئیر کرتا ہوں، موقع ملنے پر ان کے نئے پرزے نکال کر پرانے فٹ کر دیتا ہوں۔ گیرج کے پیچھے ایک کوٹھری میں پرانے ٹائروں کے انبار سے چھپی ہوئی شراب بنانے کی بھٹی ہے اور ولایتی وہسکی کی خالی بوتلوں کا ڈھیر ہے۔ میں شراب بناتا بھی ہوں، بیچتا بھی ہوں اور پیتا بھی ہوں اور یہ سب کچھ کرتا ہوں صرف اسٹیلا کی خاطر اس کو پھر حاصل کرنے کے لیے ورنہ دراصل میں جنٹلمین ہوں کونونٹ اسکول میں جونیر کیمبرج تک پڑھ چکا ہوں۔ بائبل کلاس میں انعام پا چکا ہوں۔ یہاں آنے سے

پہلے ہر اتوار کو چرچ جایا کرتا تھا۔ مگر اب میں اس چوراہے کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا کیونکہ مجھے اسٹیلا کا انتظار ہے کبھی نہ کبھی وہ ضرور ہوٹل پربت سے اکتا کر اپنے گھر واپس جانے کے لیے بمبئی کا رخ کرے گی اور اس چوراہے سے گزرے گی۔

میری کہانی اس سڑک کے ساتھ شروع ہوتی ہے جو یہاں سے ہوٹل پربت تک جاتی ہے اور فی الحال یہ کہانی اس چوراہے پر آ کر ختم ہو گئی ہے لیکن کہتے ہیں زندگی ختم نہیں ہوتی، نہ کہانی ختم ہوتی ہے۔ شاید میری کہانی بھی جو بگڑی ہوئی موٹر کی طرح چوراہے کی دھول اور کیچڑ میں پھنسی ہوئی کھڑی ہے کسی نئی سمت میں چل پڑے لیکن بگڑی ہوئی موٹر کو جب تک بہت سے لوگ مل کر دھکا نہ دیں وہ نہیں چلتی اور شاید یہی حال بگڑی ہوئی زندگی کا ہے......

میں اب سے تیس برس پہلے، بمبئی کے پاس ڈانڈا نامی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ میرے باپ، دادا، پردادا سب سینکڑوں برس سے مچھلی پکڑنے کا دھندا کرتے آئے ہیں۔ سمندر کے پانی کا سارا نمک ہمارے بدن میں سما گیا ہے اور صدیوں کی دھوپ میں تپ کر ہماری رنگت ایسی کالی ہو گئی ہے جیسے فولاد۔ میرے پردادا کا اصلی نام تو سکھا رام تھا لیکن جب گورے پادریوں کے اثر میں آ کر وہ کرسچین ہو گئے تو ان کا نام ہو گیا پیٹر فرنینڈ زنگران کی اور ان کے بعد ہماری زندگی میں کوئی لمبی چوڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف پہلے ہمارے گھر کے لوگ دیول جا کر ایک کالے رنگ کے دیوتا ڈھوبھا کی پوجا کرتے تھے، اب چرچ جا کر ایک گوری دیوی اور ایک گورے دیوتا کی پوجا کرنے لگے۔ کیونکہ دن بھر ہمیں مچھلی پکڑنے کے لیے پانی میں کھڑا رہنا پڑتا ہے، اس لیے ہم صرف لنگوٹی باندھتے ہیں۔ کرسچین ہونے کے بعد اس لنگوٹی کے اوپر ولایتی کوٹ اور ٹوپی پہننے لگے لیکن ہماری کالی ٹانگیں اب بھی ننگی ہی رہیں اور ہمارے کولھوں پر اب بھی وہی لنگوٹی ہی لپٹی رہی۔ ہمارے پردادا جب ہندو سے کرسچین ہوئے تھے تو پادریوں نے ان سے کہا تھا کہ اب ان سے کوئی چھوت چھات نہیں برتے گا کیونکہ عیسیٰ مسیح کے ماننے والے سب ایک ہی آسمانی باپ کے اولاد ہیں۔ ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے اور قیامت کے دن عیسیٰ مسیح اپنے سب بچوں کو نجات دلائیں گے۔ لیکن کرسچین ہونے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ اونچی جاتی والے ہندو تو ان کو اب بھی پہلے کی طرح اچھوت سمجھتے ہی تھے، لیکن گورے اور سانولے رنگ کے کوٹ پتلون

پہنے والے کالے عیسائی بھی لنگوٹی پہنے والے عیسائیوں کو اپنے برابر بٹھانے کو تیار نہیں تھے، سنا ہے کہ ایک دن ہمارے دادا اپنی لنگوٹی پہنے گورے عیسائیوں کے چرچ میں چلے گئے کیونکہ وہاں سے بڑے سُریلے گانے کی آواز آ رہی تھی، مگر چرچ کے ایک ملازم نے انہیں دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اس کے بعد اس کے دل میں شک بیٹھ گیا کہ شاید قیامت کے دن گوری رنگت والے عیسیٰ مسیح اپنے کالے بچوں کو نہ پہچانیں۔ اس لیے انھوں نے کبھی کبھی وٹھو با کے مندر میں بھی جانا شروع کر دیا کیونکہ اس دیوتا کی رنگت کالی ہے اور اس لیے شاید وہ اپنی کالی اولاد کو نہ بھلائے۔

میں بچہ تھا تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی اپنے باپ، چچا اور بڑے بھائیوں کی طرح رات کو ناؤ میں بیٹھ کر سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاؤں، مگر میرے باپ نے مجھے پڑھنے کے لیے باندرہ کے ایک کانونٹ اسکول میں داخل کر دیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ کم سے کم ان کا چھوٹا بیٹا مچھلی مار نہ کہلائے بلکہ پڑھ لکھ کر سوٹ بوٹ پہن کر جنٹلمین بن جائے اور کوئی جنٹلمینی دھندا کرے، جیسے ڈاکٹر یا ٹیچر یا ٹیلر ماسٹر اور وہ بھی نہیں تو کم سے کم کسی ہوٹل کے بینڈ میں کوئی ولایتی باجا بجانے کی نوکری ہی اسے مل جائے لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ ان کے چھوٹے بیٹے کی قسمت میں تو پربت ہوٹل کا ویٹر بننا لکھا تھا۔ مگر مجھے قسمت سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ میں ویٹر نہ بنتا تو اسٹیلا سے کبھی نہ مل سکتا تھا اور اسٹیلا سے نہ ملتا تو میری زندگی ایسی ہوتی جیسی وہ سامنے والی موٹر جو میرے گیرج کے قریب پیڑ کے نیچے کھڑی ہے۔ دیکھنے میں تو اچھی خاصی سیکنڈ ہینڈ موٹر لگتی ہے مگر بات صرف اتنی ہے کہ اس کا بونٹ کھول کر دیکھیں گے تو آپ اس کا انجن غائب پائیں گے۔

میری زندگی میں اور میری کہانی میں ہوٹل پربت کا بہت ذکر آئے گا اس لیے اپنے اور اسٹیلا کے بارے میں اور کچھ بتانے سے پہلے اس ہوٹل کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔ یہ ہوٹل دراصل پہلے ہوٹل پربت نہیں تھا۔ بلکہ پربت پورا اسپتال تھا جو برٹش گورنمنٹ نے گورے فوجیوں کے لیے بنایا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ کئی برس تک خالی اور سنسان پڑا تھا۔ یہاں تک کہ نئی دلی میں کسی کو یاد آیا کہ ایسی ایک جگہ بیکار پڑی ہے اور تین ہزار روپے رشوت لے کر ڈیڑھ، دو لاکھ کی زمین، مکان اور فرنیچر کو تیس ہزار میں نیلام کر دیا گیا اور نئے مالک نے دو مہینے میں ٹھیک ٹھاک، ٹیپ ٹاپ کر کے اسپتال کو ہوٹل بنا دیا۔ ہاں تو شاید اسی لیے اس کے کمروں میں

اب تک آئیڈو فارم اور ننگچر آئنڈین کی بوبسی ہوئی ہے۔ کونے والا بڑا ڈبل کمرہ جس کا کرایہ تیس روپے روز ہے، پہلے آپریشن کا کمرہ ہوا کرتا تھا اور وہ جو باغ میں الگ تھلگ ایک ایرکنڈیشنڈ کاٹج جو ہے، جس کا کرایہ پچاس روپے روز ہے اور جہاں اکثر ہنی مون پر آئے ہوئے نئے شادی شدہ اور کبھی کبھی غیر شادی شدہ جوڑے ٹھہرتے ہیں، یہاں اسپتال کے دنوں میں جو بیمار اور زخمی مر جاتے تھے ان کی لاشوں کو رکھا جاتا تھا۔

میں ہوٹل پربت میں کیسے پہنچا، اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ ہوا یہ کہ جونیر کیمبرج پاس کرنے کے بعد مجھے اسکول چھوڑنا پڑا کیونکہ اب میرے باپ کو مچھلی کے بزنس میں گھاٹا ہو رہا تھا۔ دوسرے مچھلی ماروں نے مل کر ایک کوآپریٹو سوسائٹی بنائی تھی، جس کی اپنی موٹر بوٹیں چلتی تھیں اور بازار میں مچھلیاں لے جانے کے لیے اپنی ٹرک تھی مگر میرے باپ کو الگ کام کرنا پسند تھا، چاہے اس میں گھاٹا ہی کیوں نہ ہو اور اس کے بیٹے کو اسکول ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔ کتنے دنوں تک تو میں نوکری کی تلاش میں پھرتا رہا مگر کوئی ڈھنگ کا کام نہ ملا۔ ڈھنگ کے کام سے میرا مطلب ہے ایسا کام جو ایک کانونٹ کا پڑھا ہوا مسٹر جان فرینڈیز کرنا پسند کرے۔ اب میں باپ کی طرح لنگوٹی باندھ کر سمندر میں مچھلی پکڑنے کا کام تھوڑا ہی کر سکتا تھا، ایسا کرتا تو میرے اسکول کے اینگلو انڈین ساتھی کیا کہتے۔ ان سے تو میں نے کہہ رکھا تھا کہ میرے ڈیڈی کی بہت بڑی فشنگ بزنس ہے۔ نہ ہی میں کسی کارخانے میں گھاٹیوں، مراٹھیوں کی طرح مزدوری کرنے کے لیے تیار تھا۔ اصل میں میرا جی چاہتا تھا کہ کچھ اور نہ سہی تو کم سے کم کسی سینما میں گیٹ کیپر کی نوکری مل جائے۔ سینما فری دیکھوں اپنے دوستوں کو چپکے سے اندر گھسادوں اور ٹکٹوں کو بلیک مارکیٹ میں بیچ کر الگ پیسے بناؤں یا پھر تاج محل جیسے کسی بڑھیا ہوٹل میں کام مل جائے، یونیفارم کے اچھے کپڑے پہننے کو ملیں روز کیبرے دیکھوں اور خوب ٹپ ملیں، مگر ایسی نوکریاں سفارش کے بغیر ملتی نہیں اور میں اور میرا مچھلی مار باپ سفارش کہاں سے لاتے، سو بیکاری کے دن گزر رہے تھے، وقت کاٹنے کے لیے میں ایک کتابوں کی دوکان سے کوئی مزیدار امریکن کامک Comic یا میگزین ایک دوآنہ کرایہ دے کر لے آتا اور دن بھر چٹ پٹے معاشقوں، مار دھاڑ قتل وخون کی اسٹوریز پڑھتا یا ہالی ووڈ کی فلم اسٹاروں کی تصویریں دیکھا کرتا، جن کی فلم دیکھنے کے لیے بھی اب

میری جیب میں دام نہیں تھے۔

ایک دن میں اس کتابوں کی دوکان پر کھڑا انگریزی کے رسالوں کے ورق الٹ رہا تھا کہ ایک عجیب سا لمبا سا دبلا سا آدمی داخل ہوا جو شکل وصورت سے ایسا لگتا تھا جیسے امریکن فلموں کا ویلین۔ پتلی پتلی ایروپلین کے پروں جیسی خضاب سے کالی کی ہوئی مونچھیں، گہرے نیلے رنگ کی پتلی ٹانگوں والی پتلون، سبز رنگ کی قمیض، پیلے رنگ کا کوٹ اور سفید ٹائی پر ایک ننگی عورت کی گلابی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ دیکھنے میں اچھا خاصا رنگین کارٹون لگتا تھا۔ مگر اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں سوچا، یہ کوئی امیر آدمی، اس سے میل ملاقات بڑھانی چاہیے شاید اس کی مدد سفارش سے کوئی کام مل جائے۔

اس نے دوکان کے مالک سے پوچھا:

''لائف میگزین ہے؟''

میں نے جلدی سے لائف میگزین کی ایک جلد اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی......

''ہیر یو آر سر۔''

''انگریزی اچھی بولتے ہو۔ کہاں پڑھتے ہو؟''

میں نے کہا

''سینٹ جوزف کانونٹ میں پڑھتا تھا۔''

''اب کیا کرتے ہو؟''

اس نے لائف کے ورق الٹتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا

''کام کی تلاش کر رہا ہوں۔''

''اور کام نہ ملا تو؟''

اس نے رسالے سے نظر اٹھا کر مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا

''کوئی اور کام نہیں ملا تو اپنے ڈیڈی کی بزنس میں ہی لگ جاؤں گا۔''

''اور وہ کیا ہے؟ فشنگ بزنس؟''

میں نے حیران ہو کر کہا:

''ٹھیک ہے مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا۔''

''مجھے بہت سی باتیں معلوم ہیں، جو دوسروں کو نہیں معلوم ہوتیں۔''

وہ ایک عجیب ڈھنگ سے مسکرا کر بولا اور نہ جانے مجھے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے مسکراہٹ کے پیچھے ایک دھمکی ہو۔ پھر وہ پراسرار مسکراہٹ ایک کھلے ہوئے طنز میں تبدیل ہوگئی اور اس نے کہا:

''اس کے علاوہ تم میں سے تو فشنگ بزنس کی بو آتی ہے۔

یہ کہہ کر وہ خوب زور سے ہنسا اور میں نے دیکھا کہ اس کے میلے میلے دانتوں میں سے دو پر سونا چڑھا ہوا ہے اور جب وہ ہنسا تو اس کے منہ سے سانس کے ساتھ وہسکی کی بدبو کا ایک زوردار بھپکا آیا۔ میں نے جل کر کہا

''اگر مجھ سے فشنگ بزنس کی بو آتی ہے تو تم میں سے وہسکی بزنس کی۔'' ایک سیکنڈ کے لیے تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، جیسے میں نے غلطی سے عین اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں نے بھی دل میں سوچا اچھا تو یہ بات ہے، یہ سب ٹھاٹ باٹ یہ سوٹ بوٹ سب شراب کی دلالی کی بدولت ہیں لیکن ایک پل میں ہی وہ سنبھل گیا اور ایک زور کا ٹھٹھا مار کر میری پیٹھ ٹھوکنے لگا۔

''ویل ڈن مائی بوائے تم کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کہو نوکری کرو گے؟''

نوکری کا نام سنتے ہی میرا موڈ بھی بدل گیا۔

''سر......سر......'' میں اس کے رعب کے مارے ہکلانے لگا۔

''سر...... میں......نوکری......آپ کے ہاں— کیا کام کرنا ہوگا؟''

''ہوٹل میں ویٹر کا کام۔ چالیس روپے تنخواہ، کھانا اور پہننے کو یونیفارم مفت، ٹپ جو ملیں گے وہ الگ رہے اور اگر محنت اور ہوشیاری سے کام کرو گے تو ادپر کی اور بھی آمدنی ہوسکتی ہے۔''

ویٹر یعنی بیرا جس کو سب بوائے، بوائے کہہ کر آواز دیتے ہیں، یہ سن کر میرا پہلے والا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا۔ ٹالنے کے لیے میں نے پوچھا:

''کون سا ہوٹل ہے آپ کا؟''

''ہوٹل پربت'' اس نے کہا'' کیوں منظور ہے؟''

''یس سر۔ بڑی خوشی سے''

میں نے جلدی سے کہا کیونکہ ہوٹل پربت کے اشتہار میں نے اخباروں میں پڑھے تھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ پہاڑیوں میں بڑی خوب صورت جگہ پر واقع ہے اور بڑھیا اور فیشن ایبل ہوٹل ہے۔ اس کے اشتہاروں کا مضمون کچھ اس ڈھنگ کا ہوتا تھا۔

بمبئی سے صرف چار گھنٹے کے فاصلے پر

ہوٹل پربت

پربت پور

مغربی گھاٹ کی حسین ملکہ

فیشن ایبل امیروں کی پسندیدہ آرام گاہ

ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم

معزز مہمانوں کے آرام و آسائش کا پورا انتظام ہے۔

مالک ہوٹل۔ جوزف فرینڈ یز فریرا"

سو اگلے دن ہی میں پربت پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اشتہار میں لکھا تھا کہ یہ جگہ بمبئی سے صرف چار گھنٹے کے فاصلے پر ہے، تو ممکن ہے سو میل فی گھنٹہ چلنے والی ریسنگ موٹریں اتنی جلدی وہاں پہنچتی ہوں، ہماری لاری تو دھول اڑاتی، ہچکولے کھاتی چھ گھنٹے میں صرف اس چوراہے پر پہنچ پائی، اس زمانے میں بھی یہاں سامنے والے دونوں ہوٹل تھے۔ اور وہ پیاری کی پان کی دوکان تھی، صرف یہ میرا گیرج نہیں تھا۔ ہاں تو ہماری لاری شام ہوتے یہاں پہنچی تو ڈرائیور نے کہا رات کو پہاڑی سڑک پر لاریاں چلانے کی ممانعت ہے، صرف چھوٹی گاڑیاں جاسکتی ہیں۔ سو رات وہیں گزارنی پڑے گی میں نے دل میں کہا "ڈیم بیڈ لک یہاں تو سونے کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے، رات کیسے کٹے گی؟"

میں سامنے والے شان اسلام ہوٹل میں سلائیس کھا کر چائے پی رہا تھا کہ پربت پور کی طرف سے ایک لاری آکر رکی اس میں سے کئی مسافر اترے، کچھ سیدھے اندھیرے کھیت کی طرف بھاگے، باقی نے رام بھروسے ہندو ہوٹل کا رخ کیا۔ صرف ایک شان اسلام ہوٹل میں آیا اور میری میز پر سامنے والے کرسی پر بیٹھ کر چلایا۔

''ایک پلیٹ بریانی، قورمہ اور بھیجہ فرائی۔''

اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا:

''تین مہینے کے بعد آج جا کے پیٹ بھر کھانا نصیب ہوگا۔''

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ میلا سفید پاجامہ اور اس پر ایک میلا سفید بند گلے کا کوٹ جیسا بیرے یا ویٹر پہنتے ہیں۔ کئی دن کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ تھا نوجوان آدمی مگر اس کے چہرے پر ابھی سے تھکن کی گہری لکیریں پڑنی شروع ہوگئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی تھکا ہارا سپاہی کسی جنگی فرنٹ سے لوٹا ہو۔

میں نے پوچھا:

''کیوں مسٹر کہاں سے آرہے ہو؟''

وہ بریانی کا بڑا سا لقمہ چباتے ہوئے بولا:

''پربت پور سے''

''وہاں کیا کام کرتے ہو؟''

''اس منحوس ہوٹل پربت میں کام کرتا تھا۔''

''کیا کام کرتے تھے؟''

''ویٹر، بیرا، خدمتگار، چپراسی، بہشتی، بھنگی سب ہی کام کرتا تھا۔''

''اور پگار کیا ملتی تھی؟''

''پچاس روپیہ مہینہ کہہ کر لے گیا تھا وہ فریرا صاحب۔''

''پچاس روپے تو برے نہیں ہیں آج کل۔''

میں نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے اس سے کہا۔

''پر ملیں بھی؟ پچاس میں سے پندرہ روپے تو کھانے کے نام سے پہلے ہی کٹ جاتے تھے۔ باقی پینتیس میں سے چار پانچ روپے ہر مہینے کسی پرچ''پیالی' پلیٹ کے ٹوٹنے کا جرمانہ ہوجاتا تھا، آخر میں مشکل سے تیس روپلی اپنے ہاتھ میں آتے تھے۔''

''اور کام؟''

''بس پوچھو نا، اسی وجہ سے تو چھوڑ آیا ہوں۔ یہ سمجھو روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔''

''اٹھارہ گھنٹے!''

میں نے تعجب سے کہا۔

''ہاں اور کیا۔ صبح سویرے پانچ بجے اٹھو۔ آگ جلاؤ پانی گرم کر کے سب کمروں میں بیڈ ٹی پہنچاؤ، پھر سب غسل خانوں میں گرم پانی رکھو۔ ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا کہ ڈرائنگ روم کو کھول کر اس کی صفائی کرو۔ میزوں کی چادریں بدلو۔ بریک فاسٹ کے برتن لگاؤ...... بس اس وقت سے جو کام چالو ہوتا تھا تو آدھی رات تک چلتا تھا۔ کبھی کبھی تو گیارہ بارہ بجے بھی کمروں میں سوڈے کی بوتلیں پہنچانی پڑتی تھیں۔''

''سوڈے کی بوتلیں! اتنی رات گئے؟''

''ہاں اور کیا، پر یہ صاحب لوگ سوڈا تھوڑا ہی پیتے ہیں وہسکی میں ملانے کے لیے منگاتے ہیں۔ خیر جی، اب لعنت بھیجو ہوٹل پربت پر، اپن تو اب بمبئی واپس جا کے کوئی اور دھندا دیکھتے ہیں۔''

''مگر میں تو وہیں......''

ابھی میں فقرہ پورا نہ کر پایا تھا کہ بمبئی واپس جانے والی لاری کا ہارن زور سے چیخا اور وہ بریانی اور بھجیہ فرائی کے دام کاؤنٹر پر پھینک کر بھاگا اور ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میں بھی کیوں نہ اسی لاری میں بمبئی لوٹ جاؤں کہ وہ اسٹارٹ ہوگئی اور دھول کے بادل اڑاتی ہوئی اپنی ٹیل لائٹ کی سرخ روشنی کو ٹمٹماتی اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

رات کو شانِ اسلام ہوٹل کی ایک سخت بینچ پر لیٹے لیٹے میں بڑی دیر تک جاگتا رہا اور جو کچھ ہوٹل پربت کے بارے میں سنا تھا اس پر غور کرتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں اس نوکری پر نہیں جاؤں گا اور یہ فیصلہ کرتے ہی میرے دل کو ایک عجیب قسم کا سکون آگیا اور میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں بھی میں ہوٹل پربت کے ہی خواب دیکھتا رہا کہ چاروں طرف سے آوازیں آرہی ہیں، بیڈ ٹی لاؤ، بیڈ ٹی لاؤ اور میں ایک کئی فٹ اونچے اور کئی من وزنی چائے کے پیالے کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا، بیک وقت ہر طرف بھاگنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں اور اتنے میں، میں دیکھتا ہوں کہ مسٹر فریرا کی نکیلی مونچھیں دو تلواروں میں تبدیل ہوگئی ہیں اور دونوں میری

گردن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔

جب آنکھ کھلی تو سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ اپنی لاری پربت پور کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا، چلو اچھا ہی ہوا۔ کون سالا ایسی نوکری کرنے جاتا اور اسی دم ایک نیلی گاڑی آ کر رکی، کوئی نئے فیشن کی امریکن کار تھی۔ مجھے بچپن ہی سے موٹروں میں دلچسپی تھی۔ اسکول آتے جاتے سڑک پر ہمیشہ ہر آتی جاتی کار کو دیکھتا رہتا تھا۔ یہ انیس سو بچپن کی پیکارڈ ہے۔ یہ نئی شیورلیٹ ہے۔ یہ پرانی فورڈ کونسل ہے۔ یہ ال مین ہے۔ وہ ہندوستان ہے مگر ایسی خوب صورت موٹر تو میں نے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ کیا باڈی تھی، واہ واہ، جیسے مچھلی ہو مچھلی۔ تھی اسپورٹنگ ڈزائن کی یعنی آگے بس ایک سیٹ جس پر ایک پارسی صاحب، جو خود گاڑی چلا رہا تھا، ایک پارسن میم صاحب اور بیچ میں ان کا تین چار برس کا بچہ اور پیچھے ڈکی میں جہاں سامان رکھتے ہیں وہاں...... وہاں ایک ہولڈال پر میری اسٹیلا بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس وقت وہ میری اسٹیلا نہیں تھی اور مجھے اس کا نام تک نہیں معلوم تھا مگر وہ جو کہتے ہیں LOVE AT FIRST SIGHT بس تو صاحب وہ معاملہ ہو گیا۔ میں نے چھوکریاں تو بہت دیکھی تھیں مگر اتنی خوب صورت کوئی نہیں دیکھی تھی۔ معمولی سفید ساڑھی میں بھی وہ ایک دم گلیمر گرل لگ رہی تھی۔ آپ پچھلے ایک دو برس میں کبھی ہوٹل پربت گئے ہوں گے تو آپ نے اسٹیلا کو ضرور دیکھا ہوگا اور اگر ایک بار دیکھا ہے تو آپ کے دل نے ضرور چلا کر کہا ہوگا O GOD WHAT A BEAUTY! آنکھیں اس کی بالکل الزبیتھ ٹیلر جیسی ہیں، رنگت ذرا ہلکی سانولی ضرور ہے جیسی اپنی انڈین اسٹارنی کی ہے مگر ہونٹ بالکل صوفیہ لورین جیسے ہیں۔ مگر عورت اور موٹر میں اصل چیز اس کی باڈی ہے۔ صاحب باڈی یعنی عورت کا بدن۔ سو اسٹیلا کا باڈی کس کے لپٹی ہوئی باریک ململ کی ساڑی میں ایسا لگتا ہے، جیسے مارلین منرو اور اگر یہ ساڑی بھی نہ ہو تو...... مگر زیادہ کہنا بے شرمی ہوگی صاحب اور پھر ابھی تو میں آپ کو اس ٹائم کی بات بتا رہا ہوں جب میں نے پہلی بار اسٹیلا کو اس چوراہے پر اس سامنے والے پیڑ کے نیچے موٹر کی ڈکی سیٹ پر سے اترتے دیکھا۔ ہاں تو جب وہ موٹر سے نیچے پھلانگ رہی تھی تو اس کی ساڑی اور پیٹی کوٹ کا کنارہ گھٹنوں تک اوپر اٹھ گیا اور ایک سیکنڈ کے لیے بے اختیار، میری نگاہیں اس کی چکنی اور سڈول ٹانگوں پر پھسل کر رہ گئیں۔ نیچے اتر کر اس نے پیچھے سے ایک

پکنک باکس نکالا اور ایک تھرماس اور ان کو اپنے مالک کے حوالے کیا۔ پارسی صاحب بولا:
"آیا ہم لوگ یہیں بریک فاسٹ کر لیتے ہیں۔ تم بھی سامنے والے ہوٹل میں چائے پی لو۔"
اور اسٹیلا شانِ اسلام ہوٹل میں داخل ہوئی جو اس وقت تک مسافروں سے بھر چکا تھا۔ سو اسے میری ہی میز پر میرے برابر کی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ اس نے چھوکرے سے ایک چائے اور بسکٹوں کا آرڈر دیا اور پھر اپنے پلاسٹک کے ستے سے بیگ میں سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکال کر اس میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ اب وہ میرے اس قدر قریب بیٹھی ہوئی تھی کہ میں اس کی خوشبو سونگھ سکتا تھا۔ یہ خوشبو کسی سینٹ یا پاؤڈر کی نہیں تھی بلکہ خود اسٹیلا کی اپنی ذاتی خوشبو تھی۔ لوگ کہتے ہیں ایسے ایسے عطر اور سینٹ ہوتے ہیں جن کی خوشبو سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے، ہوں گے صاحب، پر مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ جوان اور خوب صورت لڑکی کے بالوں میں اس کے بدن میں اس کے پسینے میں ایک گرم گرم خوشبودار بھپکا ہوتا ہے جو آدمی کو پاگل بنا دیتا ہے، پاگل— اب اس نے آئینہ واپس بیگ میں رکھا اور بسکٹ کھاتے ہوئے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اس کے موٹے موٹے کمان جیسے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ایسے پھیل گئی جیسے شام کو بارش ہو کر دھوپ نکل آئی ہو۔ میرے تن بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی صاحب اور میں نے سوچا یہ تو کام بن گیا۔ بس جہاں یہ چھوکری جائے گی وہیں اپن جائے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"کیوں، کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟"

اس نے کہا۔

"ہوٹل پربت میں اپنے میم صاحب مہینے بھر کی چھٹی منائیں گے ادھر...... کیوں تم کدھر جاتا ہے؟"

"اوہ— میں— ؟"

میں جواب دینے میں بوکھلا سا گیا کیونکہ چند منٹ پہلے ہی تو میں طے کر چکا تھا کہ میں ہوٹل پربت کی نوکری نہیں کروں گا۔ پھر ایک نیا فیصلہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"میں بھی وہیں جا رہا ہوں، ہوٹل پربت میں نوکری کرنے مگر میں سوتا رہا اور پربت پور کی

لاری نکل گئی۔''

''پھر تم کیا کرے گا؟''

''بارہ بجے دوسری لاری ادھر جائے گی۔''

یہ سن کر جیسے اسے کچھ مایوسی ہوئی ہو، پھر اس کی کالی گہری آنکھیں ایک نئے خیال سے چمک اٹھیں۔

''تم بولو تو میں اپنے صاحب سے پوچھوں، پیچھے ڈکی سیٹ میں ایک آدمی اور بیٹھ سکتا ہے۔''

اس میں بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا

''تھینک یو مس......''

''اسٹیلا — اسٹیلا جوزف۔''

''بڑا سوئیٹ نام ہے تمھارا۔''

میں نے جیمز ڈین کے رومانٹک انداز میں کہا مگر اس عرصے میں وہ موٹر کے پاس پہنچ چکی تھی۔

'صاحب' اس نے بڑے اطمینان سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا ''اپنا ایک جاننے والا مل گیا ہے، اسے بھی پربت پور جانا ہے ادھر ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ پر لاری نکل گئی ہے، بیچارہ کام پر لیٹ ہو جائے گا۔ آپ بولیں تو ڈکی میں ساتھ بٹھا لیں۔''

اس کے صاحب نے کہا:

''او کے — چلے گا — مگر جلدی کرو۔''

اسٹیلا چلائی:

''کم آن جونی۔''

جب موٹر چل پڑی تو میں نے کہا:

''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا نام جونی ہے۔''

''اوہ . وہ میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا اور پھر یہ نام مجھے اچھا بھی لگتا ہے۔''

ڈکی سیٹ میں دو آدمی مشکل ہی سے بیٹھ پاتے ہیں اور جب وہاں سامان بھی ٹھنسا ہوا ہو تو جگہ کی اور بھی تنگی ہو جاتی ہے لیکن مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی بلکہ اسٹیلا کے اتنے قریب

ہونے سے میرے بدن میں ایک نرم نرم سی بجلی دوڑتی رہی اور اس کی خوشبو کے بھبکے مجھے بنا شراب کے نشہ پلاتے رہے اور ہوا کے جھونکوں سے اڑ کر اسٹیلا کے بال میرے چہرے اور میری آنکھوں اور میرے ہونٹوں سے مَس کرتے رہے۔

اب وہ شاندار موٹر سرسبز پہاڑی کی ڈھلوان پر سے ہوتی ہوئی تیزی سے اوپر جا رہی تھی، بڑا ہی خوب صورت رومان بھرا سماں تھا، ڈکی سیٹ پر سامنے کے شیشے میں سے ہم اگلی سیٹ کا پورا ڈرامہ دیکھ سکتے تھے بچہ کونے میں تکیہ پر سر رکھ کر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ صاحب اور میم صاحب ایک دوسرے سے چپکے بیٹھے تھے، صاحب کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر تھا اور دوسرا میم صاحب کی کمر کے گرد تھا۔

میں نے کنکھیوں سے اسٹیلا کی طرف دیکھا اور نہ جانے کیسے اسی وقت اسٹیلا نے میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ بھی دھیرے دھیرے اسٹیلا کی کمر کے گرد ہو گیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس کسی قدر تیز ہو گیا ہے اور پھر جب سڑک کے کنارے ایک بڑے خوب صورت جھرنے کے پاس صاحب نے موٹر روک کر میم صاحب کے ہونٹوں کو چوم لیا تو صاحب پھر میں کیا کرتا، میں نے بھی اسٹیلا کو چوم لیا، اس کے بن لپ اسٹک کے ہونٹوں کا مزا ایسا تھا جیسے کسٹرڈ پڈنگ ہو اور جب اسے چوم رہا تھا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی انگلیوں کے ناخن میرے بازو میں کھب گئے۔ ہوٹل پربت پہنچتے پہنچتے اسٹیلا اور جونی کا لوLOVE پکا ہو گیا۔

پہلی ہی نظر میں میں نے دیکھا کہ ہوٹل شاندار تو نہیں مگر جگہ ضرور دلچسپ ہے۔ بڑے بڑے اور اونچے اونچے دیوار اور چیڑ کے پیڑوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا بنگلہ تھا جس میں کچن ڈرائنگ روم، ایک لاؤنج جس میں ریڈیو لگا تھا اور مسٹر فریرا کے اپنے رہنے کے کمرے تھے۔ پارسی صاحب کے لیے ایک بنگلہ پہلے سے ریزرو تھا، سو وہ تو ادھر اترے اور میں انہیں تھینک یو سر، تھینک یو میڈم کہہ کر اور اسٹیلا کو آنکھ کے اشارے سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہوٹل کے مالک سے ملنے چلا گیا۔

مسٹر فریرا اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹا بیئر پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی، لیٹے، لیٹے بولا۔

''ویل جونی تم آ گیا، کیوں آج ہی کام شروع کرے گا؟''

چوراہے پر جو باتیں سنی تھیں ان کو یاد کر کے میں نے کہا:

''سر ایک بات پہلے سے بول دوں، پگار کے علاوہ کھانا مفت ملے گا تب کام کروں گا اور پھر یہ نہیں کہ دن میں اٹھارہ گھنٹے ڈیوٹی کرنی پڑے۔''

فریرا کے چہرے پر اس کی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی مونچھیں بھی پھیلتی گئیں۔

''لگتا ہے عبدل راستے میں ملا ہے۔''

''جو بھی ملا ہو، مگر پہلے سے بات صاف کرنا اچھا ہے صاحب۔''

''گھبراؤ نہیں، اگر تم دوسرے بیروں کی طرح کام کرنا نہیں چاہتے تو میں تمھیں اسپیشل ڈیوٹی پر لگا دوں گا۔ پچاس روپیہ مہینہ کھانا مفت اور اسپیشل کام میں ٹپ بھی بہت ملتے ہیں''

یہ کہہ کر اس نے بیئر کا گلاس اٹھایا اور میری طرف اٹھا کر کہا:

'چیرز'

میں نے کہا:

''مگر وہ کیا کام ہے صاحب؟''

بیئر کا گلاس نیچے رکھ کر اس نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا پھر بوتل اٹھا کر دوسرے گلاس میں انڈیلی اور یہ گلاس میری طرف بڑھایا۔

''لو پہلے یہ پیو پھر سب معلوم ہو جائے گا۔''

میں نے گلاس اٹھا تو لیا مگر پینے سے پہلے جھجکا۔ میں نے اپنے اسکول کے دوستوں کے ساتھ چوری چھپے بیئر پی تو ہے مگر خلاف قانون اس طرح دن دہاڑے پیتے ڈر لگا۔ میں نے کہا۔

''سر...... میرے پاس...... پرمٹ نہیں ہے۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسا۔

''تم سمجھتے ہو جتنے لوگ آج کل شراب پیتے ہیں، یہ سب پرمٹ ہولڈر ہیں؟ ادھر پرمٹ ہو بھی تو مہینے میں صرف ایک دو بوتل وہسکی ملتی ہے اور ان لوگوں کو ہر روز ایک بوتل چاہیے۔ پیو۔ پیو۔ جوان آدمی ہو کر اتنا ڈرتے ہو؟''

سو میں نے گلاس کو منہ سے لگایا اور غٹ غٹ کر کے خالی کر دیا۔

"ہاں تو سر کام کیا ہوگا؟"

"کام تو معمولی ہے، ہمارے مہمان جو آتے ہیں ان کو وہسکی، برانڈی جو بھی چاہیے وہ سپلائی کرنا۔"

"مگر سر یہ تو خلاف قانون کام ہے، ہم پکڑے جائیں گے۔"

"ہم نہیں، اگر کوئی پکڑا جائے گا تو صرف تم کیونکہ بوتلیں میں نے ہوٹل کمپاؤنڈ کے باہر وہ سامنے پہاڑی پر جو پرانے مندر کے کھنڈر ہیں، وہاں رکھ چھوڑی ہیں وہاں سے رات کو لاؤ گے تم، اگر پکڑے گئے تو تم پکڑے گئے، مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر در اصل گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس والے کبھی ہوٹل پر بت میں آتے بھی ہیں تو چائے پینے یا ڈنر کھانے، کبھی چھاپہ مارنے نہیں آتے۔ میں نے سب انتظام کر رکھا ہے۔ کیوں منظور ہے؟"

پہلے تو میں نے سوچا انکار کر دوں، کون پچاس روپے مہینے کی خاطر اس خطرے کو مول لے مگر بیئر کے ہلکے ہلکے نشے کے بادل میرے دماغ پر چھاتے جا رہے تھے اور زندگی مجھے بڑی ہی رنگین معلوم ہو رہی تھی اور اسی وقت میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو دور کچن کے پاس اسٹیلا نظر آئی جو بچے کی دودھ کی بوتل لیے آ رہی تھی۔ اگر میں انکار کر دوں تو پھر اسٹیلا سے ملاقات کیسے ہوگی اور اسٹیلا کے بنا تو مجھے اب زندہ رہنا بھی مشکل معلوم ہوتا تھا۔ بات یہ ہے صاحب کہ مجھے بڑے زور سے لو (Love) ہو گیا تھا۔ جیسا رومیو، جولیٹ کی کتاب میں ہوتا ہے یا ہالی ووڈ کی فلموں میں ہوتا ہے۔ سو میں نے کہا 'سر مجھے منظور ہے۔'

اس دن سے اپنی ڈیوٹی مقرر ہو گئی، دوپہر کے کھانے کے بعد میں ہر کمرے میں جاتا اور صاحب لوگوں سے آرڈر لے لیتا اتنی بوتلیں وہسکی، اتنی بوتلیں برانڈی، اتنی بیئر، اتنی شامپین، سب سے آخر میں، میں اسٹیلا والے صاحب کے کمرے میں جاتا اور ان کا آرڈر لے کر جب نکلتا تو اسٹیلا کے کان میں کہہ دیتا کہ صاحب میم صاحب سو جائیں تو مجھے ہوٹل کے پچھواڑے ملے۔ شام تک مجھے کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ہم تین، چار گھنٹے ہوٹل کے پیچھے پہاڑی ڈھلوان پر جو گھنا جنگل تھا، وہاں ایک پیڑ کی چھاؤں میں گزارتے۔ میں اپنے ساتھ ایک چٹائی

لے جاتا اور اسے گھاس پر بچھا دیتا اور اسٹیلا میری گود میں لیٹ جاتی اور میں اس کے گھنے بالوں کے ساتھ کھیلتا رہتا اور اس کی آنکھوں کو اور اس کی گردن کو اور اس کی ناک پر جو ننھا سا تل تھا اسے اور اس کے کسٹرڈ کریم کے مزے کے ہونٹوں کو چومتا رہتا اور اسٹیلا کے جوان بدن سے نکلتی ہوئی گرم گرم خوشبو سونگھتا رہتا جو شامپین سے بھی زیادہ مزیدار تھی اور برانڈی سے بھی زیادہ تیز اور وسکی سے بھی زیادہ نشیلی اور دوپہر کی گرمی اور جنگل کے سناٹے اور جوانی کے خطرناک نشے میں ہم ڈوبتے جاتے، ڈوبتے جاتے یہاں تک کہ جونی اور اسٹیلا۔ اور اسٹیلا اور جونی ایک دوسرے کی محبت میں اس طرح کھو جاتے جیسے شینڈی میں بیئر، اور لیمونیڈ یا کاک ٹیل میں جن اور برانڈی۔

سورج چھپتے ہی میری ڈیوٹی کا ٹائم شروع ہوتا۔ پہلے میں دو کینوس کے تھیلے ہاتھ میں لٹکا کر پہاڑی پر مندر کے کھنڈر میں چلا جاتا۔ اس کے نیچے ایک تہہ خانہ تھا، میں ٹارچ کی روشنی میں سیڑھیاں اترتا اور وہاں رکھی ہوئی بوتلوں میں سے جتنی کی ضرورت ہوتی وہ اپنے تھیلوں میں بھر کر لے آتا۔ ڈنر ٹائم سے گھنٹہ بھر پہلے ہر کمرے میں وہاں کا آرڈر پہنچا دیتا اور اس کے بعد سوڈے کی بوتلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور آدھی رات تک چلتا رہتا اور کبھی کبھی کسی کو گیارہ بارہ بجے ایک اور بوتل کی ضرورت پڑ جاتی تو ایک بار پھر مجھے اندھیرے اور ڈراؤنے جنگل میں سے ہوتے ہوئے اس کھنڈر تک جانا پڑتا۔' کام خطرناک تھا، راستے میں ایک بار تو میرا پیر ایک سانپ پر ہی پڑ گیا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اس روز میں ٹارچ کے ساتھ ایک لکڑی بھی لے گیا تھا۔ اس جنگل میں چیتے بھی کافی تھے لیکن مجھ سے کسی چیتے کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی مگر رات کو ہوٹل میں بھی ان کے غرّانے کی آواز ضرور آتی تھی۔ ہاں تو کام تھا خطرناک مگر ایسے موقعہ پر ایک بوتل کے لیے کم سے کم ایک روپیہ انعام ضرور ملتا تھا۔ اس لیے میں تو اس انتظار میں رہتا کہ کب کسی کو بے وقت شراب کی ضرورت پڑ جائے۔ رات کو ایک بجے کے قریب جب ہوٹل کے سب مہمان سو جاتے، اس وقت میری ڈیوٹی ختم ہوتی، اس وقت میں اپنی کوٹھری میں واپس آتا۔ اسٹیلا وہاں پہلے سے موجود ہوتی۔ میں ہمیشہ کسی نہ کسی کے کمرے سے آدھی یا پاؤ بوتل اڑا لاتا تھا۔ ایک پیگ اسٹیلا کو پلاتا، دو خود پیتا اور پھر ہم ایک دوسرے کے نشے میں مدہوش ہو کر سو جاتے مگر سونے سے پہلے اسٹیلا

ہونے سے میرے بدن میں ایک نرم نرم سی بجلی دوڑتی رہی اور اس کی خوشبو کے بھپکے مجھے بنا شراب کے نشہ پلاتے رہے اور ہوا کے جھونکوں سے اڑ کر اسٹیلا کے بال میرے چہرے اور میری آنکھوں اور میرے ہونٹوں سے مَس کرتے رہے۔

اب وہ شاندار موٹر سر سبز پہاڑی کی ڈھلوان پر سے ہوتی ہوئی تیزی سے اوپر جارہی تھی، بڑا ہی خوب صورت رومان بھرا سماں تھا، ڈکی سیٹ پر سامنے کے شیشے میں سے ہم اگلی سیٹ کا پورا ڈرامہ دیکھ سکتے تھے بچہ کونے میں تکیہ پر سر رکھ کر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ صاحب اور میم صاحب ایک دوسرے سے چپکے بیٹھے تھے، صاحب کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر تھا اور دوسرا میم صاحب کی کمر کے گرد تھا۔

میں نے نکھیوں سے اسٹیلا کی طرف دیکھا اور نہ جانے کیسے اسی وقت اسٹیلا نے میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ بھی دھیرے دھیرے اسٹیلا کی کمر کے گرد ہو گیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس کسی قدر تیز ہو گیا ہے اور پھر جب سڑک کے کنارے ایک بڑے خوب صورت جھرنے کے پاس صاحب نے موٹر روک کر میم صاحب کے ہونٹوں کو چوم لیا تو صاحب پھر میں کیا کرتا، میں نے بھی اسٹیلا کو چوم لیا، اس کے بن لپ اسٹک کے ہونٹوں کا مزا ایسا تھا جیسے کسٹرڈ پڈنگ ہو اور جب اسے چوم رہا تھا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی انگلیوں کے ناخن میرے بازو میں کھپ گئے۔ ہوٹل پر پہنچتے پہنچتے اسٹیلا اور جونی کا لو LOVE پکا ہو گیا۔

پہلی ہی نظر میں میں نے دیکھا کہ ہوٹل شاندار تو نہیں مگر جگہ ضرور دلچسپ ہے۔ بڑے بڑے اور اونچے اونچے دیودار اور چیڑ کے پیڑوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا بنگلہ تھا جس میں کچن ڈرائنگ روم، ایک لاؤنج جس میں ریڈیو لگا تھا اور مسٹر فریرا کے اپنے رہنے کے کمرے تھے۔ پارسی صاحب کے لیے ایک بنگلہ پہلے سے ریزرو تھا، سو وہ تو ادھر اترے اور میں انہیں تھینک یو سر، تھینک یو میڈم کہہ کر اور اسٹیلا کو آنکھ کے اشارے سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہوٹل کے مالک سے ملنے چلا گیا۔

مسٹر فریرا اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹا بیئر پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی، لیٹے، لیٹے بولا۔

''ویل جونی تم آ گیا، کیوں آج ہی کام شروع کرے گا؟''

چورا ہے پر جو باتیں سنی تھیں ان کو یاد کر کے میں نے کہا:

''سر ایک بات پہلے سے بول دوں، پگار کے علاوہ کھانا مفت ملے گا تب کام کروں گا اور پھر یہ نہیں کہ دن میں اٹھارہ گھنٹے ڈیوٹی کرنی پڑے۔''

فریرا کے چہرے پر اس کی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی مونچھیں بھی پھیلتی گئیں۔

''لگتا ہے عبدل راستے میں ملا ہے۔''

''جو بھی ملا ہو، مگر پہلے سے بات صاف کرنا اچھا ہے صاحب۔''

''گھبراؤ نہیں، اگر تم دوسرے بیروں کی طرح کام کرنا نہیں چاہتے تو میں تمھیں اسپیشل ڈیوٹی پر لگا دوں گا۔ پچاس روپیہ مہینہ کھانا مفت اور اسپیشل کام میں ٹپ بھی بہت ملتے ہیں''

یہ کہہ کر اس نے بیئر کا گلاس اٹھایا اور میری طرف اٹھا کر کہا:

'چیرز'

میں نے کہا:

''مگر وہ کیا کام ہے صاحب؟''

بیئر کا گلاس نیچے رکھ کر اس نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا پھر بوتل اٹھا کر دوسرے گلاس میں انڈیلی اور یہ گلاس میری طرف بڑھایا۔

''لو پہلے یہ پیو پھر سب معلوم ہو جائے گا۔''

میں نے گلاس اٹھا تو لیا مگر پینے سے پہلے جھجکا۔ میں نے اپنے اسکول کے دوستوں کے ساتھ چوری چھپے بیئر پی تو ہے مگر خلاف قانون اس طرح دن دہاڑے پیتے ڈر لگا۔ میں نے کہا۔

''سر...... میرے پاس...... پرمٹ نہیں ہے۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسا۔

''تم سمجھتے ہو جتنے لوگ آج کل شراب پیتے ہیں، یہ سب پرمٹ ہولڈر ہیں؟ اودھر پرمٹ ہو بھی تو مہینے میں صرف ایک دو بوتل وہسکی ملتی ہے اور ان لوگوں کو ہر روز ایک بوتل چاہیے۔ پیو۔ پیو۔ جوان آدمی ہو کر اتنا ڈرتے ہو؟''

ورجن میری کی تصویر کے سامنے موم بتی جلا کر دعا ضرور مانگتی۔

''او ورجن میری، مدر آف گاڈ میرے باپ کو صحت دینا اور میرے جونی کو بہت سارو پیہ دینا تا کہ ہم گرجا میں اپنی شادی رچا سکیں اور یہ نوکری چھوڑ کر ہمیشہ آرام سے رہ سکیں اور اگر ایسا ہوا تو میں وعدہ کرتی ہوں، ہم باندرہ کے ماؤنٹ میری والے گرجا میں تین تین فٹ لمبی موم بتیاں چڑھائیں گے۔آمین۔''

اور میں وہسکی اور محبت دونوں سے بدہوش ہو کر جب سوتا تو، خواب میں دیکھتا کہ ایک ہزاروں فٹ اونچی موم بتی ہے جس کی روشنی سے ساری دنیا جگمگا رہی ہے اور میں اس پر سیڑھی لگا کر چڑھ رہا ہوں۔مگر جیسے جیسے میں اوپر چڑھتا جاتا ہوں، یہ موم بتی اونچی ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی لو مجھ سے اتنی ہی دور رہتی ہے، جیسے پہلے تھی اور پھر سیڑھی پر میرا پیر پھسل جاتا ہے اور میں کئی آسمانوں میں سے گزرتا ہوا زمین پر گرتا اور میرا بھیجا ٹوٹ کر پاش پاش ہو جاتا اور اس میں سے ایک کسٹرڈ کریم کے رنگ اور مزے کی چیز نکلتی اور میں یہ سوچتا ہی ہوتا کہ یہ میرا بھیجا ہے کہ اسٹیلا کے ہونٹ ہیں کہ آنکھ کھل جاتی اور میں اپنے پہلو میں ایک خلا محسوس کرتا اور جب اٹھ کر باہر جھانکتا تو دیکھ کہ سورج سر پر چڑھ آیا ہے اور بیرے صاحب لوگوں کے لیے بریک فاسٹ کی ٹرے لیے بھاگ رہے ہیں اور باغ میں اسٹیلا اپنی میم صاحب کے بچے کو کھلا رہی ہے۔

ہوٹل پربت میں ان دنوں بہت سے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ایک نمبر میں ایک مارواڑی سیٹھ تھا جو دھوتی کے بجائے شارک اسکن کے سوٹ پہنتا تھا اور جس پر ایک سرکاری افسر کو رشوت دے کر ٹھیکہ لینے کے جرم میں مقدمہ چل رہا تھا اور جو وہاں ایک بیس سالہ اینگلو انڈین چھوکری کو ساتھ لے کر غم غلط کرنے آیا تھا۔دو نمبر اور تین نمبر میں ایک فلم ڈائریکٹر اور ایک فلم ایکٹریس الگ الگ کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے، جن کے درمیان ایک دروازہ تھا جو دونوں طرف سے بند کیا جا سکتا تھا، یا کھولا جا سکتا تھا۔نمبر چار میں ایک بیرسٹر اور اس کی بیوی تھی مگر بیروں میں کھسر پسر چل رہی تھی کہ بیرسٹر کی بیوی دراصل اس کی بیوی نہیں ہے، کسی اور کی بیوی ہے۔نمبر پانچ میں ایک گجراتی جوڑا ٹھہرا ہوا تھا اور ان دونوں کے میاں بیوی ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا، اس لیے کہ وہ برسوں سے ہر سال اسی سیزن میں آتے تھے اور ہر رات کو شراب پینے

کے بعد لڑتے جھگڑتے تھے۔ نمبر چھ میں اسٹیلا کے صاحب اور میم صاحب اور ان کا بچہ ٹھہرے ہوئے تھے اور شاید یہ خاندان سب سے زیادہ غیر دلچسپ اور نارمل تھا۔ شوہر موٹروں کا دھندا کرتا تھا۔ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا، ایک بچہ پیدا کر چکا تھا اور دوسرے کی تیاری تھی۔ نمبر سات خالی پڑا تھا اور ایک منسٹر صاحب کے لیے رزرو تھا۔ نمبر آٹھ میں ایک امریکن جرنلسٹ ٹھہرا ہوا تھا، جو دن بھر ٹائپ کرتا تھا، رات بھر ریڈیو سنتا تھا اور ہر وقت وسکی پیتا تھا۔ نمبر نو میں ایک بوڑھے پروفیسر صاحب تھے جن کی موٹی موٹی فلاسفی کی کتابوں میں فرانسیسی اور امریکن رسالوں میں سے کاٹی ہوئی ننگی یا آدھی ننگی عورتوں کی تصویریں رکھی ہوئی ملتی تھیں اور جو برآمدے میں بیٹھے دن بھر دوربین سے نیچے سڑک پر آنے جانے والی کسان عورتوں کو دیکھا کرتے تھے۔ نمبر دس میں......
مگر اب کہاں تک آپ کو بتاؤں بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہوٹل کے بائیس کمروں میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مزیدار کہانی تھی بلکہ ڈرامہ تھا۔ پڑھے لکھے، ادھ پڑھ، ان پڑھ، سب اس ہوٹل میں شراب پینے اور عیش کرنے آتے تھے۔ بمبئی میں وہ مشہور عزت دار نام والے شہری تھے۔ جو گئوشالہ کے لیے چندے دیتے تھے، جلسوں میں لمبی لمبی تقریریں کرتے تھے، شراب بندی کی حمایت میں بڑے، بڑے اعلانوں پر دستخط کرتے تھے لیکن نہ جانے کیسے، ہوٹل پر بت پہنچتے ہی ان میں اتنی تبدیلی ہو جاتی۔ اس وقت تک مجھ پر ان بڑے لوگوں کا بڑا رعب تھا مگر یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ شارک اسکن سوٹوں، جارجٹ کی ساڑیوں اور کھدر کے لیڈروں والے کپڑوں کے نیچے، وہ بھی میرے اور اسٹیلا جیسے انسان ہیں اور کوئی بھی پاپ ایسا نہیں ہے جس سے وہ بچے ہوئے ہوں۔ مسٹر فریرا جواب بہت کم مجھ سے بات کرتا تھا، ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔

''کیوں جونی، تم خواہ مخواہ قانون سے ڈرتے تھے۔ یہاں تو سماج کے سارے ہی ٹھیکیدار شراب بندی کو توڑنے پر لگے ہوئے ہیں۔''

مجھے کام شروع کیے ہوئے کوئی پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ ایک دن دوپہر کو میں اور اسٹیلا روز کی طرح پیڑ کے نیچے لیٹے باتیں کر رہے تھے۔ اس دن وہ موڈ میں نہیں تھی، چپ چاپ تھی مگر اس موڈ میں مجھے وہ اور بھی پیاری لگ رہی تھی، میں نے کہا۔

''اسٹیلا چپ کیوں ہو؟ کیا مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟''

وہ بولی:

''نہیں جونی تمھاری کوئی بات نہیں، وجہ کچھ اور ہی ہے، سوچتی ہوں اپنے دکھ بتا کر تمھیں بھی کیوں دکھی کروں۔''

میں نے کہا ''اسٹیلا۔ میں تم سے لو LOVE کرتا ہوں تو میں تمھارے دکھ سکھ دونوں کا ساتھی ہوں۔''

یہ ڈائیلاگ مجھے ایک امریکن فلم میں سے یاد تھا مگر جو میں نے کہا میرے دل میں بھی یہی تھا کیونکہ اسٹیلا کی محبت میرے دل میں یوں ابل رہی تھی۔ جیسے بوتل کھولنے پر شاسپین ابل آتی ہے۔

ہاں تو پھر اس نے کہا ''بات یہ ہے جونی کہ ممی کا لیٹر آیا ہے ڈاکٹروں نے کہا ہے ڈیڈی کوٹی بی ہوگئی ہے سینی ٹوریم میں رکھنا ضروری ہے، بہت خرچہ ہوگا۔''

میں نے کہا ''اسٹیلا گھبراؤ نہیں، پچاس روپے جواب تک ٹپ میں ملے ہیں میرے پاس ہیں، پگار ملنے میں تو ابھی دیر ہے۔''

وہ بولی ''جونی پچاس روپے سے کیا ہوگا کم سے کم پانچ سو روپے تو فوراً چاہییں۔''

اتنی بڑی رقم سن کر میں چپ ہوگیا۔ سوچ رہا تھا کہ کیا ترکیب کروں کہ اسٹیلا کا کام بن جائے۔

اس نے کہا ''میں نے میم صاحب سے کہا تھا مجھے پانچ سو روپے ایڈوانس دیدیں اور میری پگار میں سے کاٹتی جائیں مگر وہ کہتی ہیں کہ جب سے بڑی گاڑیوں کی امپورٹ بند ہوئی ہے، کاروں کا دھندا بہت ڈاؤن ہوگیا ہے۔ ان کے صاحب خرچہ کم کرنے کو کہہ رہے ہیں، مجھے تو لگتا ہے بچہ اب بڑا ہوگیا ہے، شاید اگلے مہینے مجھے بھی نوٹس دیدیں۔''

'پھر؟'

میں نے سوال کیا مگر مجھے معلوم تھا کہ اسٹیلا بیچاری کیا جواب دے سکتی ہے۔ اور سو ہم چپ چاپ پیڑ کے نیچے لیٹے رہے اور سوکھے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر ہم پر برستے رہے اور اسٹیلا کی خوشبو جو کل تک مجھے پاگل بنا دیتی تھی ہوا میں پھیلتی رہی مگر آج ہماری جوانی اور ہماری محبت دونوں پانچ سو روپیوں کی قید میں تھی ۔۔۔ نہ جانے کب تک ہم یوں ہی لیٹے رہے سوکھے پتوں کے

فرش پر کسی کے چلنے کی آواز آئی تو میں چونکا، دیکھا تو اپنے ہوٹل کے مالک یعنی مسٹر فریرا چلے آرہے ہیں۔ اسٹیلا گھبرا کر مجھ سے علیحدہ ہوگئی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مسٹر فریرا بولے تو مجھ سے مگر ان کی آنکھیں اسٹیلا پر جمی ہوئی تھیں، جیسے اس کے جسم کو ٹٹول رہے ہوں۔ کہنے لگے:

''ویل جونی، اپنی فرینڈ سے انٹروڈیوس نہیں کرو گے؟''

میں نے جلدی سے ان کا انٹروڈکشن کرایا۔

''یہ ہے میری فرینڈ اسٹیلا — اسٹیلا جوزف — اور اسٹیلا یہ ہیں میرے باس BOSS مسٹر فریرا۔''

اسٹیلا نے ہلو کہا اور ساڑی کا پلو سر پر ڈال لیا۔ مگر مسٹر فریرا نے اپنا چکنا ہاتھ جو ہمیشہ پسینہ سے بھیگا رہتا ہے، شیک ہینڈ کے لیے بڑھایا اور جب تک اسٹیلا نے ہاتھ نہ ملایا وہ اسی طرح ہاتھ بڑھائے رہے اور پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے بولے:

''جونی تم بڑے لکی ہو۔''

پھر میری طرف دیکھ کر کہا:

''یہاں سے جب فرصت ملے تو مجھے آفس میں آکر ملنا۔''

جب وہ چلا گیا تو اسٹیلا نے کہا

''جونی مجھے تمھارے BOSS سے ڈر لگتا ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا:

''اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے اسٹیلا۔ بیوٹی کو تو سب ہی ایڈمائر کرتے ہیں۔ اچھا ہوا ان کی ملاقات تم سے ہوگئی میں اس سے پانچ سو روپے ایڈوانس کی بات کروں گا۔''

جب میں دفتر میں گیا تو فریرا بیٹھا ہوا پائپ پی رہا تھا اور ایک امریکن فلم میگزین کے ورق الٹ رہا تھا کہنے لگا:

''سِٹ ڈاؤن جونی، دیکھو کل سنڈے ہے اس لیے آج رات کو پندرہ، بیس بیئر کی بوتلیں اپنے روم میں لاکر رکھ لینا بمبئی سے ایک بڑی پارٹی آنے والی ہے۔

میں نے کہا:

"یس سر۔"

پھر میں نے سوچا کہ یہ موقع ایڈوانس کی بات کرنے کے لیے اچھا ہے۔

"سر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔"

"ہاں، ہاں بولو۔"

"مجھے پانچ سو روپے ایڈوانس چاہئیں۔"

"پانچ سو روپے تو بڑی رقم ہوتی ہے جونی، کیوں ایسا کیا کام آ گیا؟"

میں نے سوچا اسے اسٹیلا کے ڈیڈی کی بیماری کے بارے میں بتادوں تو شاید کام بن جائے۔ سب کچھ سن کر وہ ایک بڑی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

"گھبراؤ مت جونی۔ میں کوئی نہ کوئی انتظام کر دوں گا مگر رقم بڑی ہے اس لیے تھوڑا ٹائم لگے گا۔"

'تھینک یو سر'

کہہ کر میں وہاں سے آ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا:

"جونی تم کل چرچ چلو گے سنڈے سروس سویرے نو بجے ہوتی ہے۔"

میں نے کہا:

"سر مجھے تو معاف کیجیے رات کو سونا لیٹ ہوتا ہے اس لیے آنکھ ہی بہت دیر میں کھلتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ اچھا گڈ بائی جونی۔"

میں نے رات کو اسٹیلا سے کہہ دیا کہ کوئی فکر نہ کرے کیونکہ مسٹر فریرا نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی انتظام کر دیں گے۔ اس رات کو سونے سے پہلے اسٹیلا بڑی دیر تک دعا مانگتی رہی۔

"او ورجن میری، مدر آف گاڈ میری مدد کرو، میرے ڈیڈی کو صحت دو اور میرے جونی کو کوئی اچھا سا کام دلوا دو۔"

دعا مانگ کر جب وہ میرے پہلو میں آ لیٹی تو میں نے پوچھا:

"کیوں اسٹیلا میں جو کام کرتا ہوں وہ تمھیں برا لگتا ہے؟"

"جواب میں وہ چپ رہی۔ میں نے پھر پوچھا۔

"کیوں اس لیے کہ شراب بندی کے قانون کو توڑتا ہوں مگر یہ سب بڑے بڑے آدمی بھی تو اس قانون کو توڑتے ہیں اور پھر ہم کرسچین لوگوں میں تو شراب پینا برا نہیں سمجھا جاتا۔"

وہ بولی:

"یہی تو افسوس ہے، جانتے ہو اب سے دس برس پہلے میرے ڈیڈی اسٹیشن ماسٹر تھے۔ ساڑھے تین سو پگار ملتی تھی، ہم بنگلے میں رہتے تھے، میں کانونٹ میں پڑھنے جاتی تھی۔

پھر وہ چپ ہوگئی میں نے پوچھا:

"اور پھر؟"

"پھر ڈیڈی اپنی صحت اور ہماری خوشی سب کو وہسکی اور جب وہسکی کے دام نہ رہے تو ٹھرّے میں گھول کر پی گئے، میں اسکول چھوڑ کر آیا کا کام کر رہی ہوں اور ہمارے پاس اتنا بھی نہیں کہ ڈیڈی کا ٹی بی کا علاج کرا سکیں۔

اور اس رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک سمندر ہے شراب کا اور اس میں اسٹیلا اور اس کی ممی اور اس کا ڈیڈی اور میں سب غوطے کھا رہے ہیں اور ڈوبتے ڈوبتے میں نے ہاتھ پاؤں مارے تو آنکھ کھل گئی کھلے دروازے میں سے دھوپ آرہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھا باہر جھانکا تو دیکھا کہ اسٹیلا کی میم صاحب اپنے بچے کے ساتھ کھیل رہی ہیں اور اسٹیلا وہاں نہیں ہے۔ کپڑے پہن کر باہر آیا اور ان سے پوچھا:

"میم صاحب اسٹیلا کہاں گئی؟"

انھوں نے کہا

"چرچ گئی ہے۔"

یہ سن کر میں مسکرایا بیچاری اسٹیلا مذہب کی کتنی پابند ہے اور ایک میں ہوں کہ برسوں چرچ نہیں جاتا مگر پھر میم صاحب بولیں:

"مسٹر فریرا کے ساتھ موٹر میں گئی ہے جلدی ہی آجائے گی۔"

اور نہ جانے کیوں میرے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور میرا دل ایک عجیب خوف

سے بھر گیا۔

دوپہر کو کھانے کے بعد جب اسٹیلا آئی تو اس نے کہا:

"جونی، تمہارا BOSS تو بڑا اچھا آدمی ہے چرچ کے کاموں میں بہت روپیہ دیتا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میم صاحب مجھے نوٹس دیدیں تو میں یہیں ہوٹل پر بت میں نوکری کرلوں۔"

نہ جانے کیوں مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔

"تم یہاں کیا کام کرو گی؟"

میں نے کسی قدر جل کر کہا۔

"وہ کہتے ہیں انہیں ایک عورت ہاؤس کیپر کی ضرورت ہے جو ہوٹل کے سب کمروں کی صفائی اور سجاوٹ کی دیکھ بھال کرے اور مہمانوں میں جو عورتیں آتی ہیں ان کا خاص خیال رکھے۔ سو روپیہ پگار دیں گے اور رہنے کے لیے کمرہ کھانا مفت۔ سوچو تو سہی جونی اب میں اور تم ایک ہی جگہ رہ کر کام کر سکتے ہیں۔ تم چاہو تو شادی بھی کر سکتے ہیں۔"

یہ بات مجھے پسند آئی کیونکہ اسٹیلا کے بغیر زندگی مجھے بالکل IMPOSIBBLE نظر آتی تھی میں نے کہا:

"تو ڈارلنگ تم اپنے اور ڈیڈی کو لکھ کر پوچھ لو اور میں چرچ میں نوٹس دے آتا ہوں، اگلے ہفتے اپنی شادی ہو جانی چاہیے"

اسٹیلا نے کہا:

"جونی ایک بات کہوں برا مت ماننا۔"

"کہو اسٹیلا۔"

"اب میں تمہارے کمرے میں سونے نہیں آؤں گی اور یہاں بھی نہیں آیا کروں گی آج میں چرچ میں اپنے پرانے گناہوں کا کنفشن کر کے آئی ہوں۔ اب میں شادی ہونے تک کوئی گناہ نہیں کروں گی۔"

میں نے ہنس کر کہا:

"جیسی تمہاری مرضی۔ مگر پیار تو کر سکتا ہوں نا؟"

یہ کہہ کر میں نے اسے چمٹا کر چوم لیا اور اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا:

''بس آگے نہ بڑھنا۔''

تیسرے دن میں مسٹر فریرا کے پاس گیا۔

''سر اس ایڈوانس کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟ اسٹیلا کے ڈیڈی کو جلدی سینی ٹوریم نہ بھیجا گیا تو اس کی جان بچنی مشکل ہو جائے گی اور اس کے علاوہ...... سر...... وہ...... بات یہ ہے کہ میں اور اسٹیلا اگلے ہفتے شادی کر رہے ہیں۔''

وہ لکھنے کی میز کی پاس گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ سنتے ہی لٹو کی طرح گھوم کر بولا:

''یہ کیا نان سنس ہے، تم یہاں کام کرنے آئے ہو یا شادی بیاہ رچانے؟''

میں نے کہا:

''سر آپ کے کام میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ شادی بیاہ ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے۔''

کچھ دیر سوچ کر وہ بولا:

'' آل رائٹ، جیسی تمھاری مرضی مگر شادی کر رہے ہو تو آمدنی بھی بڑھاؤ ورنہ بیوی کو پچاس روپیہ مہینے پر کیسے رکھو گے اور پھر تمھاری اسٹیلا ہے بھی تو بہت خوب صورت۔''

میں نے کہا

''سر اگر آپ پگار بڑھا سکیں تو......''

اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

''ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر تھوڑا کام اور کرنا پڑے گا۔ پھر سو روپے پگار دوں گا۔''

''سر میں تیار ہوں، جو بھی آپ کہیں گے میں کروں گا۔''

''تو سنو۔''

یہ کہہ کر اس نے مجھے پاس بلا کر اپنا سارا پلان بتایا۔ اب تک وہ ہوٹل کے مہمانوں کو ولایتی شراب بلیک مارکیٹ سے خرید کر سپلائی کرتے تھے۔ مگر اب مسٹر فریرا نے پاس کے گاؤں سے ایک آدمی بلایا تھا۔ جو اسی مندر کے کھنڈر میں زمین کے نیچے تہہ خانے میں ایک بھٹی لگائے گا اور تب ہم دیسی شراب کو ولایتی بوتلوں میں بھر کر پانچ گنا منافع کمائیں گے۔ مسٹر فریرا بولے:

"جونی میں چاہتا ہوں تم بھی یہ کام سیکھ لو پھر میں اس بزنس میں تمھیں اپنا پارٹنر بنالوں گا۔"

میں نے کہا

"اور ایڈوانس؟"

"وہ بھی مل جائے گا۔ جس دن تمھاری شادی ہوگی، پانچ سو روپیہ نقد کا تحفہ دوں گا مگر ایک شرط ہے، اس نئے کام کا ذکر نہ کرنا کسی سے بھی۔"

"اسٹیلا سے بھی نہیں، وہ تو میری ہونے والی بیوی ہے۔"

"ٹھیک ہے، مگر ایسے کاموں سے عورتوں کو دور رکھنا ہی بہتر ہے۔ کہو منظور ہے؟"

میں نے کہا:

"آل رائٹ سر میں اسٹیلا سے بھی نہیں کہوں گا۔"

چند روز میں میں نے شراب بنانا سیکھ لیا۔ وہ جو گاؤں سے دارو بنانے والا آیا تھا وہ سچ مچ استاد تھا۔ کیا بڑھیا کام سکھایا ہے صاحب کہ آج تک اسی کی روٹیاں کھا رہا ہوں۔

جس دن ہماری شادی ہونے والی تھی، اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ میں رات کو اکیلا مندر کے کھنڈر میں شراب بنا رہا تھا کہ جنگل کی طرف سے سیٹی بجنے کی آواز آئی، مجھے کچھ شبہ ہوا میں جلدی جلدی بھٹی کا سامان ٹوٹی ہوئی مورتیوں کے پیچھے چھپانے لگا۔ مگر ابھی سامان بھی چھپا نہ پایا تھا کہ بھاری بھاری بوٹوں کی آواز آئی جو پتھر کا زینہ اتر کر نیچے آرہے تھے۔ پولیس میں نے سوچا مگر انھیں اس جگہ کا پتہ کیسے چلا، ضرور کسی نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے مگر کس نے؟

اور سو میں پکڑا گیا صاحب اور پربت پور کی کورٹ میں پیش ہوا میرا جرم تو ثابت تھا ہی، میں نے کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ مگر میں نے اور کسی کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس کی انکوائری ہوٹل پربت تک پہنچے اور اسٹیلا اس جھگڑے میں پھنسے اور نہ میں اپنے Boss کو اس مقدمے میں گھسیٹنا چاہتا تھا۔ تین مہینے کی سزا سنائی گئی میں نے سوچا چلو یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ پھر فریرا صاحب نوکری تو ضرور دے ہی دے گا۔ مگر برابر یہ سوال مجھے کھائے جا رہا تھا کہ میرے خلاف پولیس کو رپورٹ کس نے دی۔ سو جب وہی حولدار جس نے مجھے گرفتار کیا تھا ڈسٹرکٹ جیل میں چھوڑنے آیا تو جیل کے دروازے پر رخصت ہونے سے پہلے میں نے اس

سے پوچھا کہ یہ تو بتاؤ میری رپورٹ کس نے کی تھی؟

اس نے تعجب سے کہا:

''ارے تمھیں سچ مچ نہیں معلوم؟ ہوٹل پربت کے مالک مسٹر فریرا ہی نے تو پولیس کو رپورٹ دی تھی کہ ان کا ایک ملازم اس کھنڈر میں شراب بنانے کا کام کرتا ہے مگر ان کی شرط یہ تھی کہ مقدمے میں ان کی گواہی نہ لی جائے۔''

جیل کا لوہے کا دروازہ ایک جھنکار کے ساتھ بند ہو گیا لیکن فریرا کے بارے میں جو میں نے سنا تھا اس کی جھنکار تین مہینے تک میرے دماغ میں گونجتی رہی۔ جیل کی ورکشاپ میں میں نے موٹر ریپئیر کا کام سیکھا اور اور جیل کی کوٹھری میں وقت کاٹنے کے لیے ایک قیدی سے شراب بنانے کے اور بہت سے نسخے سیکھے اور دوسرے سے تالا توڑنا اور چاقو چلانا سیکھا تین مہینے کے بعد جب میں جیل سے رہا ہوا تو سیدھا ہوٹل پربت پہنچا۔ دوپہر کے تین بجے تھے، کھانا کھا کر سب مہمان ہی نہیں ہوٹل کے بیرے اور ویٹر اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، ایسا لگتا ہے ہوٹل پربت مر چکا ہے اور اب گرمی کی اس سنسان دوپہر میں اس کی لاش دھوپ میں پڑی سڑ رہی ہے ڈرائنگ روم میں شام کی چائے کے لیے میزیں لگی ہوئی تھیں، گلدانوں میں بڑے سلیقے سے پھول سجے تھے اور دیواروں پر لگی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کیے جا رہی تھی۔ کچن میں جھانک کر دیکھا وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ صرف ٹیبل پر ڈبل روٹی کے توس کاٹنے والی تیز اور چمکیلی چھری پڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ وقت فریرا کے سونے کا ہے اس کے بیڈ روم کا دروازہ بھی مجھے معلوم تھا۔ دبے پاؤں برآمدے میں سے ہوتا ہوا میں دروازے تک پہنچا، دائیں ہاتھ میں چھری سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے دروازے کو دھکا دیا۔

وار کرنے ہی والا تھا تو وہ چھری میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور پتھر کے فرش پر ایک جھنکار کے ساتھ گری۔ پلنگ پر فریرا اکیلا نہیں تھا، کوئی اور بھی تھا، تھا نہیں تھی اسٹیلا۔

بس تو صاحب یہ ہے میری کہانی اور اس پچاس میل لمبی سڑک کی کہانی جو یہاں سے ہوٹل پربت تک جاتی ہے اس سڑک پر ہر روز بڑی بڑی موٹریں جاتی ہیں اور چند روز کے بعد لوٹتی ہیں

اور وہاں جانے والے بڑے بڑے آدمی اکثر مجھ سے ہی شراب خرید کر لے جاتے ہیں اور وہاں ہوٹل پربت میں لے جا کر پیتے ہیں اور واپسی پر پھر یہاں ٹھہرتے ہیں اور مجھ سے اپنے ٹائروں میں پنکچر لگواتے ہیں، ہوا بھرواتے ہیں، پٹرول ڈلواتے ہیں اور کوئی ٹوٹ، پھوٹ ہوگئی ہو تو اس کی ریپئر بھی کرواتے ہیں اور ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہوٹل پربت کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں اس ہوٹل کا مالک بھی ڈیم لکی ہے، کیا خوب صورت چھوکری رکھ چھوڑی ہے سچ پوچھو تو اس کو دیکھ کر ہی ہوٹل کا کرایہ وصول ہو جاتا ہے اور سو میں جانتا ہوں کہ اسٹیلا زندہ ہے اسٹیلا ابھی تک حسین ہے اور اسٹیلا ابھی تک فریرا کے ہاتھ بکی ہوئی ہے اور جب تک ایسا ہے تب تک میں انتظار کر رہا ہوں۔

اب دو ہی صورتیں ہیں، یا تو اس سڑک پر روپے بچھاتا ہوا میں ہوٹل پربت تک جاؤں گا اور وہاں سے اسٹیلا کو چھڑا کر لاؤں گا، جیسے سینٹ جارج نے اژدھے کے چنگل سے حسینہ کو چھڑایا تھا اور یا ایک دن وہ خود یہاں سے گزرے گی۔ ہوسکتا ہے فریرا کی ہڈسن میں یا کسی اس سے بھی امیر آدمی کی پکارڈ میں یا پھر شاید آئی۔ ایس۔ ٹی IST کی بس۔ میں مگر اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ وہ اس چوراہے پر ضرور ٹھہرے گی اور اس سے آگے میرے بغیر نہیں جائے گی۔ اور پھر میں اور وہ دونوں ایک نئی سڑک پر روانہ ہو جائیں گے۔ صرف یہ نہیں معلوم کہ زندگی کی سڑک ہوگی یا موت کی؟

چوتھی سڑک کی کہانی
اس چاولی کی زبان جو کبھی چمارن چاولی کہلاتی تھی اور اب
چاولی دیوی کہلاتی ہے!

دس برس ہوئے اگر میں یہ کہانی کہنے بیٹھتی تو آپ سے ہجور (حضور) کہہ کر بات کرتی، پانچ برس پہلے اگر یہ کہانی سناتی تو سرکار کہتی اور اب اگر آپ مجھ سے بڑے ہیں تو بھائی جی کہوں گی اور اگر مجھ سے چھوٹے ہیں تو بھیا کہوں گی کیونکہ دنیا بدل رہی ہے یہ دیش بدل رہا ہے میں خود کتنی بدل گئی ہوں، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ پہلے میں کبھی چاولی چمارن کہلاتی تھی اور

اگر میرا سایہ بھی کسی براہمن پر پڑ جاتا تو اسے اپنے آپ کو پوتر کرنے کے لیے اشنان کرنا پڑتا اور کتنے ہی اشلوک منتر پڑھنے پڑتے۔ اس کے بعد میں مزدورنی نمبر سترہ سو بائیس (1722) چاوَلی ولد...... چمار کہلائی اور اب وہی میں، سڑک کامگار یونین کی کمیٹی کی ممبر چاولی دیوی کہلاتی ہوں، ہندی کی کتاب، اخبار پڑھ سکتی ہوں اور جب ہمارے جلسے کی رپورٹ لکھی جاتی ہے تو اس پر اپنے قلم سے دستخط کرتی ہوں۔

آپ نے تین سڑکوں کی کہانی تو سن لی، اب اس چوراہے کی چوتھی سڑک کی بھی کہانی سن لیجیے جو میری کہانی بھی ہے۔ دراصل یہ کہانی دوسری کہانیوں سے الگ اور بے تعلق نہیں ہے بلکہ ان کہانیوں ہی کا سلسلہ ہے جیسے سلطان آباد اور ہوٹل پربت والی تینوں سڑکیں الگ الگ چلتے چلتے اس چوراہے تک پہنچتی ہیں اور یہاں سے تینوں مل کر ایک چوتھی سڑک بن جاتی ہے۔ اسی طرح میری کہانی میں ان تینوں کی بھی کہانیاں نہ صرف موجود ہیں بلکہ آگے بڑھ رہی ہیں ان تین مسافروں کی طرح سے جو چلے تھے اپنے اپنے شہروں سے لیکن جن کو جانا ایک ہی جگہ ہے تین سڑکیں، تین مسافر۔ جان فرینڈ یز جو کب سے اپنے گیرج میں بیٹھا اسٹیلا کا انتظار کر رہا ہے۔ پیاری پنواڑن، جو پان بناتے وقت صرف اپنے دلاور کے بارے میں سوچتی ہے اور پنڈت کرپا رام جو کبھی گوبندا کہلاتا تھا......

وہ دن آج تک مجھے یاد ہے جب میں نے اپنے دل سے مجبور ہو کر گوبندا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اس نردئی نے ہاتھ جھٹک کر غصے سے کہا تھا:

''چلی جا یہاں سے۔''

عورت کا ہاتھ مرد کے ہاتھ سے کمزور ہوتا ہے، جبھی تو میں گوبندے کو روک نہ سکی مگر عورت کے ہاتھ میں بھی ایک خاص طاقت ہوتی ہے اور وہ ہے پہچاننے کی طاقت، ایک پل کو بھی اسے کوئی چھو لے تو وہ جان جاتی ہے کہ اس آدمی کے دل میں کیا ہے؟ محبت ہے یا نفرت اور اگر محبت ہے تو صرف دو گھڑی کا دل بہلا دے والا پیار یا سچی پکی پریت اور اگر نفرت ہے تو وہ اوپری اور بناوٹی نفرت ہے، جس کے پردے میں اکثر پیار چھپا ہوتا ہے یا سچ مچ گہری نفرت ہے؟ اس دن جب میں نے گوبندا کا ہاتھ پکڑا تو میرا شریر پیار کی گرمی سے تپ رہا تھا، جیسے مجھے بخار چڑھ رہا ہو

اور گوبندے کا ہاتھ ٹھنڈا تھا، جیسے برف۔ پر جب لاٹھی پکڑنے کے بہانے میرے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو چھوا تب اس نے فوراً میرا ہاتھ نہیں جھٹکا جیسے اس کے دل نے ابھی یہ فیصلہ نہ کیا ہو کہ مجھ سے اور میرے پیار سے پیار کرے یا نفرت؟ مجھے ایسا لگا کہ پیار کی گرمی اس کے برف جیسے ہاتھ کو گرما رہی ہے، پگھلا رہی ہے۔ اس سے ہم دونوں کی رگوں کا خون دوڑتا ہوا ہمارے بچپن کی طرف واپس جا رہا تھا جب گوبندا اہیر نہیں تھا اور میں چمارن نہیں تھی۔ ہم صرف بچے تھے، جن کو ایک دوسرے کے ساتھ کھیلنا اچھا لگتا تھا۔ ان دنوں ہی میں اس محبت کا بیج پڑا تھا، جس کی چھاؤں میں برسوں میں چپ چاپ بیٹھی گوبندا کی راہ تکتی رہی مگر جب بچپن کے سپنے ٹوٹ گئے تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ میں اچھوت چمارن چھوکری ہوں جس کی قسمت میں ایک چمار کی بیوی اور پھر بال ودھوا بننا لکھا ہے اور گوبندا ہم سے کہیں اونچی جاتی کا اہیر ہے جو صرف کسی اہیر کی بیٹی ہی کو بیاہ سکتا ہے۔ سو میرے من کی من ہی میں رہی، میں نے کبھی اپنی نظروں سے بھی اپنے پیار کا بھید کھلنے نہ دیا پر جب میں نے دیکھا اور سنا کہ گوبندا اس پیلی سوکھی بامنی پر لٹو ہو رہا ہے تو نہ جانے کیوں اور کیسے میرے سارے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ سو اس دن میں نے گوبندا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی کلائی کی ایک دھڑکتی ہوئی رگ نے میری ہتھیلی سے کہا کہ میری جوانی نے تیری جوانی کا سندیسہ سن لیا ہے، میں تجھ سے پیار کر سکتا ہوں چاولی مگر............اور اس کی کلائی کی رگ پھڑکتے پھڑکتے جیسے ایک پل کے لیے رک گئی ہو۔ میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں پیار کی جوت بجھتی ہوئی دکھائی دی، جیسے ایک دم کوئی بجلی کا بٹن دبا کر اندھیرا کر دے۔ اب بھی وہ میرے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا، مگر جیسے لوگ کسی بھیانک یا منحوس چیز کو دیکھتے ہیں اور پھر اس زور سے میرا ہاتھ جھٹکا اور چلایا:

''چلی جا یہاں سے۔''

اور اس سے میری نظروں میں براہمن کی چھوکری رادھا کا پیلا پیلا چہرہ گھوم گیا میں نے سوچا گوبندا اب تک اسی کے چکر میں ہے جبھی میرا کالا چہرہ اس کو برا لگتا ہے اور جل بھن کر میں بھی چلائی:

''جاتی ہوں، پر جاتے جاتے یہ خوشخبری دیتی جاؤں کہ اگلے مہینے براہمن کی چھوکری کا بیاہ

ہے پر کسی اہیر کے چھو کرے سے نہیں سمجھا۔"

ٹھیک تو یاد نہیں مگر اس وقت میں نے خوش خبری نہیں کھس کھسری اور براہمن نہیں بامن کہا ہوگا۔

جب میری بھاشا اور تھی اب اور ہے اب تو بھاشا کے ساتھ میرا سارا جیون ہی بدل گیا ہے۔

ہاں، تو مجھے اب تک یاد ہے کہ جب وہ چلا گیا تو بڑی دیر تک تو میں وہیں پتھر کی مورتی جیسی کھڑی رہی، پھر بھاگ کر میں تلیا کے کنارے پہنچی، جہاں پانی میں لال اور سفید کنول تیر رہے تھے، جیسے وہ پھول نہ ہوں رنگ، برنگی مرغابیاں ہوں، کنارے اُگی ہری، ہری گھاس پر گر کے، میں نے جھک کر اپنی پرچھائیں دیکھی تو ایسا لگا جیسے پانی میں سے کوئی کالی بھجنگ بھٹنی چھپی ہوئی مجھے گھور رہی ہو۔ بڑی دیر تک میں اس کالی کلوٹی کو دیکھتی رہی اور میرے کانوں میں گوبندا کی آواز گونجتی رہی 'چلی جا یہاں سے — چلی جا یہاں سے۔!'

اور سو میں اپنا گاؤں چھوڑ کر چلی آئی۔ آٹھ دس برس میں سڑک پر پتھر کوٹ کوٹ کر جو کچھ کمایا تھا، وہ چاندی کے گہنوں کی صورت میں میرے ہاتھوں اور گلے میں پڑا تھا، وہی میری پونجی تھی۔ اسے لے کر میں چل کھڑی ہوئی۔ کتنے دنوں کہاں کہاں گھومی، یہ تو اب یاد نہیں پر اتنا ضرور یاد ہے کہ میرے سر پر جیسے کوئی بھوت سوار تھا، جو ہر گھڑی مجھ سے چلاّ چلاّ کر کہتا رہتا تھا: چلی جا یہاں سے...... چلی جا یہاں سے!

اور سو میں چلتی رہی، راستے میں کہیں سڑک پر پتھر کوٹا' کہیں اینٹوں کے بھٹے میں اینٹیں تھاپیں، کہیں گوبر کے اپلے بیچ کر گزارا کیا، کسی اسٹیشن پر کوئلہ ڈھو، ڈھو کر انجن میں ڈالا۔ محنت مزدوری کرنے والوں کا تو کسی نہ کسی طرح گزارا ہو ہی جاتا ہے۔ پر چلتے چلتے میں تھک گئی۔ میرے گہنے سب بک گئے میرے کپڑے پھٹ گئے میرے پیروں میں آبلے پڑ کر پھوٹ کر گھاؤ بن گئے۔ میرے کالے چہرے پر دھول کی بھبھوت مل گئی میرے بالوں میں اتنی مٹی، کوڑا کرکٹ بھر گیا کہ میں اچھی خاصی بھتنی لگنے لگی۔ ویسے بھی کسی سے بات نہیں کرتی تھی اس لیے سب مجھے کوئی پگلی، بھکارن ہی سمجھتے تھے اور ترس کھا کر کام دیدیتے تھے۔ اس سے فائدہ یہ ضرور تھا کہ مردوے مجھے ٹیڑھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، بھتنیوں کو شیطان بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی میں میرا بچاؤ تھا۔

پھر میں نے ایک ٹھیکیدار کے یہاں نوکری کرلی، جو ایک سڑک بنوارہا تھا، کئی سو مزدورنیں، مزدور کام پر لگے ہوئے تھے۔ دن بھر میں دھرمٹ لے کر پتھری کوٹتی شام کو دس آنے مزدوری کے ملتے، وہ لے کر میں مزدوروں کی بستی میں آتی جہاں ہم لوگ اپنی بنائی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ ٹاٹ پرانے ٹین کے ٹکڑوں، لکڑی کے پھٹوں یا کوڑے میں سے اٹھائے ہوئے چیتھڑوں سے ہم لوگوں نے یہ جھونپڑیاں بنائی تھیں۔ یہیں ہم دو پتھروں کا چولہا بنا کر روٹی پکاتے، یہیں ہم سوتے، یہیں مزدورنیں بچے جنتیں اور یہیں ان میں سے اکثر بچے مرجاتے، پر زندگی بھی عجیب ہے بھائی جی، اتنا دکھ، اتنی غریبی ہوتے ہوئے بھی ہماری اس بستی میں بڑی چہل پہل رہتی۔ دن بھر کام کر کے جب ہم شام کو لوٹتے اور اپنے اپنے چولہوں میں آگ جلاتے تو جھونپڑیوں سے ہنسنے، گانے کی آوازیں آتیں۔ ڈھول پیٹتے جاتے اور الاؤ کے گرد ناچ ہوتے۔ یہ ناچ نرتیہ شاستر کے ناچ نہیں تھے۔ بھائی جی، مندروں اور محلوں کے ناچ نہیں تھے۔ یہ ناچ تو ہم مزدوروں کے جیون کی طرح بھونڈے اور بے ڈھنگے تھے، پر ان میں کام کرنے والوں کے جیون کی طاقت تھی، تڑپ تھی، جوش تھا، جوانی کی پکار تھی اور پیار کا رس تھا۔ ناچنے والوں کے شریر یوں ناچتے تھے، جیسے برکھا کی ٹھنڈی ہوا میں مست ہوکر اونچے اونچے پیڑ جھومتے ہیں، جیسے جنگل میں مور ناچتے ہیں، جیسے بن میں ہرن کلیلیں مارتے ہیں، جیسے الاؤ کے شعلے ناچتے ہیں۔

ایک شام کو میں کھاپی کر اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آخر دنیا میں یہ اونچ نیچ کیوں ہے، وہ پیلی، سوکھی رادھا برا ہمن کیوں ہے، گوبندا اہیر کیوں ہے اور میں اچھوت چمارن کیوں ہوں، کیا سچ مچ بھگوان نے ہی جیون کی یہ سیڑھی بنائی ہے جس میں کوئی سب سے نیچے ہیں کوئی ان سے اوپر اور کوئی سب سے اوپر؟ کیا سچ مچ بھگوان کی اچھا ہے کہ گوبندا میرا نہ ہو سکے اور رادھا گوبندا کی نہ ہوسکے اور جیون بھر ہم تینوں دکھی رہیں؟ بھلا بھگوان کو ہمارے دکھ سے کیا لابھ ملے گا؟ بستی کے دوسرے کنارے سے ڈھول بجنے کی آواز آرہی ہے تھی، کل ہولی ہے نا، اسی لیے آج سب مہوے کے گھڑے کے گھڑے چڑھا کر رات بھر ناچیں گائیں گے۔ یہ ہماری بستی بھی کتنی عجیب ہے میں نے سوچا، رہتے تو ہیں سب مزدور چماروں، بھنگیوں کی طرح پر

یہ سب جنم کے اچھوت نہیں ہیں۔ یہاں سب ہی جاتیوں والے تو ہیں، میرے جیسے چمار پاسی تو ہیں ہی، پر بہتیرے اونچی جاتیوں والے بھی ہیں۔ راجپوت، ٹھاکر بھی ہیں، دو چار غریب براہمن بھی ہیں اور گوبندا جیسے اہیر بھی ہیں۔ غریبی نے نہ جانے کہاں سے کہاں اٹھا کر ان سب کو اسی بستی میں لا مارا ہے، دن بھر وہ سب ایک ہی سڑک کوٹتے ہیں اور رات کو ایک ہی جیسی جھونپڑیوں میں پڑے رہتے ہیں اور اس وقت ایک ہی ڈھولک کی تال پر وہ پنڈت اور ٹھاکر اور اہیر اور اچھوت سب مل کر ناچ گا رہے ہیں تو پھر یہ کون سی نئی جاتی ہوئی بھگوان؟

ہوا کے جھونکے کے ساتھ ڈھولک کی تھاپ اڑ کر میرے پاس آئی اور چپکے چپکے مجھے گدگدانے لگی جیسے جیسے تھاپ کی لے تیز ہوتی جارہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے تن بدن میں کسی نے میٹھی میٹھی آگ لگا دی ہو۔ اب تک میں دوسرے مزدوروں سے الگ تھلگ ہی رہتی تھی، کام کر کے آتی اور گوبندا کی یاد کو کلیجے سے لگا کر اپنی جھونپڑی میں پڑ جاتی۔ سب مجھے پگلی سمجھ کر اکیلا چھوڑ دیتے پر آج ڈھولک کی تھاپ نے میرے شریر میں سوئے ہوئے جیون کو جگا دیا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی، جھونپڑے کے پیچھے جا کر نل پر اندھیرے میں نہائی، مہینوں کی دھول مٹی کو رگڑ رگڑ کر دھویا کتنے ہی دیر تک لٹیا بھر بھر کر اپنے جلتے ہوئے بدن پر ڈالتی رہی، ایسا لگا جیسے جلتے توے پر پانی کا چھینٹا دو تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے، جھونپڑی میں جا کر ایک نئی دھوتی نکالی جو میں نے ہاٹ سے خرید کر رکھ چھوڑی تھی مگر اس دن تک ایک بار بھی نہیں باندھی تھی، بالوں میں کنگھی کی، جوڑا باندھا، جھونپڑی سے باہر نکلی تو پاس لگی ہوئی جھاڑیوں میں کاسنی پھولوں کا ایک گچھا نظر آیا میں نے اسے توڑ کر اپنے جوڑے میں لگا لیا اور ڈھولک کی تھاپ کی آواز کے پیچھے پیچھے ایسے چلی جیسے گائے کو رسی سے باندھ کر کوئی گھسیٹے لیے جارہا ہو۔

الاؤ کے شعلے ناچ رہے تھے، مرد دے نشے میں چور ہو کر اپنے کالے کالے بدن تھرکا رہے تھے، پاسی کالیا اپنی بیوی کی اوڑھنی سر پر ڈالے کولہے مٹکا مٹکا کر نرتکی کی نقل کر رہا تھا اور سب ہنس رہے تھے، ٹھٹھے مار رہے تھے اور آگ کی روشنی میں پسینے سے نہائے ہوئے بدن چمک رہے تھے، اب عورتوں کی باری تھی، مردوں نے اپنی اپنی عورتوں کو گھیرے کے بیچ میں ڈھکیل دیا، کالیا کی جورو جمو جو جامن کی طرح چھوٹی سی اور بھری تھی، رامو پہلوان کی نئی بیاہتا گوری جو اب تک شرم

کے مارے گھونگھٹ کاڑھے رہتی تھی، چھوٹے قد کے ماروتی کی لمبی تڑنگی راجو جو چاہتی تو اپنے میاں کو گود میں اٹھا لیتی، چوڑے کولہوں والی للیا جو سنا تھا اپنے میاں کو چھوڑ کر آئی ہے اور جس کو ٹھاکر پہلوان نے اپنے گھر میں ڈال لیا تھا، بوڑھے لکھیا بابا کی بن ماں کی دونوں بیٹیاں لاجو اور کاجو تھیں تو بارہ تیرہ برس کی پر جن پر ابھی سے نوجوانوں کی نگاہیں ڈورے ڈال رہی تھیں اور نہ جانے کب اور کیسے میں بھی وہاں دھکیل دی گئی اور ڈھولک کی تھاپ پر میرے کولہے بھی تھرکنے لگے۔

الاؤ کے شعلے ناچ رہے تھے، ڈھولک کی تال تیز ہوتی جا رہی تھی، مرد دے تالیاں بجا کر اپنی عورتوں کو شہ دے رہے تھے اور میں سدھ بدھ کھو کر ناچ رہی تھی، ہائے رام، گوبندا وہاں ہوتا تو وہ میرے ناچ کا مطلب سمجھتا کیونکہ میرے ناچ میں اس کی اور میری ساری کہانی تھی، کیسے بچپن میں ہم اکٹھے کھیلتے تھے، وہ کرشنا بنتا تھا، میں رادھا کیسے ہم باغوں میں آم توڑتے تھے، اور ایک ہی آم کو باری باری چوستے تھے، اور پھر جب ہم بڑے ہوگئے اور ہمارا ملنا جلنا بند کر دیا گیا اور میری شادی ایک بوڑھے چمار سے کر دی گئی۔ میں ودھوا ہوگئی اور گوبندا اس پیلی سوکھی بامنی کے چکر میں پڑ گیا...... پر اب بھی تیری یاد مجھے ستاتی ہے رے گوبندے...... میرا شریر تھرک تھرک کر پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ ارے ظالما آ اب تو آجا......

تب میں نے دیکھا کہ سب عورتیں گھیرے میں سے نکل گئی ہیں اور میں اکیلی ناچ رہی ہوں اور صرف الاؤ کے شعلے میرے ساتھ ناچ رہے تھے اور ڈھولک والا زور زور سے تھاپ دیئے جا رہا ہے اور سب لوگ منہ پھاڑے مجھے ایسے تک رہے ہیں جیسے میں وہ پگلی چاولی نہیں ہوں جسے وہ جانتے تھے بلکہ کوئی اپسرا ہوں جو آکاش سے دھرتی پر اتر آئی ہے ناچتے ناچتے تھک کر میرا بدن چور ہو چکا تھا، پر یہ تو گوبندے کی محبت کا ناچ تھا اسے میں کیسے بند کر سکتی تھی۔ یہ ناچ تو اس وقت تک مجھے ناچنا ہی پڑے گا جب تک میں زندہ ہوں، جب تک میرے سینے میں دل ناچ رہا ہے، جب تک میری رگوں میں خون ناچ رہا ہے جب تک ڈھولک پر تھاپ پڑے جا رہی ہے.........ڈھولک والے نے ایک زور کی تھاپ دی ہی تھی کہ ڈھول پھٹ گیا اور میرے ناچتے ہوئے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین سرک گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے میں تھک گئی ہوں اور مجھ میں کھڑے رہنے کی بھی طاقت نہیں ہے۔ سب تالیاں بجا، بجا کر میرے ناچ کی واہ

واہ کر رہے تھے اور میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور میرا سر چکرا رہا تھا۔

''ارے واہ چاولی تو تو بڑی رنگیلی نکلی، یہ گن پہلے کہاں چھپا رکھا تھا؟''

آواز پہچانی ہوئی لگتی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ٹھیکیدار سمپورن سنگھ کھڑا مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا اور بڑی ٹیڑھی اور بھوکی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا، جیسے ابھی مجھے کچا چبا کر کھا جائے گا۔

الاؤ کے شعلے دھیمے پڑ چکے تھے، میرے ناچ کے بعد میلہ بچھڑ گیا آدھی رات سے زیادہ ہو چکی تھی، سب اپنے اپنے گھر جا رہے تھے، میں بھی اپنی جھونپڑی کی طرف جا رہی تھی، اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر پیر دھرتی ہوئی، کیونکہ میں سب کے بعد بھرتی ہوئی تھی تو میری جھونپڑیا بھی سب سے دور بستی کے کنارے پر تھی۔ راستے میں ٹھیکیدار کا بنگلہ پڑتا تھا، مجھے یہ دیکھ کر ڈھارس ہوئی کہ بنگلے کی کھڑکیوں میں روشنی ہے میں نے سوچا چلو ٹھیک ہے اس روشنی کے سہارے میں گھر پہنچ جاؤں گی۔ سوکھے پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ ہوئی میں نے مڑ کر دیکھا۔ پیڑوں کے نیچے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے سوچا کوئی بکری یا کتا ہوگا۔ پھر ابھی ایک قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ کسی نے پیچھے سے مجھے اپنی کڑی بانہوں کی پکڑ میں لے لیا اور جب میں نے ڈر کر چیخ ماری تو ایک سگریٹ کی بو والے ہاتھ نے میرا منہ بند کر دیا۔ دم گھٹتے ہوئے بھی میں نے سوچا، کمبخت ٹھیکیدار ہی ہے۔ اس کے سوا سگریٹ کون پیتا ہے، اس بستی میں؟

نہ جانے کس بلا کی طاقت تھی اس شیطان میں مجھے اس بیدردی سے گھسیٹتا ہوا اپنے بنگلے میں لے گیا جیسے شیر شکار کو دبوچ کر کچھار میں لے جاتا ہے اور اندر جا کر مجھے اتنے زور کا دھکا دیا کہ میں منہ کے بل صوفے پر گری۔ میرا سر صوفے کی لکڑی کے ہتے سے ٹکرایا اور میری ناک سے خون نکلنے لگا۔

''شیطان، ٹھیکیدار بنا پھرتا ہے۔ شرم نہیں آتی تجھے غریب مجورنوں (غریب مزدورنیوں) پر ہاتھ اٹھا دے ہے، بھگوان کرے تیری آنکھیں پھوٹ جائیں، تیرے ہاتھ ٹوٹ جاویں۔'

ان دنوں میں گالم گلوج میں بھی کسی سے کم نہ تھی، جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

''کیوں رے بے ایمان، تیرے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟''

وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ہاں، بہنیں سب ہیں میری جان چاولی پر جورو نہیں ہے۔''

میں نے جل کر کہا

''تو کیا ٹھاکر ہو کر ایک چمارن کو بیاہے گا؟''

''اری شادی بیاہ کی کیا بات کرتی ہے، ہم تو ہر رات کو ایک نیا بیاہ رچاتے ہیں۔ یہ دیکھ دس روپیہ دوں گا نقد اور کل سے تجھے کسی ہلکے کام پر لگا دوں گا۔ سچ کہتا ہوں عیش کرے گی۔''

میں نے جیسے یہ بیوپار کی بات سنی ہی نہیں۔

''چل اب مذاق ہو چکا، دروازہ کھول میں جاتی ہوں۔''

''یہ مذاق نہیں ہے میری جان۔''

اور یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھا اور اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ نشے میں دھت ہے اور جب اس کا منہ میرے پاس آیا تو اس میں سے شراب کا ایسا بھپکا آیا کہ مجھے الٹیاں آنے لگیں۔ پھر وہ بولا۔

''مجھ میں کیا برائی ہے ری جو اتنا ڈھونگ رچاتی ہے۔ سچ بولی عمر بھر میں ایسا سجیلا جوان دیکھا ہے کبھی؟''

''ارے جا بڑا آیا سجیلا کہیں کا۔''

میں مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی پکڑ سے نکل کے چلائی۔''

''تیرے جیسے تو سینکڑوں مرد نے واری کر کے پھینک دوں اپنے گوبندے کے اوپر سے''

'گوبندا!'

وہ چلایا جیسے اس کے گھمنڈ کے سینے میں تیر لگا ہو۔

''کہاں ہے وہ تیرا پریمی؟ جان سے مار ڈالوں گا۔''

نہ جانے کیوں اس سے میں نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ایک برس سے اپنے سینے میں دبائے ہوئے تھی۔

''وہ میرا پریمی نہیں ہے رے، میں اس سے پریم کرتی ہوں، آج سے نہیں بچپن سے جب

ہم اکٹھے کھیلتے تھے، وہ تو بامن کی پیلی سوکھی چھوکری رادھا سے پریم کرتا ہے اور وہ چھوکری بھی اسے چاہتی ہے پر اس میں اتنی شکتی نہیں ہے کہ وہ جات پات کے بندھنوں کو توڑ کر گوبندے سے بیاہ کرے۔ اس کی تو اب تک کسی بڈھے بامن سے شادی بھی ہو چکی ہوگی سو میرا گوبندا بھی دکھی ہے اور میں بھی دکھی ہوں۔"

وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا اور یہ سب سن رہا تھا، پھر بولا تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔

"تو آجا۔ جاولی تیرے دکھ کا میں علاج کروں۔"

اور یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھنے لگا۔ میں پیچھے ہٹتی گئی اور وہ آگے بڑھتا گیا، میرا سیدھا ہاتھ ایک میز سے ٹکرایا جس پر ایک پتھر کی ننگی عورت کی مورت رکھی ہوئی تھی، میں نے اسے اٹھا لیا مگر ٹھیکیدار نے نہیں دیکھا اس لیے کہ اس کی پاپ بھری نگاہیں تو میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، وہ بڑھتا گیا میں الٹے پیروں ہٹتی گئی اب میرے پیچھے دیوار تھی اور میرے سامنے سمپورن سنگھ کا پاپی چہرہ تھا۔ اس کی موٹی موٹی لمبی نکیلی مونچھیں تھیں جو ایک بھیانک چمگادڑ کی طرح میرا خون پینے میری طرف آ رہی تھیں اور اس کی بھیانک موٹی موٹی آنکھیں تھیں جن میں نشے کے لال لال ڈورے تھے اور واسنا تھی اور پاپ تھا...... اور میرے ہاتھ میں وہ سنگ مرمر کا بت تھا، میری جیسی کسی غریب عورت کا، جس کی لاج کسی ایسے ہی پاپی نے لوٹی ہوگی۔ میرا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا میں اٹھا ایک دھماکا ہوا اور میں نے دیکھا کہ فرش پر اس بیچاری عورت کا بت ٹکڑے ٹکڑے ہوا پڑا ہے، سر کہیں، دھڑ کہیں ٹانگیں کہیں اور ان کے پاس ہی سمپورن سنگھ بے جان پڑا ہے اور اس کے سر سے خون کی ایک لکیر نکل کر پیلے قالین میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

خون! میں نے اس کا خون کر دیا ہے! جیسے ہی یہ بھیانک خیال مجھے آیا میں وہاں سے بھاگی، گرتی پڑتی، پھسلتی، سنبھلتی اپنی جھونپڑی تک پہنچی تو دیکھا میری پڑوسن کملا اپنی جھونپڑی کے باہر اپنے بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"کون؟ جاولی۔"

میں نے کہا۔

"ہاں کملا دیدی۔ تم سوئیں نہیں؟"

''گرمی اتنی ہے اندر کہ کیا بتاؤں اس کا باپ تو دارو پی کر سو گیا ہے پر بچہ گرمی کے مارے ہلکان ہوا جا رہا تھا، سواسے باہر ہوا میں لے کر آئی ہوں پر تو بتا کہاں رہی؟ کہیں ایسا ویسا دھندا تو نہیں چالو کر دیا، وہ نگوڑا ٹھیکیدار تجھے بری طرح گھور رہا تھا آج۔''

''میں نے...... میں نے اس کا خون کر دیا ہے کملا دیدی۔''

وہ بیچاری یہ سن کر اتنی بھونچکا ہوگئی کہ اپنے بچے کو تھپکنا بھی بھول گئی۔ اور وہ پھر سوتے سوتے کلبلانے لگا، پر مجھے تو اپنی ہی فکر پڑی ہوئی تھی۔

''اب کیا ہوگا کملا دیدی؟ پولس مجھے پکڑ کر لے جائے گی نا۔ وہ مجھے پھانسی دیں گے نا؟''

اور میرا ہاتھ آپ سے آپ گردن تک پہنچ گیا جیسے ابھی سے پھانسی کا پھندا میرا گلا گھونٹ رہا ہو اور موت کا خیال آتے ہی مجھے دکھ ہوا کہ ہائے میں تو مر جاؤں گی اور اس ظالم گوبندے کو خبر بھی نہ ہوگی اور یہ سوچتے ہی میں گڑگڑائی۔

''مجھے بچالو کملا دیدی، میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں۔''

اور وہ بولی۔

'شش۔ شش۔ دھیرے بول اور اتنی نہ گھبرا، تو نے جان بوجھ کر خون تھوڑے کیا ہے۔ سویرے ہی نرمل بابو شہر سے آنے والے ہیں۔ ان سے جا کر ملیں گے، وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔

''نرمل بابو! وہ کون ہیں دیدی؟''

''بڑے بھلے آدمی ہیں، مجوروں (مزدوروں) کی بہت سیوا کرتے ہیں۔''

''پر کملا دیوی، یہ نرمل بابو تو مجھے جانتے بھی نہیں وہ میری مدد کیوں کرنے لگے؟''

'نرمل بابو ہر مجور (مزدور) کو جانتے ہیں اور ہر مجور ان کو جانے ہے۔''

اور جب اس نے یہ کہا تو وہ آکاش کی طرف تک رہی تھی۔ جیسے ادھر ہی سے نرمل بابو آنے والے ہوں اور اس کی آواز میں اتنا بھروسہ تھا کہ میرے دھڑکتے ہوئے دل کو بھی چین آ گیا۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ ہم دونوں بستی کے باہر پہنچ گئے، جہاں پہاڑی کی ڈھلان شروع ہوتی ہے۔ سورج نکلتے ہی پورب کی طرف سارا آکاش لال ہوگیا اور میں سمپورن سنگھ کے سر سے نکلے ہوئے خون کا خیال کر کے کانپ اٹھی۔ اسی دم ہم نے دیکھا کہ دور پہاڑی کے پیچھے سے کسی

آنے والا کا سر اُبھر رہا ہے۔ پہلے سر پھر، دھڑ پھر ٹانگیں اب وہ ہماری طرف چلا آرہا تھا۔ سورج اس کے پیچھے تھا، اس لیے وہ چلتا پھرتا کالا پتلا دکھائی دیتا تھا۔ کرتا، پاجامہ، چپل پہنے ہوئے تھا اور کندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا، جو اس کے ساتھ، ساتھ ایسے جھول رہا تھا جیسے رات کو سمپورن سنگھ کے بنگلے میں دیوار والی بڑی گھڑی کا لٹکن جھول رہا تھا، میں نے کہا۔

''کملا دیدی، مجھے تمھارے نرمل بھیا سے ڈر لگتا ہے۔''

اور راستے میں وہ ہمارے پاس آ ہی گیا اور میں نے دیکھا کہ وہ تو بالکل نوجوان ہے اور بچوں جیسا نرم نرم مکھڑا ہے اس کا اور اس کی آنکھوں میں اتنی دَیا ہے کہ میں نے سوچا شاید وہ میرا اَپرادھ بھی شما کر دے۔ وہ شہر کا بابو تھا پر اس نے ہاتھ اٹھا کر ہم مجورنیوں کو نمستے کیا، پھر بولا۔

''کیوں کملا دیدی کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟''

اور تب کملا نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ خون کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں ایک گمبھیرتا سی آ گئی۔ کچھ دیر سوچ کر وہ بولا۔

''اچھا جو ہوا سو ہوا۔ کورٹ کچہری کا چکر لمبا ہوگا، چادلی پر تم زردوش ہو تو ضرور بچ جاؤ گی۔ آؤ اب میرے ساتھ آؤ میں بنگلے میں جا کر دیکھتا ہوں۔ پھر ڈاکٹر اور پولس دونوں کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجنا پڑے گا۔''

وہ بہت دیر تک بنگلے میں رہا اور ہم دونوں باہر کھڑے اس کے نکلنے کی باٹ دیکھتی رہیں۔ میں سوچ رہی تھی یہ نرمل بابو بہت پڑھا لکھا وِدوان ہوگا تب ہی تو کسی سے ڈرتا نہیں، سمپورن سنگھ کے بھوت سے بھی نہیں ڈرتا — دروازہ کھلنے کی آواز آئی پر وہ باہر نہیں آیا وہیں سے بولا۔

''اندر آؤ۔''

ڈرتی کانپتی میں اور کملا اندر پہنچی تو میں نے دیکھا کہ گول کمرے کی وہی حالت ہے جو رات کو تھی، کرسیاں الٹی پڑی تھیں، فرش پر ننگی عورت کی مورتی کے ٹکڑے وہیں پڑے تھے، قالین پر خون کا دھبہ وہیں تھا مگر اب جم کر لال سے کالا پڑ گیا تھا۔ مگر سمپورن سنگھ کی لاش نہیں تھی، میں نے سوچا نرمل بابو نے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا ہوگا۔

''ادھر آؤ اس کمرے میں۔''

اس نے اندر والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ لاش ضرور وہاں رکھی ہو گی میں ڈری۔ اگر سمپورن سنگھ کے بھوت نے میرا گلا دبا لیا تو؟ ۔۔۔ میں جھجک رہی تھی کہ اس نے کسی قدر ڈانٹ کر اونچی آواز میں کہا۔

"چلو ادھر آؤ۔"

میں نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا تو اچنبھے سے بھونچکا رہ گئی۔ کملا دیدی بولی۔

"اری ٹھیکیدار تو جندہ (زندہ) ہے۔"

سمپورن سنگھ تکیوں کے سہارے پلنگ پر پڑا تھا، سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں سے خون جھلک رہا تھا۔ وہ سچ مچ زندہ تھا، مگر اس کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور اس کی مونچھیں جو ہمیشہ کروفر سے چڑھی رہتی تھیں، اس دم مرے ہوئے چوہوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔

"کیوں سمپورن سنگھ؟"

نرمل بابو نے اس کے پاس جا کر زور سے کہا۔

"کیا ہوا، یہ چوٹ کیسے آئی تمھیں؟"

کچھ دیر تو ٹھیکیدار چپ چاپ لیٹا مجھے مری ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا پھر بولا:

"کچھ نہیں ایکسیڈنٹ ہو گیا رات اندھیرے میں گر پڑا تھا۔"

"چچ، چچ۔"

نرمل بابو نے بڑی گمبھیرتا سے پچکارا۔

"گر پڑے؟ اور وہ بھی کتنے گندے گڑھے میں اچھا تو اب تم آرام کرو، میں ابھی ڈاکٹر کو بلوا بھیجتا ہوں۔"

ایک مری ہوئی آواز میں ٹھیکیدار بولا:

"تھینک یو نرمل بابو۔"

جب ہم باہر نکلے تو میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا:

'دھنیہ ہو بھگوان، تو نے میری لاج رکھ لی۔'

اور کملا بولی:

'چلو یہ ٹنٹا تو نپٹ گیا۔'

پھر نرمل بابو نے سر ہلا کر کہا:

''نہیں کملا دیدی، ابھی یہ جھگڑا ختم نہیں ہوا، شروع ہوا ہے۔ اگر ٹھیکیدار کی کرتوتوں کا بھانڈا نہ پھوڑا گیا تو آج چاؤلی کی باری تھی، کل کسی اور لڑکی پر حملہ کرے گا۔''

'پھر؟'

میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''تمھیں سب مزدوروں کے سامنے بیان دینا ہوگا۔ سمپورن سنگھ کی آوارگی اور بدمعاشی کا پول کھولنا ہوگا تاکہ پھر اس کی یہ ہمت نہ ہو کہ کسی مزدور عورت کو چھیڑ سکے۔''

'نرمل بابو، کیا تم چاہتے ہو میں بھری پنچایت میں اپنی بے عزّتی کی کہانی خود اپنی زبان سے سناؤں؟''

''ہاں! ہاں!! چاؤلی تمھیں یہی کرنا ہوگا۔''

کتنا بے رحم کتنا بے شرم ہے یہ میں نے سوچا۔ اس کو ذرا بھی پروا نہیں ہے کہ ایک عورت اپنی زبان سے ایسی باتیں کیسے بھری سبھا میں کہہ سکتی ہے میں نے کملا کا ہاتھ پکڑا اور نرمل بابو سے کہا:

''نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوگا اس بات کو اب بھول ہی جاؤ۔'' یہ کہا اور میں اور کملا وہاں سے چلے آئے۔

ہولی کا دن تھا چھٹی تھی، سب رنگ کھیلتے رہے، سوانگ بھرتے رہے گاتے، ناچتے رہے پر میں دن بھر اپنی جھونپڑی ہی میں پڑی رہی، پچھلی رات کے ہنگامے کے بعد میرا من ہی نہیں چاہتا تھا کسی سے ملنے بات کرنے کو۔ کل میں نے اپنے گوبندے کی یاد سے بے وفائی کی، اسے بھلا کر سنگھار کر کے گانے، ناچنے پہنچ گئی شاید اس کی مجھے یہ سزا ملی ہے، لیٹی لیٹی یہی سوچ رہی تھی کہ کسی کے پیروں کی آواز آئی۔ پھر ٹین کے دروازے پر کسی نے کھٹ کھٹ کی، میں نے سوچا شاید کملا آئی ہوگی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا نرمل بابو ہیں کرتے، پاجامے پر ہولی کا رنگ پڑا ہوا تھا۔

''نرمل بابو آپ؟''

''ہاں چاؤلی، دو منٹ تم سے بات کرنا چاہتا ہوں کہو تو بیٹھ جاؤں؟''

''ہاں، ہاں پر میرے یہاں تو آپ کو بٹھانے کے لیے کچھ بھی.....'' مگر وہ لیپی ہوئی زمین پر لکڑی کے کھمبے سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ ہی چکے تھے۔ میں نے سوچا گھر میں پہلا مہمان آیا ہے، کچھ تو آؤ بھگت کرنا چاہیے۔ سو میں نے پوچھا۔

''آپ، آپ پانی پئیں گے؟''

وہ بولے۔

''ضرور بڑی دور سے گرمی میں چلا آ رہا ہوں۔''

میں زنگ لگے ہوئے پرانے سگریٹ کے گول ٹین میں پانی لے کر آئی تو مجھے ہچکچاہٹ ہوئی کہ نہ جانے وہ اس میں پانی پینا پسند بھی کریں گے یا نہیں۔ مگر نرمل بابو نے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں، ٹین کو منہ سے لگایا اور غٹ غٹ کر کے پانی پی گئے۔

''بڑا ٹھنڈا پانی ہے، ایک گلاس اور دو چاولی۔''

جب دوسرا گلاس پانی پی چکے تو کچھ دیر تو ہم چپ چاپ بیٹھے رہے، پھر وہ بولے۔

''چاولی تم یہاں نئی آئی ہو اس لیے مجھے نہیں جانتیں میں بھی بستی میں صرف تم کو ہی نہیں جانتا، قصور میرا ہی ہے، مجھے تم سے پہلے ہی آ کر ملنا چاہیے تھا، میں خواہ مخواہ شہر میں اتنا وقت ضائع کرتا ہوں، ہاں تو کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔''

'کیا بتاؤں نرمل بابو، کچھ بتانے کو ہے ہی نہیں۔'

'کہو شادی ہوئی ہے؟'

'ہوئی تھی بچپن میں۔'

اور یہ کہہ کر میں چپ ہو گئی۔

'پھر؟'

میں پھر بھی خاموش رہی۔

'پھر بوڑھا پتی سورگباش ہو گیا اور تم دنیا میں اکیلی رہ گئیں؟'

'آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ مگر اس نے اس سوال کا جواب نہ دیا۔

'دوسری شادی کیوں نہیں کی؟'

میں شرما کر چپ رہی، اس نے پھر سوال دہرایا۔

'بتاؤ نا؟'

میں نے کہا۔

'وہ اونچی جات کا تھا۔'

'تھا؟ کیا ہوا اسے اب کہاں ہے وہ؟'

''معلوم نہیں، میں تو کب کی گاؤں چھوڑ کر چلی آئی۔''

''ہوں، تو یہ دکھ ہے تمھیں، تبھی بستی والے کہتے ہیں تم سب سے الگ تھلگ، چپ چاپ رہتی ہو۔''

تھوڑی دیر تک پھر ہم چپ چاپ بیٹھے رہے، دور آموں کے باغ میں کوئل کوک رہی تھی اور اس کی کوک کے ساتھ دوسری طرف سے بستی والوں کے گانے بجانے کی آواز آرہی تھی، میں نے سوچا ہولی کی رنگ رلیوں میں کوئل بیچاری کی کوک کون سنتا ہے۔ ہاں ایک نرمل بابو ضرور ہیں بیچارے..........وہ بولے۔

''چاولی جانتی ہو، بہت جلد وہ زمانہ آرہا ہے جب یہ جات، پات کی اونچ نیچ نہیں رہے گی، تب پریم کہانیوں کا انت اتنا دکھ بھرا نہیں ہوگا۔''

''کب آئے گا وہ زمانہ نرمل بابو؟'

پہلے تو وہ چپ رہے پھر جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا ایک بیڑی منہ میں رکھی، دیاسلائی سلگا کر بولے۔

''آئے گا چاولی، مگر اس کے لیے بہت سے لوگوں کو قربانی دینی پڑے گی۔''

'قربانی؟'

'ہاں، جانتی ہو ایک مہان پرش تھا دور کے ایک دیس میں، وہ اپنی قوم کی مکتی کے لیے سولی پر چڑھ گیا اور اف نہ کی، ایک اور مہان پرش تھا اپنے دیس میں، اس نے اپنے لوگوں کی خاطر سینے میں گولی کھائی اور ہائے رام کہہ کر مر گیا۔

اب تک میں نہیں سمجھ پائی تھی کہ ان بڑی بڑی باتوں کا مجھ اچھوت چمارن سے کیا سمبندھ ہے، پھر نرمل بابو بولے۔

''جانتی ہو، جب دنیا کے سارے پانی میں زہر ملا دیا گیا تو بھگوان شیو نے کیا کیا؟...... منش جاتی کی سلامتی کے لیے سارا زہر خود پی گئے۔''

اب مجھے کچھ دھندلا، دھندلا سا دکھائی دینے لگا کہ نرمل بابو کی بات چیت کا رخ کدھر ہے۔

''تو آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں نرمل بابو؟''

''یہی کہ تم بھی اپنی بستی والوں کی خاطر زہر کا پیالہ پی لو چاولی، میں تمھیں کبھی اس کے لیے مجبور نہ کرتا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ٹھیکیدار سمپورن سنگھ تم لوگوں کو دس آنے روز مزدوری دیتا ہے اور دس دس گیارہ گھنٹے کام لیتا ہے اور سب چپ چاپ یہ انیائے سہتے ہیں۔ تم کو ان گندی سڑی جھونپڑی میں رہنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اس پر بھی سب صبر و شکر کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے ادھیکاروں کے لیے لڑنے کے لیے اسٹرائیک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک ابلا کے لاج کے سوال پر بستی والے چپ نہ رہ سکیں گے، تمھاری بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے سب ٹھیکیدار کا مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوں گے...... کیوں تیار ہو؟''

میں نے سر ہلا کر ہاں کہا اور اسی رات کو جب سب بستی والے ہولی منانے اکٹھے تھے میں نے بھری پنچایت میں وہ زہر کا پیالہ پی لیا۔

ہوسکتا ہے بھائی جی آپ میری اس اوٹ پٹانگ کہانی سے اکتا گئے ہوں۔ شاید آپ سوال کریں کہ تو تو چلی تھی اس چوتھی سڑک کی کہانی سنانے جس سے تیرے اور تیرے گوبندا کے جیون کا سمبندھ ہے اور تو لگی ہمیں اپنے نرمل بابو کی زبانی مزدوروں کے ادھیکاروں کا اپدیش دینے اس کے جواب میں، میں بس اتنا کہوں گی کہ میری کہانی کا رخ اس چوراہے کی طرف ہے جہاں آپ کھڑے ہیں اور بہت جلد آپ دیکھیں گے کہ میں اور میری کہانی اور میری سڑک سب اس چوراہے کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں پنڈت کرپا رام کا سوانگ رچائے گوبندا اپنے رام بھروسے ہوٹل میں بیٹھا انتظار کر رہا ہے حالانکہ ابھی تک خود اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ جس کا انتظار کر رہا ہے وہ وہی کالی کلوٹی بھنگی چاولی ہے جس کے پیار کو دھتکار کر وہ گاؤں سے چلا آیا تھا۔

ہاں تو جن مزدوروں نے کبھی دس آنے روز مزدوری پر چوں نہیں کی تھی اور جوان گندی جھونپڑیوں میں صبر شکر سے رہتے تھے، انھوں نے اب ایک چمارن کی عزت کی خاطر اسٹرائیک تک کر دیا۔ اگلے دن کوئی کام پر نہیں گیا، سمپورن سنگھ نے اپنے کئی گرگے بھیجے، دو چار لوگوں کو روپے اور شراب کا لالچ دے کر توڑنا چاہا مگر مزدوروں کا ایکا نہ ٹوٹا، دوسرے دن بھی کوئی کام پر نہیں گیا۔ تیسرے دن بھی، چوتھے، پانچویں، چھٹے، ساتویں، آٹھویں دن بھی نہیں، سب کی جمع جوڑ جتنی بھی تھی سب ختم ہوگئی۔ فاقے ہونے لگے، اب لوگ ڈھیلے پڑنے لگے اور میری طرف غصے سے گھور کر دیکھنے لگے کیونکہ میں ہی تو فساد کی جڑ تھی، میری ہی وجہ سے تو وہ بھوکوں مر رہے تھے اور پھر ایک دن نرمل بابو شہر سے ایک لاری میں بیٹھ کر آئے اور ہم نے دیکھا کہ لاری دال، چاول، نمک کی بوریوں سے بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سب سامان ہماری مدد کے لیے سڑک کامگار یونین کی طرف سے آیا ہے اور سب نے نعرے لگائے۔

''سڑک کامگار یونین — زندہ باد۔''

بارہویں دن سمپورن سنگھ نے اپنا ایک آدمی نرمل بابو کے پاس بھیجا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ کن مانگوں کو ماننے سے کام شروع ہو سکتا ہے، نرمل بابو نے کہلایا کہ مزدوروں کی بھری پنچایت میں آؤ اور چادلی سے معافی مانگو۔ سمپورن سنگھ نے کہلایا مجھے منظور ہے اور اس رات کو جب سب الاؤ کے گرد اکٹھے ہوئے تو ٹھیکیدار وہاں آیا اور میرے سامنے نظریں جھکا کر بولا۔

''آئی۔ ایم۔ سوری چادلی۔

اس پر سب چلّائے۔

''یہ کیا انگلش میں گٹ پٹ کرتے ہو۔ ہندی میں بولو۔''

تب اس نے کہا:

'مجھے شما کرو چادلی۔'

پھر کوئی چلّایا۔

''چادلی نہیں، چادلی دیوی کہو۔''

وہ بولا:

'مجھ شما کرو چاولی دیوی، میں اس دن نشے میں تھا۔'

لکھیا بابا بولے۔

''ارے ٹھیکیدار کان پکڑو کہ اب ایسی حرکت نہیں کروں گا۔''

سمپورن سنگھ نے کان چھو کر کہا:

''کان پکڑتا ہوں بابا۔ اب شما کرو۔'

'جاؤ معاف کیا۔'

کئی لوگوں نے چلّا کر کہا۔ اب سمپورن سنگھ پھر تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''ہاں تو کل سے کام شروع ہوگا نا؟''

'نہیں'

نرمل بابا نے زور دے کر کہا۔

''کیوں اور بھی کوئی شرط ہے کیا؟''

''ضرور ہے، کان کھول کر سن لو ہمارے دیش کا قانون کہتا ہے آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا، سو تمہارے ٹھیکے میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ آٹھ گھنٹے سے زیادہ کوئی کام نہیں کرے گا۔ دوسرے مزدوری ایک روپیہ روز ہوگی، تیسرے تم ان جھونپڑیوں کی مرمت کرواؤ گے، زمین پکی بنواؤ گے پانی اور روشنی کا انتظام کرو گے۔ بولو منظور ہے؟''

ٹھیکیدار نے مری ہوئی آواز میں کہا:

''منظور ہے، مگر بھگوان کے لیے کل سے کام شروع کرو ورنہ مجھ سے ٹھیکہ چھن جائے گا۔''

اور پھر پانچ سو آوازوں نے مل کر نعرے لگائے۔

'سڑک کا مگار یونین زندہ باد۔ نرمل بابو زندہ باد۔'

مگر نرمل بابو نے کہا:

'نہیں کہو چاولی دیوی۔ زندہ باد۔'

اس رات کو سب جھونپڑیوں میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور میں سامان باندھ رہی تھی کہ نرمل بابو آ گئے۔

'چادلی میں جانے سے پہلے تمھارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں.....مگر یہ کیا تم جا رہی ہو؟'

'جی اب میرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے، میں سمپورن سنگھ کے ٹھیکے میں کام نہیں کروں گی؟'

'پھر کہاں جاؤ گی؟'

'جہاں بھگوان لے جائے سڑکیں تو بہت سی بن رہی ہیں۔ کسی دوسرے ٹھیکے میں کام مل جائے گا۔'

'تو مرے ساتھ چلو چادلی۔'

'کہاں؟'

'ایک سڑک بنانے'

'ٹھیکیدار کون ہے؟'

''ٹھیکیدار ہم سب ہیں، یہ ایک نئے ڈھنگ کی سڑک ہوگی چادلی، کوئی ٹھیکیدار نہیں ہوگا۔ سب مل کر کام کریں گے، مزدوروں کی اپنی کوآپریٹیو کو سرکار نے یہ سڑک بنانے کا ٹھیکہ دیا ہے۔ کیوں چلو گی؟''

'ضرور چلوں گی۔'

'تو آؤ لاری تیار کھڑی ہے۔'

یہ وہی ٹرک تھی جو ہم لوگوں کے لیے کھانے کا سامان لائی تھی، نرمل بابو نے آواز دی۔

'کیوں دلاور خاں سب تیار ہے؟'

جواب ملا:

بس آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔

ڈرائیور پٹھان پگڑی باندھے ہوئے تھا، مجھے دیکھ کر بولا:

''کیوں، یہ بھی جائیں گی؟''

اور اس کے بولنے سے ایسا لگا کہ وہ میرے ساتھ جانے سے خوش نہیں ہے۔ نرمل بابو نے کہا۔

''ہاں بھئی یہ چادلی ہے، ہماری نئی سڑک پر کام کرنے جا رہی ہے۔''

دلاور خاں نے کہا۔

''مگر جگہ کہاں ہے؟''

نرمل بابو نے اس کی بات ان سنی کر کے کہا۔

'چلو چاول بیٹھو تین آدمی تو اگلی سیٹ پر آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔' اور جب ٹرک چل پڑی تو مجھ سے کہا۔

تم دلاور خاں کی باتوں کا برا نہ ماننا، یہ اپنا پٹھان بڑا اچھا ڈرائیور ہے اور بڑا اچھا کامریڈ ہے، مگر نہ جانے کیوں عورتوں سے خار کھاتا ہے، ایسا لگتا ہے کسی نے خاں صاحب کو دغا دی ہے۔

میں بھی تو اس سے بدلہ لینے کی تاک میں تھی، سو میں نے کہا۔

''یا یہ ہو سکتا ہے خاں صاحب نے خود کسی لڑکی کو دغا دی ہو۔''

''مہربانی کر کے آپ لوگ چپ رہئے اور مجھے ڈرائیو کرنے دیجیے۔''

وہ چڑھ کر بولا، نرمل بابو نے مجھے مسکرا کر اشارہ کیا اس کی باتوں کا برا نہ مانوں کئی منٹ تک اندھیری سڑک پر ٹرک چلتی رہی اور ہم سب چپ سادھے بیٹھے رہے۔ نرمل بابو کوئی بنگالی گیت گنگنانے لگے۔ پھر دلاور خود ہی بولا۔

'نرمل بابو'

'کہو پٹھان'

'یہ اپنی نئی سڑک جو بن رہی ہے، یہ کہاں تک جائے گی؟'

یہ جو مہا پربت کی ترائی میں جنگل کاٹ کر کھیتی کے لیے زمین تیار ہو رہی ہے نا یہاں سے لے کر اس چوراہے تک جائے گی۔

'کون سے چوراہے تک؟'

''ارے بھائی وہی چوراہا جہاں رام کھنڈ، سلطان آباد اور پربت پور والی تینوں سڑکیں ملتی ہیں وہیں سے یہ جنگل کا راستہ شروع ہوتا ہے، جس کو اب ہم سڑک بنا رہے ہیں۔''

میں نے ایک چیخ ماری کیونکہ میں نے دیکھا کہ ٹرک سڑک چھوڑ کر برابر کے پیڑوں کی طرف جا رہی ہے، وہ تو دلاور خاں نے سنبھال لیا ورنہ ٹکر ہو جاتی۔

''کیوں دلاور خاں کیا نیند آ رہی ہے کہو تو میں ڈرائیو کروں۔''

''نہیں نرل بابو میں اس چوراہے کے بارے میں کچھ سوچنے لگا تھا۔''

''کیا تم جانتے ہو اس جگہ کو؟''

''جی ہاں، اچھی طرح۔ وہاں میرا کچھ کھو گیا تھا۔''

نرل بابو نے ہنس کر کہا۔''تو فکر نہ کرو، جب ہماری سڑک جنگل میں سے ہوتی ہوئی اس چوراہے پر پہنچے گی تو جو کھو گیا تھا وہ وہیں مل جائے گا۔''

دلاور خاں بولا''ایسا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے نرل بابو۔''

اور پھر اس نے چپ سادھ لی، میں اس عورت بیزار ڈرائیور کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گئی۔

جنگل میں اونچے اونچے پیڑوں کو کاٹ کر ایک جگہ صاف کی گئی تھی۔ وہاں ہمارا کیمپ تھا۔ پہلے ہی دن نرل بابو نے مجھ سے کہا۔

''چاولی اس سڑک پر کام کرنے سے پہلے تمھیں پڑھنا لکھنا سیکھنا ہوگا۔''

میں نے کہا''بڑھے طوطوں نے بھی کچھ سیکھا ہے، نرل بابو!''

مگر جب وہ مجھے لے کر اسکول میں پہنچے جو ایک پیڑ کے نیچے لگا ہوا تھا تو میں نے دیکھا کہ پڑھنے والے سب ہی بڑی عمر کے مرد عورتیں ہیں اور پڑھانے والی ایک چھوٹی سی لڑکی ہے جو مشکل سے تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ شام کو نرل بابو نے پوچھا۔

''چاولی آج کیا سیکھا، سبق سناؤ۔''

''میں نے کہا۔

''اَ۔ آ۔ ا سے انار، آ سے آدمی، ب، بابا سے بکری، با سے بادل۔ د۔ دا، دا سے دلاور.....''

اور یہ کہہ کر اپنے پٹھان ڈرائیور کی باتیں یاد کر کے میں ہنس پڑی۔ نرل بابو بولے۔

'' چاولی ہمارے دلاور خاں کو تم ایسا ویسا آدمی مت سمجھنا اپنے کام میں بڑا ہوشیار ہے، ٹرک ٹریکٹر، بلڈوزر سب ہی، اچھی طرح چلاتا ہے۔ وہ دیکھو بلڈوزر سے کتنا اونچا پیڑ گرا رہا ہے۔'

''ٹریکٹر کے پیچھے ایک رسّی بندھی تھی۔ اس رسّی کو پیڑ میں باندھا گیا تھا اور اب دلاور خاں ٹریکٹر کے زور سے پیڑ کو کھینچ رہا تھا، کہ اتنے میں کسی نے چلّا کر کہا۔

'بچو، بچو۔'

نرل بابو نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف گھسیٹ لیا اور اسی وقت دلا ور خاں والا پیڑ عین اسی جگہ آرہا جہاں ایک پل ہوئے ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے، میرا تو ڈر اور گھبراہٹ کے مارے خون خشک ہو گیا۔ جب جان میں جان آئی تو میں نے دیکھا کہ میرا ہاتھ اب تک نرل بابو کے ہاتھ میں ہے اور وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں، میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ کر پلو سر پر ڈالا۔

''ارے تم تو کتنا گھبرا گئیں، یہ سب تو یہاں روز ہی ہوتا رہتا ہے ــــ اچھا چلو اپنا سبق سناؤ ابھی تو دسے دلاور تک پہنچی تھیں۔''

'دسے داوا۔ کھ، کھا، کھ سے کھلونا۔ کھ سے کھانا۔'

'کیوں بھوک لگی ہے؟'

وہ آج برابر مجھے چھیڑے جا رہے تھے۔

'ہاں تو چلو آگے'

میں نے پھر سبق دہرایا۔

'گ۔ گا۔ گ سے.....'

اور نہ جانے کیسے میرے منہ سے دھیرے سے نکلا۔

'گ سے گوبندا۔'

اور پھر میں جلدی سے بولی۔

'ہائے رام میں کیا کہہ گئی ان کا نام لینا تو پاپ ہے؟'

'نرل بابو بولے اچھا تو اس اہیر کے بچے کا نام گوبندا ہے۔'

اور میں شرما کر وہاں سے ایسی بھاگی کہ اپنے عورتوں کے کیمپ میں پہنچ کر ہی دم لیا اور دھڑام سے اپنی کھاٹ پر گر پڑی۔

ہمارے کیمپ میں عورتیں زیادہ نہیں تھیں کیونکہ جنگل کو کاٹ کر سڑک بنائی جا رہی تھی اور کام خطرناک تھا۔ بس سولہ یا سترہ تھیں۔ میرے سوا سب کام کرنے والوں کی بیویاں تھیں۔ میرے

تنبو میں، ہم چار تھیں ایک تو درگا دیدی جو کالی تھی اور موٹی تھی اور جس کے کوئی اولاد نہیں تھی، اور جو ہم میں سے ہر ایک سے لاڈ کرتی تھی، جیسے ہم بچے ہوں۔ ایک تھی جس کے منہ پر چیچک کے اتنے داغ تھے کہ اس کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ مگر جب وہ ہنستی تھی تو وہ اتنی پیاری لگتی تھی کہ بس کیا کہوں اور تیسری نائی تھی جو اتنی چھوٹی سی تھی کہ بچی لگتی تھی، اگرچہ اس کی عمر تیس سے زیادہ تھی۔ رات کو ہم لوگ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہتے، ایک دوسرے کو اپنی رام کہانی سناتے رہتے تھے اور پھر جب جنگل سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آتی تو ڈر کے مارے سب چپ ہو جاتے اور درگا دیدی کہتی۔

''اری چادلی ڈر لگتا ہے تو میرے پاس آجا۔''

اور پھر ایک ایک کر کے ہم سب درگا دیدی کے پاس پہنچ جاتے اور وہ ہمیں اپنے سینے سے لگا لیتیں اور بچوں کی طرح ہو ہو کر کے ہم سو جاتے اور خواب میں شیر چیتوں سے خوب، خوب ملاقاتیں ہوتیں۔

ویسے ہر تنبو میں رات کو ایک ایک بھری ہوئی بندوق بھی رکھی رہتی تھی اور نرل بابو نے سب کو چلانا بھی سکھا دیا تھا۔ پھر بھی شیر کی آواز سن کر سب بندوق کو بھول کر درگا دیوی کا سہارا ہی ڈھونڈ ھتے۔ ایک رات شیر کی آواز نہیں آئی اور باتیں کرتے کرتے ہم سب اپنے اپنے پلنگوں پر ہی سو گئے۔ ایک بار میری آنکھ کھلی تو بالکل قریب سے شیر کے غرّانے کی آواز آئی میں ڈری کہ درگا دیدی کو آواز دی تو شیر ہمارے تنبو پر ہی پل پڑے گا، نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی ہمت آ گئی کہ دبے پاؤں اٹھی، بندوق اٹھائی اور اسے لے کر باہر نکلی، چاندنی رات تھی کیمپ میں ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور تک شیر کا نام ونشان نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ شیر کی آواز خواب میں سنی ہو گی، تنبو میں واپس جا رہی تھی کہ بالکل قریب سے ایک بھیانک غرّاہٹ کی آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو مجھ سے صرف دو تین گز کے فاصلے پر ایک لمبا چوڑا شیر، تنبو کی رسیوں پر پنجے مار رہا تھا۔ بندوق میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تھی اور شیر میرے سامنے تھا اور اب رسیوں کو چھوڑ کر میری طرف جست لگانے والا ہی تھا کہ بندوق چل گئی اور اس کے دھماکے سے میں بیہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو سب لوگ مجھے گھیرے ہوئے مبارک باد دے رہے تھے اور تنبو کے باہر شیر مرا پڑا تھا۔

اس وقت سے سارے کیمپ میں میرا بڑا نام ہوگیا اور معمولی سڑک کوٹنے والی مزدورنی سے مجھے عورتوں کے سیکشن کی سپروائزر بنا دیا گیا اور اپنی سڑک کامگار یونین کی کمیٹی جو تھی اس میں بھی مجھے عورتوں کی طرف سے ممبر چنا گیا۔

اور اس تمام عرصے میں ہماری سڑک جنگل کا سینہ چیرتی ہوئی شیروں، چیتوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کو ڈرا کر بھگاتی ہوئی پہاڑی نالوں کو پلوں سے پار کرتی ہوئی اور چٹانوں کو ڈائنامیٹ سے اڑا کر ہموار کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اس چورا ہے کی طرف جو ہماری آخری منزل مقرر کی گئی تھی۔

سڑک کے ساتھ ساتھ ہمارا کیمپ بھی آگے بڑھتا جا رہا تھا اور کام کے ساتھ ساتھ ہماری پڑھائی بھی جاری تھی۔ گھنٹہ بھر اسکول میں جو کچھ پڑھتی اس سے بھی زیادہ میں نرل بابو سے باتوں باتوں میں سیکھ لیتی۔ نرل بابو کہتے۔

''چاولی۔ دیکھو سوال کرنے کی عادت ڈالو، انسان ترقی کرتا ہے صرف سوال کرنے سے اور ان کے جواب معلوم کرنے سے۔''

اور پھر وہ بتاتے کہ کیسے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا، کیسے بھاپ کے انجن ایجاد ہوئے، کیسے یورپ میں مشینوں نے زندگی کی کایا پلٹ کر ڈالی اور کیسے اس مشینی انقلاب میں سے مزدور راج کا خواب ابھرا۔ سو میں سوال کرتی رہتی:

'نرل بابو، یہ بتایئے روس میں بھی جات، پات کا بھید بھاؤ ہے؟'

'نرل بابو، کیا یہ سچ ہے کہ چین میں عورتیں بھی ٹریکٹر چلاتی ہیں؟'

'نرل بابو، امریکہ میں جو عورتیں سڑک بناتی ہیں ان کو کیا مزدوری ملتی ہے؟'

'نرل بابو، یہ پانچ ورشی یوجنا کیا ہے؟'

'نرل بابو، ہماری اس سڑک سے ہمارے دیش کو کیا فائدہ ہوگا؟'

اور ایک دن میں نے پوچھا، نرل بابو، آپ کہتے ہیں تا کہ سوشلزم سے دنیا کے دکھ دور ہوجائیں گے؟''

انھوں نے کہا ''ہاں چاولی، میرا تو یہی خیال ہے کہ سوشلزم میں انسان کی مکتی ہے، سوشلزم

ہی ہر انسان کو زندگی کی سب ضروریات مہیا کر سکتی ہے، روٹی، کپڑا، مکان، شکشا، سنسکرتی، شانتی، ترقی—''

'اور محبت؟ کیا سوشلزم میں اس کی گنجائش بھی ہے؟'

'کیا مطلب ہے تمھارا چاولی؟'

'میرا مطلب ہے کہ اگر کوئی عورت کسی مرد کو چاہتی ہے اور وہ اسے نہیں چاہتا، کسی اور عورت کو چاہتا ہے تو سوشلزم اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟'

یہ ایک سوال تھا جس کا نرل بابو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بڑی دیر تک وہ سوچ میں ڈوبے رہے، پھر ٹھنڈی سانس بھر کر آکاش کو تکتے ہوئے بولے 'سوشلزم میں بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔'

''تو پھر مجھے آپ کی سوشلزم نہیں چاہیے'' میں نے جل کر کہا۔

''ضرور چاہیے چاولی، ضرور چاہیے اس لیے کہ جو سوشلزم میں وشواس نہیں رکھتے وہ پریم کی مار برداشت نہیں کر سکتے، جب ان کو محبت نہیں ملتی تو وہ شراب پیتے ہیں، پتھر دل اور ظالم ہو جاتے ہیں، خون کرتے ہیں یا خودکشی۔''

''اور وہ جو تمھاری سوشلزم میں وشواش رکھتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟''

اس کا جواب بڑی دیر میں آیا مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے دل کی گہرائی سے جواب دے رہے ہیں۔

''وہ دوسروں کے سکھ میں اپنا سکھ تلاش کرتے ہیں چاولی، یقین مانو جو دکھ تمھیں ہے وہ انوکھا نہیں ہے، دوسروں کو بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے اس سے ان کی آنکھوں میں وہ دیکھا جس کا مجھے شروع سے ڈر تھا مگر میں اپنے آپ کو ہمیشہ سمجھاتی آئی تھی، کیوں پگلی ہوئی ہے رے،...... نرل بابو جیسے پڑھے لکھے نوجوان خوب صورت آدمی اور تجھ جیسی بھتنی سے پیار کریں یہ تو ناممکن ہے، ناممکن۔ میں نے کہا۔

''نرل بابو، آپ کے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو میں آپ کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں۔''

بڑی گہری، بڑی ٹھنڈی سانس لے کر انھوں نے کہا۔

''مگر چادلی مجھے تمھاری جان نہیں چاہیے۔''

اور پھر وہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے جنگل کی طرف نکل گئے اور میں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اب پھر برسات قریب آرہی تھی اور ہماری سڑک کا کام بڑی تیزی سے ہورہا تھا کیونکہ بارش شروع ہوگئی تو جنگل میں اور پہاڑی راستوں پر سڑک بنانا تو کیا آنا جانا بھی ناممکن ہوجائے گا۔ ایک دن نرمل بابو بولے۔

''چادلی، کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ برسات سے پہلے کام ختم کرنے کے لیے ہمیں کام کرنے والوں کی گنتی بڑھانی پڑے گی، اس لیے میں اور دلاور ایک ٹرک لے کر جارہے ہیں، تم بھی چلو شاید چند عورتوں سے بھی بات کرنی پڑے۔''

اور ہم تینوں روانہ ہوگئے، کئی گاؤں میں گئے وہاں لوگوں کو اپنی سڑک کے بارے میں بتایا۔ وہاں سے مزدور (اور میری وجہ سے کئی مزدورنیاں بھی) بھرتی کیے اور ان کو اپنے کیمپ روانہ کیا۔ نرمل بابو نے کہا۔

''اب ہمیں صرف ایک میکینک چاہیے جو موٹروں اور انجنوں کی مرمت کرسکتا ہو، کیونکہ ٹریکٹر بلڈوزر کے کسی پرزے میں بھی خرابی ہوجاتی ہے تو کئی کئی دن تک کام رک جاتا ہے۔''

اور میں نے کہا: کیمپ میں اتنے مزدور ہوگئے ہیں اور کچن کا انتظام بہت خراب ہے، ایک آدمی چاہیے جو کھانے پکانے کی دیکھ بھال کرے۔''

اور دلاور نے کہا۔

''یہ سب ہورہا ہے تو ایک پان کی دوکان بھی ہونی چاہیے۔ راستہ میں کوئی پان والا ملا تو میں اسے بٹھالوں گا۔''

میں نے کہا۔

''پان والی مل گئی تو اور بھی اچھا ہے۔''

دلاور بولا۔

''پان والی نہیں چاہیے۔ عورتوں کی وجہ سے کیمپ کا سارا ڈسپلن خراب ہو جاتا ہے اور......''

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر اتنے میں بڑے زور کی گرج سنائی دی، آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور دور جس طرف ہماری ٹرک جا رہی تھی بار بار بجلی چمک رہی تھی۔

نرمل بابو بولے۔

''لگتا ہے اس سال برسات جون کے بجائے مئی ہی میں شروع ہو جائے گی۔''

دلاور نے کہا۔

''نہیں، یہ تو وقتی طوفان معلوم ہوتا ہے۔ ایک بار برسے گا اور گذر جائے گا۔''

اتنے میں بوندیں پڑنا بھی شروع ہو گئیں، میں نے کہا۔

''خاں صاحب، تیز چلو نہیں تو طوفان میں پھنس جائیں گے اور رات بھر یہیں سڑک پر گزارنی پڑے گی۔

نرمل بابو نے کہا:

''اور بھیا اس جگہ چلو جہاں کھانا مل جائے۔''

'' اور تو پچیس تیس میل تک کوئی گاؤں بھی نہیں ہے ہاں اگر ہم اگلے موڑ پر مڑ جائیں تو ہوٹل پربت پہنچ سکتے ہیں۔'

نرمل بابو بولے:

ارے بابا، اتنی مہنگی جگہ کھانا کھانے کے لیے دام کس بیوقوف کی جیب میں ہیں؟''

'' تو پھر ہوٹل پربت سے پہلے ایک اور موڑ ہے، اس پر بائیں طرف گھوم گئے تو آپ والے چوراہے پر پہنچ جائیں گے۔''

''اپنا دلاور چوراہا کہو نا دلاور، جہاں تم نے کچھ کھویا تھا نا۔ چلو تلاش کریں، شاید اس اندھیرے میں تمھاری کھوئی ہوئی چیز مل جائے۔''

اب بالکل اندھیرا چھا چکا تھا اور بارش بھی بہت سخت ہو رہی تھی۔ ہوا کے جھکڑ اس زور سے چل رہے تھے کہ ٹرک الٹنے کا خطرہ تھا۔ وہ تو دلاور جیسا ہوشیار ڈرائیور تھا کہ ہم لوگ بچ گئے، ورنہ اس کہانی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو چکے ہوتے۔ دور اونچائی پر دھندلی دھندلی سی

روشنیاں دکھائی دیں تو دلاور نے کہا۔

''وہ ہے ہوٹل پربت۔''

اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ نہ جانے اس نے کیا دیکھا کہ ایک دم بریک مارا اور ٹرک اتنے زبردست جھٹکے کے ساتھ ٹھہری کہ ہم اپنی سیٹوں کے نیچے آرہے اور نرمل بابو کا سر شیشے سے ٹکرایا۔

'کیا ہوا دلاور؟'

نرمل بابو نے پوچھا۔ دلاور دروازہ کھول کر اتر رہا تھا۔

'ایسا لگتا ہے کہ کوئی موٹر کے نیچے آگیا ہے۔'

گھبرا کر ہم بھی اندھیرے اور موسلا دھار بارش میں اتر پڑے۔ دیکھا تو سڑک پر کیچڑ میں لت پت ایک عورت منہ کے بل اوندھی پڑی ہے۔ میرے منہ سے تو ایک چیخ نکل گئی، میں سمجھی کہ ہماری ٹرک کے نیچے آکر بیچاری مرگئی مگر دلاور نے بڑی پھرتی سے بریک لگایا تھا، وہ صرف مڈگارڈ سے ٹکرا کر بیہوش ہوگئی تھی اگر ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو ٹرک کے بھاری پہیوں کے نیچے دب کر اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی۔ نرمل بابو اور دلاور نے مل کر اسے اٹھایا۔ اب ٹرک کی لائٹ میں میں نے دیکھا کہ کوئی جوان عورت ہے اور اچھی خاصی خوب صورت ہے، اینگلو انڈین یا کرسچین لگتی تھی کیونکہ فراک پہنے ہوئے تھی اور بے ہوشی میں بھی اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ بڑبڑا رہی تھی، میں نے کہا۔

''یہ ٹرک کے سامنے آئی کیسے، تمھاری نظر تھی کدھر دلاور؟'

دلاور نے کہا۔

''میری نظر تو سڑک پر ہی تھی مگر یہ تو ایک دم سائڈ سے سامنے آگئی۔ ایسا لگتا ہے جان بوجھ کر جان دینا چاہتی تھی۔''

میں نے کہا۔

''نہ جانے کب سے بارش میں بھیگ رہی ہوگی بیچاری، سردی کے مارے کانپ رہی ہے، اسے میری گود میں لٹا دو، میں اپنے سینے سے چمٹا لوں گی تو شاید کچھ گرمی پہنچ جائے۔''

انھوں نے ایسا ہی کیا۔ دلاور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو نرمل بابو بولے۔

''کہیں سے اس کے لیے تھوڑی سی برانڈی مل جاتی تو اچھا تھا، ورنہ اس بارش اور ہوا میں بھیگ کر نمونیہ ہونے کا ڈر ہے۔''

میں نے کہا 'شراب بندی کے اس زمانے میں برانڈی کہاں ملے گی؟'

اور دلاور نے کہا۔ 'کہاں نہیں ملے گی۔ اس چوراہے پر ہی تلاش کرتے ہیں۔'

جب ہم چوراہے پر پہنچے تو طوفان پورے زور پر تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ٹین کی چھتیں اڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں، ہماری ٹرک جس جگہ جا کر رکی، وہ کوئی موٹر گیرج تھا شاید۔ سائن بورڈ تو آندھی میں اڑ چکا تھا مگر ایک ٹوٹی ہوئی موٹر باہر کھڑی تھی، اور برآمدے میں پرانے ٹائر بکھرے پڑے تھے۔ دلاور نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک کرسچین آدمی نے دروازہ کھولا۔ لالٹین ہاتھ میں تھی، گلے میں کراس لٹکا ہوا تھا مگر تھا نشے میں دھت۔ نرمل بابو نے کہا۔

''ارے بھائی یہاں کہیں برانڈی ملے گی؟''

وہ بولا۔

''برانڈی؟ ضرور ملے گی صاحب، جان فرینڈیز نو اینڈ سنز نو اینڈ وائف کے ہاں سب مال ملے گا۔ ولایتی برانڈی چاہیے تو وہ بھی ملے گی پوری بوتل کے سو روپے ہوں گے برسات کی خوشی میں اپن نے پرائز ڈبل کر دی ہے۔''

نرمل بابو نے کہا۔

''بھائی اتنے روپے تو نہیں ہیں ہمارے پاس۔ ہمیں تو ایک بیمار کے لیے چند قطرے چاہئیں، ایک لڑکی ہے بیچاری ہماری موٹر کے نیچے آ گئی اس سڑک پر ہوٹل پربت کے پاس۔''

ہوٹل پربت کا نام سنتے ہی اس کا سارا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔

''کیا کہا؟ ہوٹل پربت! کہاں ہے وہ لڑکی؟...... یہاں لاؤ نا اسے میں ابھی برانڈی لاتا ہوں اصلی برانڈی......''

ہم لوگ لڑکی کو اٹھا کر اس گیرج والے کے کمرے میں لے گئے۔ چاروں طرف بوتلیں ہی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ بوتلیں اور پرانے ٹائر اور دیواروں پر اخبار سے کاٹی ہوئی تصویریں اور

ایک کونے میں ورجن میری کی تصویر اور اس کے سامنے طوفانی ہوا میں جھلملاتی ہوئی ایک موم بتی۔ لڑکی کو پلنگ پر لٹارہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ وہ بے ہوشی میں کچھ بڑبڑا رہی تھی میں نے کان لگا کر سنا تو کہہ رہی تھی۔

''نو۔۔نو۔۔نو۔۔میں نے اپنے کو تمھارے ہاتھ بیچا تھا۔ پانچ سو روپے کے لیے۔ پر اب تم مجھے دوسروں کے ہاتھوں بیچ کر دھندا کرنا چاہتے ہو......نو۔۔ نو۔۔نو اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ اپنے جانی کے پاس جاؤں گی۔ اوہ۔ جانی ...... جانی۔'' اتنے میں وہ بوتل ہاتھ میں لیے واپس آیا اور لڑکی کو دیکھتے ہی چلایا۔

''اسٹیلا۔۔اسٹیلا مائی ڈارلنگ''

اور یہ کہہ کر پلنگ کے پاس دوزانو ہوکر بے ہوش لڑکی کے ہاتھ کو چومنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بے اختیار رو رہا تھا۔ اور پھر وہ ورجن میری کی تصویر کی طرف گیا اور بولا۔

''تھینک یو، تھینک یو ورجن میری، مدر آف گارڈ۔ آج تم نے میری اسٹیلا مجھے لوٹا دی ہے۔ میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا کروں گا۔ آج سے کوئی ایمانداری کا دھندا کروں گا۔''

اور یہ کہہ کر وہ پاگلوں کی طرح بوتلیں توڑنے لگا۔

نرمل بابو نے دو چار چمچے برانڈی بے ہوش اسٹیلا کو پلائے۔ ویسے کمبل بھی اُڑھا دیے تھے۔ ان کی اور برانڈی کی گرمی سے اب اس کی کپکپی بند ہوگئی تھی

''اسٹیلا۔ اسٹیلا مائی ڈارلنگ۔''

جانی نے واپس آکر اسٹیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آواز دی۔ آخرکار اسٹیلا نے آنکھیں کھولیں اور دھیمی سی آواز میں کہا۔

'جانی۔'

اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھر آئی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے موتیوں جیسے دو آنسو ڈھلک آئے۔ میں نے نرمل بابو اور دلاور کو اشارہ کیا اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ نرمل بابو نے کہا۔

''میکینک کا انتظام تو ہو گیا، چلو کوشش کریں کہیں کھانا مل جائے۔''

جانی بولا۔

'' سامنے ہی رام بھروسے ہوٹل ہے، پنڈت کرپا رام سویا نہیں ہے تو پوری، بھاجی بنادے گا۔''

بارش اور طوفان میں سے ہوتے ہوئے ہم سامنے والے ہوٹل میں پہنچے تو دیکھا اس کا سائن بورڈ بھی آندھی سے اڑ چکا ہے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک چھوکرے نے کھولا۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا۔

''ہوٹل بند ہو چکا۔ کیوں اتنی رات گئے بارش طوفان میں کھالی پیلی تنگ کرتے ہو تم لوگ۔''

دلاور نے اسے ہلکے سے ایک دھکا دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ میں نے کہا۔

''تو کیا ہم بھوکے مر جائیں۔ کہاں ہے تمھارا مالک؟''

چھوکرا شاید ہمیں ڈاکو سمجھا، کیا لگا چلّانے ''پنڈت جی او پنڈت جی۔''

اندر کا دروازہ کھلا اور کوئی بڑبڑاتا ہوا باہر آیا۔

'ارے اس نے کیا۔۔۔'

میں بے اختیار چلا پڑی ''گوبندا''

وہ آگے بڑھا اور تھوڑی دیر تک مجھے گھورتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

''کون چاولی؟''

''ہاں چاولی۔۔ کہو پنڈت جی چمارن کو بھوجن کراؤ گے؟'' اور وہ مٹھائی کی الماری کا تالہ کھولتے ہوئے بولا۔

''میں پنڈت نہیں ہوں چاولی اور تو چمارن نہیں ہے......لو تم سب یہ مٹھائی کھاؤ، پوری بھاجی تو ختم ہو گئی ہے۔''

نرل بابو اور دلاور دونوں ہمیں حیرت سے تک رہے تھے۔ میں نے کہا۔

'نرل بابو، دلاور کھاؤ نا مٹھائی، یہ ہے اپنے گاؤں کا گوبندا۔'

''اچھا تو یہ ہے تمھارا گوبندا۔'' نرل بابو بولے۔

"تب تو ضرور مٹھائی کھاؤں گا۔"

وہ مٹھائی کھا رہے تھے اور میں گوبندا کو دیکھ رہی تھی۔ کتنا بدل گیا تھا وہ۔ زمانے اور دکھوں نے اس کے جوان چہرے پر گہری لکیریں ڈال دی تھیں۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا، دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر ایک مسکان پھیلتی گئی۔ میں نے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

اور وہ بولا "سوچ رہا ہوں کہ میں بھی کتنا بدھو تھا۔"

اور اس کی آنکھوں میں میں نے ایک ایسی چمک دیکھی کہ میں بے اختیار شرما گئی اور اگر میری رنگت اتنی کالی نہ ہوتی تو ضرور میرا چہرہ بھی سرخ ہو گیا ہوتا۔ ولاور نے مٹھائی کھا کر ایک گلاس پانی پیا پھر بولا۔

"ایک پان مل جاتا تو مزا آ جاتا۔"

گوبندا بولا "وہ بھی مل سکتا ہے۔ اے چھوکرے ذرا......"

مگر بات یہیں کی یہیں رہی کیونکہ اسی دم ایک زور کا جھکڑ آیا اور رام بھروسے ہندو ہوٹل کی ٹین کی چھت کو اڑا کر لے گیا۔ اڑا اڑا دھم کر کے ٹین کی چادریں ادھر ادھر گرنے کی آواز آئی اور اب بارش ہم پر براہ راست گر رہی تھی اور ہم چار دیواری میں ہوتے ہوئے بھی طوفان میں تھے۔ ہوا سے لالٹین اور دیوار پر لگا ہوا تیل کا لیمپ دونوں بجھ گئے۔ اب اندھیرا تھا، بارش تھی اور طوفان تھا اور ہم تھے لیکن گوبندا میرے پاس تھا، اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں نے طوفان کے شور سے بھی بلند آواز میں چلّا کر کہا۔

"تب تم ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئے تھے لیکن اس بار نہیں چھوڑوں گی۔"

ہم لوگ باہر نکلے ہی تھے کہ ہوٹل کی دیواریں بھی گرنے لگیں۔ اب سڑک پر بھی گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ نرمل بابو نے کہا۔

"چل کر جانی کے گیرج میں پناہ لیں۔"

مگر وہاں پہنچے تو وہاں بھی یہی حال پایا۔ چھت اڑ چکی تھی دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ اور دیواریں گرنے میں کوئی دیر نہیں تھی اور جانی اور اسٹیلا پہلے ہی سے ہماری ٹرک میں

بیٹھے تھے۔ اب اس چوراہے پر سوائے سڑک کا مگار یونین کی ٹرک کے کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ ہم سب ٹرک میں بیٹھ رہے تھے کہ گوبندا کے ہوٹل کے چھوکرے نے کہا۔

'پنڈت جی۔ پان کی دوکان—'

گوبندا نے کہا 'ارے ہاں، جا تو ان لوگوں کو بھی لے آ۔ ان کی دوکان بھی اب گرنے والی ہی ہوگی۔'

مگر تھوڑی ہی دیر میں چھوکرا واپس آیا اور بولا۔

'پنڈت جی وہ لوگ نہیں آتے۔'

دلاور بولا۔

''کیسے نہیں آتے، میں جا کر لاتا ہوں اور مل گیا تو ایک پان بھی کھاتا آؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ ٹرک سے کود کر بھیگتا گھٹنوں پانی میں سے ہوتا ہوا ادھر کی طرف چلا۔

گوبندا نے کہا۔

''بڑی پگلی عورتیں ہیں، بھلا یہ بھیانک وقت ہے کوئی تکلف کرنے کا۔''

میں نے کہا۔

''عورتیں ہیں تو میں بھی جاتی ہوں۔''

جس جھونپڑی میں پان کی دوکان تھی وہاں جا کر دلاور چلایا۔

'ارے باہر آ جاؤ۔ طوفان بڑا بھیانک ہے یہ جھونپڑی اب گرنے ہی والی ہے، ہماری ٹرک میں آ جاؤ۔'

اندر سے ایک زنانی آواز آئی۔

'آپ کی مہربانی کا شکریہ، مگر ہم یہیں رہیں گے۔ ہمیں کسی کا انتظار ہے۔'

'کیا پاگل ہوگئی ہو۔'

میں چلا کر بولی۔ اسی دم ایک طوفانی جھکڑ آیا اور جھونپڑی کی ایک پوری دیوار اڑا کر لے گیا۔

''چلو دلاور، ہم ان پاگل عورتوں کو نکال کر لائیں ورنہ یہ مر جائیں گی۔''

میں چلائی— مگر اندھیرے میں راستہ ہی نظر نہ آتا تھا، پھر بھی کسی طرح ہم جھونپڑی تک

پہنچے۔ دلاور نے ڈانٹ کر کہا۔

"چلو باہر نکلو۔"

اس وقت بجلی چمکی اور میں نے دیکھا کہ جھونپڑی کے ایک کونے میں دو عورتیں دبکی بیٹھی ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی ہے اور دوسری جوان اور بہت خوب صورت۔ بجلی چمک کر غائب ہو گئی تب اس کا تڑاخہ سنائی دیا اور دلاور کی آواز جو بادلوں کی گرج سے بھی زیادہ اونچی تھی۔

'پیاری!'

بس یہ ہے میری اور میری سڑک کی کہانی، بلکہ ہماری سڑک کی کہانی کیونکہ گوبندا اور پیاری اور پیاری کی ماں اور اسٹیلا اور جانی سب ہماری ٹرک میں ہمارے ساتھ کام کرنے جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ مل کر اس نئی سڑک کو بنانے جا رہے ہیں جو جنگل کے سینے کو چیرتی، دریاؤں اور نالوں کو پار کرتی، چٹانوں کو ڈائنامیٹ سے اڑاتی، پہاڑوں کو نیچا دکھاتی اس چوراہے کی طرف بڑھ رہی ہے مگر وہ اس چوراہے پر ٹھہرے گی نہیں۔ وہ بہت دور آگے نکل جائے گی اس لیے کہ اس سڑک کی منزل مستقبل ہے۔

چوراہے کی کہانی

خود چوراہے کی زبانی

سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ جان فرینڈیز، پنڈت کرپا رام یعنی گوبندا، پیاری پنواڑن۔

جانی کو اسٹیلا مل گئی۔

گوبندا کو چادلی۔

پیاری کو دلاور۔

سنا ہے اسے عشق کہتے ہیں۔

یہ بیماری انسانوں کو ہوتی ہے۔

چوراہا عشق نہیں کرتا۔ تب ہی تو کوئی مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گیا اور اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ اکیلا اور سنسان، کوئی ویرانی سی ویرانی ہے.........

طوفان ختم ہو گیا ہے، بارش تھم گئی ہے۔ مگر یہ رات اپنے ساتھ کیا کچھ لے گئی ہے۔ کیا کچھ ہمیشہ کے لیے تباہ برباد کر گئی ہے۔ وہ دیکھو ان جھونپڑیوں کے کھنڈر جو کیچڑ میں لت پت پڑے ہیں، رام بھروسے ہندو ہوٹل کا سائن بورڈ جو گندے نالے میں پڑا ہے، شان اسلام ہوٹل کا بورڈ جس کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ وہ دیکھو جان فرینڈ یز کی ٹوٹی ہوئی موٹر جس میں انجن ہی نہیں ہے۔ چاروں طرف بوتلیں ٹوٹی پڑی ہیں اور ان میں جانی کی بنائی ہوئی شراب جو بھری ہوئی تھی اب کیچڑ اور گندے پانی میں مل چکی ہے۔ وہ دیکھو ایک بجھی ہوئی موم بتی اور اس کے پاس ہی ورجن میری کی تصویر جو زمین پر پڑی ایک معصوم مسکراہٹ کے ساتھ آسمان کو تک رہی ہے اور سڑک کے دوسری طرف بھگوان کرشن، سائیں بابا، قائد اعظم محمد علی جناح، درگاہ اجمیر شریف، برلا مندر اور نرگس، وجینتی مالا اور مینا کماری کی تصویریں بھی اس بے کسی کے ساتھ ایک دوسرے میں خلط ملط پڑی ہیں اور اس تباہی کو دیکھنے والا اس پر آنسو بہانے والا بھی کوئی نہیں ہے سوائے میرے۔

لیکن چوراہا آنسو نہیں بہا سکتا۔ چوراہا عشق نہیں کر سکتا۔ چوراہا دیکھ نہیں سکتا۔ دکھا سکتا ہے، خود کسی سے نہیں مل سکتا، ہاں اوروں کو ملا سکتا ہے۔ رام کنڈ والی سڑک کو سلطان آباد اور پربت پور والی سڑکوں سے اور ان تینوں کو اس نئی سڑک سے جو جنگل اور پہاڑوں کا سینہ چیرتی ہوئی ادھر آ رہی ہے۔

چوراہے کو سڑکوں کی پہچان ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں رام کنڈ والی سڑک کے کیا ٹھاٹھ تھے، اس پر سونے کی جھولیں ڈالے ہاتھی چلتے تھے، کبھی سلطان آباد والی سڑک بھی شباب پر تھی، پرانے نواب صاحب کی چاندی کی پالکیاں اور پھر نئے نواب صاحب کی رولز رائز کاریں چلتی تھیں۔ پھر ہوٹل پربت والی سڑک کا زمانہ آیا، کیا جوبن تھا اس کا جب بمبئی کے سیٹھوں کی چکنی، سڈول، اسٹریم لائنڈ کاریں جو اس پر چلتی تھیں لیکن اب یہ سڑکیں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ ان کے چہروں پر زمانے نے جھریاں اور گڑھے ڈال دیئے ہیں اور اب یہ نئی سڑک، جوان سڑک آ رہی

ہے، سنا ہے بڑی خوب صورت ہے، البیلی اور سجیلی اور طرح دار ہے، اس کی چال مستانی ہے اور اس کی نظر میں جادو ہے، سنا ہے دیکھنے والوں کا دل موہ لیتی ہے۔ جو اسے دیکھتا ہے دل و جان سے اس کا ہو جاتا ہے۔

مگر میں ایک چوراہا ہوں اور چوراہا عشق نہیں کرتا۔

○

شیشے کی دیواریں

(1)

آسمان اور زمین دونوں سفید روئی کے لبادوں میں لپٹے ہوئے سردی کے مارے کپکپا رہے تھے۔ مگر شیشے کی دیواروں کے اندر لندن ایئر پورٹ کے پسنجر لاؤنج نمبر بارہ میں بجلی کے ہیٹر روشن تھے۔ اور ان کے سامنے لگی ہوئی جالیوں میں سے گرم گرم ہوا نکل رہی تھی۔ محمودہ بھی ایئر انڈیا انٹرنیشنل کے دوسرے مسافروں کے ساتھ ہی ہوائی جہاز سے براہ راست ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں داخل ہوئی تھی۔ مگر اوروں کی طرح اسے پاسپورٹ اور کسٹم کے کیو میں جگہ لینے کی جلدی نہیں تھی۔ اپنے ہینڈ بیگ کو ایک کرسی پر رکھ کر محمودہ نے اپنے بھاری اوور کوٹ کو اتارا جو پچھلے سال اس نے کشمیر میں سلوایا تھا اور جس کے کالر پر لومڑی کا نرم نرم سمور لگا ہوا تھا۔

''کیا ہوا۔۔۔؟ میں مدد کروں آپ کی۔؟'' چکنے چپڑے خضاب سے سیاہ کیے ہوئے بالوں والے صاحب نے جو راستے بھر برابر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس سے بات کرنے کے مختلف پینترے سوچتے رہے تھے اور جنھوں نے نیند کے جھونکوں کے بہانے سے کئی بار محمودہ کے شانوں پر اپنا سر رکھنے کی کوشش کی تھی، ہینڈ بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''شاید آپ تھک گئی ہیں یہ بوجھ اٹھاتے ہوئے؟''

''جی نہیں شکریہ میں ابھی یہیں ٹھہروں گی۔'' اس نے برف سے زیادہ سرد آواز سے ان حضرت کی گرم جوشی کو ٹھنڈا کر کے ان کو رخصت کیا اور پھر وہ اس حسینہ کی طرف متوجہ ہوئی جو یونیفارم کی پھولدار ساڑی پہنے اپنے گورے چہرے پر ایئر ہوسٹس والی پیٹنٹ مسکراہٹ چپکائے

اور نہایت اونچی ایڑی کے جوتے پہنے کھٹ کھٹ کرتی اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔

''مس اکبر علی؟'' ہوسٹیس نے قریب آ کر پسنجر لسٹ پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''یس۔''

''پاسپورٹ اور کسٹم کا معائنہ ادھر ہو رہا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' محمودہ نے جواب دیا۔ ''میں یہاں پہلے بھی آ چکی ہوں۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ کراچی سے پی۔ آئی۔ اے کا پلین کب آئے گا۔؟''

اپنی گوری مگر خاصی چوڑی چکلی کلائی پر لگی گھڑی دیکھ کر انگریز حسینہ بولی۔ ''وقت تو ہو چکا ہے لیکن آج یہ جہاز لیٹ آ رہا ہے۔ کوئی آدھا گھنٹہ اور لگے گا۔''

''کیا اس وقت تک میں یہاں ٹھہر سکتی ہوں؟ مجھے اس پلین سے کسی کے آنے کا انتظار ہے۔''

''بڑے شوق سے۔ پی۔ آئی کے پسنجر برابر والے گیارہ نمبر کے لاؤنج ہی سے گزریں گے۔ آپ اس شیشے کی دیوار میں سے اپنے فرینڈ کو دیکھ سکتی ہیں۔'' اور یہ کہہ کر ایک بار پھر ایئر ہوسٹیس نے بجلی کے قمقمے کی طرح اپنی پیٹنٹ مسکراہٹ چمکائی اور چلی گئی۔ اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ کسٹم حال کی سمت میں دور ہوتی گئی۔

محمودہ نے شیشے کی دیوار میں سے برابر والے لاؤنج نمبر گیارہ کو دیکھا جو اس وقت سنسان پڑا ہوا تھا۔ جیسے وہ بھی اس کی طرح کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ پھر وہ ٹہلتی ہوئی دوسری طرف گئی جدھر باہر سے آنے کا راستہ تھا اور شیشوں میں سے آنے والے ہوائی جہازوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ سارے ایئر پورٹ پر برف کی چادر چڑھی ہوئی تھی جو ہوائی جہاز آئے ہوئے کھڑے تھے ان کے پروں اور پنکھوں پر برف کی تہہ جم چکی تھی۔

اور پھر یک بیک سارے ایئر پورٹ کی روشنیاں جل اٹھیں۔ جیسے ہزاروں ستارے اندھیرے کے سمندر میں کود پڑے ہوں اور دفعتاً محمودہ نے دیکھا کہ شیشے میں سے خود اس کا چہرہ اسے گھور رہا ہے۔

کتنے ہی برس گزر گئے تھے جب سے وہ اور اس کا چہرہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو چکے تھے۔ اب تو آئینہ دیکھنا اس نے تقریباً چھوڑ سا دیا تھا۔ کئی برس سے تو اسے آئینے سے ڈر سا لگنے لگا

تھا۔ ہر بار سر میں دو چار سفید بال زیادہ ہی نظر آتے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور سیاہ ہوتے جا رہے تھے اور ہونٹوں کے دونوں طرف کی باریک لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ مگر آج بے اختیار جب اس کی نظر شیشے کے چوکھٹے پر پڑی تو دیکھا کہ پس منظر میں برف سے ڈھکی ہوئی ائیر پورٹ کی روشنیاں ہیں اور سامنے ایک حسین جوان لڑکی کا عکس اسے گھور رہا ہے۔ ''کیا یہ واقعی میں ہوں۔؟'' اس نے سوچا نہیں یہ میں کیسے ہوسکتی ہوں۔ میری تو عمر چونتیس برس کی ہو چکی ہے۔ میری سب سہیلیاں مجھے دی اولڈ میڈ آف دہلی کہتے ہیں اور یہ لڑکی تو زیادہ سے زیادہ اکیس بائیس برس کی ہوگی۔ اس کے شفاف گالوں پر نوجوانی کا نکھار ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو پہلی محبت کا خمار ہے۔ ارے یہ تو ایسے شرما رہی ہے جیسے آج پہلی بار وہ اپنے پہلے چاہنے والے سے ملنے کا انتظار کر رہی ہو۔ نہیں یہ میں نہیں ہوں کوئی اور ہے۔ اس اجنبی نوجوان لڑکی سے آنکھیں چرانے کے لیے وہ اس عکس کے آر پار شیشے کی دیوار کے دوسری طرف برف سے ڈھکی ہوئی ایئر پورٹ کے خاموش ہنگامے کو دیکھنے لگی۔

باہر جاڑے کی شام کے دھندلکے میں برف کے روئی جیسے سفید سفید گالے اسی طرح نرمی اور خاموشی اور سست رفتاری سے گر رہے تھے۔ جیسے یہ حقیقت نہ ہو، لندن کی ہنگامہ خیز اور مصروف ایئر پورٹ نہ ہو، دسمبر کی اکیس تاریخ نہ ہو بلکہ ایک خواب ہو۔ ابدیت کی وہ گھڑی ہو جب ماضی اور حال اور مستقبل ایک دوسرے میں گم ہو کر یاد کے سنہری دھوئیں میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

(2)

یہ دسمبر کا مہینہ نہیں ہے۔ یہ 1945 کا ستمبر ہے۔

یہ لندن کا برف سے ڈھکا ہوا ایئر پورٹ نہیں ہے۔ یہ پی اینڈ او کا سمندری جہاز ایس۔ ایس ملتان ہے جو بمبئی سے لندن جا رہا ہے۔

یہ جہاز نہیں دنیا ہے — اونچے نیچے طبقوں میں بٹی ہوئی دنیا۔

سب سے اوپر فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں۔ زیادہ تر انگریز ہانگ کانگ کے تاجر اور سنگاپور کے پلانٹر جنھوں نے چین اور ملایا میں کروڑوں کمائے ہیں جو جنگ کے دوران جاپانیوں

کی قید میں رہے اور 'پیلے' ایشائیوں کی ٹھوکریں کھائیں مگر اب جب کہ ایک ایٹم بم کی مدد سے 'جمہوریت پسند' اتحادیوں کی فتح ہو چکی ہے۔ ان کے دم خم وہی ہیں۔ چینیوں، جاپانیوں، ہندوستانیوں اور حبشیوں کو وہ اب بھی 'گھٹیا انسان' قلی اور غلام سمجھتے ہیں۔ دن بھر ڈیک پر بیٹھے روسی اور چینی کیونسٹوں کو کوستے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ایشیا میں ان کا چین سے رہنا اب مشکل ہو گیا ہے۔ ان کو خدشہ ہے کہ چین میں کیونسٹوں کا اثر بڑھ رہا ہے اور اسی لیے ان میں سے کتنوں ہی نے وہاں سے اپنی دکان بڑھالی ہے اور اب عمر بھر کی کمائی لے کر ریٹائر ہونے کے لیے ''ہوم'' جا رہے ہیں جہاں وہ یارک شائر یا کینٹ کے کسی گاؤں میں ایک ایک چھوٹا سا مکان لے کر رہیں گے جس کا نام روز کاٹیج، آئی دن ہو یا دی پوپلرس ہوگا اور ہر شام کو وہ پب میں بیٹھ کر بیر اور سٹاؤٹ پئیں گے اور اپنے پڑوسیوں کو چین اور ملایا کے اپنے سچے جھوٹے تجربات سنا سنا کر بور کریں گے۔

ان لال منہ والے اولڈ چائنا ہینڈز کے علاوہ دوسرے ایمپائر بلڈرس بھی ہیں۔ یہ ہندوستان کی سول سروس کے بارعب ستون ہیں جو ریٹائر ہو کر یا لمبی چھٹی لے کر ''ہوم'' جا رہے ہیں۔ ان میں بلھو گڑھ کے کمشنر اور فیض آباد کے کلکٹر اور ناسک کے سول سرجن اور آگرے کے مشن کالج کے پرنسپل اور زرک میں متعینہ جاٹ رجمنٹ کے کرنل ٹامسن ہیں۔ یہ سب ہیں اور ان کی نہایت موٹی یا نہایت دبلی بیویاں ہیں جو ولایت واپس جانے سے خوش نہیں ہیں کیونکہ وہاں اتنے سستے نیٹو سرونٹس NATIVE SERVANTS نہیں ملیں گے اور انہیں اپنے ہاتھ سے کپڑے دھونے پڑیں گے اور ان صاحب و میم صاحب لوگوں کے بابا لوگ ہیں جو اپنی اپنی کالی ہندوستانی یا پیلی چینی آیا سے بچھڑنے پر اب تک آنسو بہا رہے ہیں۔ اس طبقے میں چند کالے ہندوستانی بھی ہیں۔ جیسے راجا صاحب رام نگر اور نواب صاحب سلام پور جن کو ان کی دولت اور رتبے کی بدولت اس اونچے طبقے میں ''آنریری انگریز'' کی پوزیشن حاصل ہے۔ راجا صاحب رام نگر جنگ سے پہلے ہمیشہ چھٹیاں گزارنے کے لیے چیکوسلواکیہ جایا کرتے تھے۔ مگر اب وہاں کیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہ جنیوا جا رہے ہیں اور نوجوان نواب سلام پور کو پیرس میں گزاری ہوئی اپنی جوانی کے کارنامے سناتے رہتے ہیں۔

اس سب سے اونچے طبقے کے نیچے دوسرا طبقہ ہے جو سیکنڈ کلاس میں پایا جاتا ہے۔ یہاں چھوٹے درجے کے انگریز اور اینگلو انڈین ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر، مشنری پادری، ریلوے گارڈ اور انجن ڈرائیور۔ فوج کے سارجنٹ اور اونچے درجے کے ہندوستانی نوجوان جو آئی۔ سی۔ ایس کی ٹریننگ کے لیے انگلستان جا رہے ہیں۔ سندھی تاجر جو قاہرہ میں سلک کا بیوپار کرتے ہیں۔ گجراتی مل کا منیجر جو انگلستان سے اپنے مل کے لیے مشینری خریدنے جا رہا ہے۔

اس سے بھی نیچے نچلے متوسط درجے کا طبقہ ہے جو ٹورسٹ کلاس میں ملتا ہے۔ زیادہ تر ہندوستانی اور چینی ملایا کے طالب علم ہیں جو گورنمنٹ اسکالر شپ پر انگلستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں پڑھنے جا رہے ہیں۔ چند چھوٹے درجے کے تاجر ہیں جو لندن کے ایسٹ اینڈ میں دوکان کرتے ہیں یا اجنتا اور تاج محل جیسے نام کے ریستوران چلاتے ہیں۔ جہاں ہندوستانی طالب علموں کے علاوہ ریٹائرڈ انگریز سویلین آ کر ''چھوکرا۔ کوئی ہے''۔ چلا کر اور خوب مرچوں والی ''کری اینڈ رائس'' کھا کر ہندوستان میں گذارے ہوئے زمانے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ دو چینی دانتوں کے ڈاکٹر ہیں جو لندن میں دندان سازی کی دکان کھولنے جا رہے ہیں تاکہ انگریزوں کے دانت نکال سکیں جو ہانگ کانگ میں ان پر آنکھیں نکالتے تھے۔

اس کے نیچے ایک اور درجہ ہے جس میں ڈیک کے مسافر ہیں جن کے سونے کے کیبن نہیں ہیں بلکہ جو ڈیک پر اپنے اپنے بستر بچھائے ہوئے پڑے ہیں۔ بالکل جیسے بمبئی یا کلکتہ کی سڑکوں کے کنارے آسمان کے نیچے بے گھر بے ٹھکانہ لوگ سوتے ہیں۔ ان میں غریب ہندوستانی، چینی ملایا کے رہنے والے اور انڈونیشین ہیں جو لندن میں مانچسٹر اور ایڈنبرا اور گلاسکو میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشنوں پر جھاڑو دیتے ہیں۔ ایسٹ اینڈ میں خوانچے لگا کر بسکٹ اور مٹھائی اور مچھلی کے کباب بیچتے ہیں۔ جوتشی بن کر سادہ لوح انگریز لڑکیوں کے ہاتھ دیکھ کر ان کی قسمت بتاتے ہیں۔ ہندوستانی اور چینی ریشمی کپڑا بیچتے ہیں۔ ایک ایک کمرے میں آٹھ آٹھ دس دس آدمی رہتے ہیں اور گیس کی انگیٹھیوں پر دال بھات پکا کر کھاتے ہیں اور اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ بچا بچا کر گھر بھیجتے رہتے ہیں تاکہ واپسی پر اپنی زمین کو ساہوکار سے چھڑا سکیں یا اپنی چھوٹی سی دکان کھول سکیں یا اپنی بہنوں کو جہیز دے کر ان کی شادی کر سکیں اور یہ دور شہنشاہیت کا

عجیب و غریب چکر ہے کہ انگریز اور فرانسیسی اور ڈچ اور بلجیئن اپنے اپنے وطن کو چھوڑ کر گرم ایشیائی ملکوں میں وہاں کے نیٹو لوگوں کو بائبل پڑھنا اور پتلون پہننا سکھا رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہاں کی دولت۔ سونا اور چاندی اور لوہا اور کوئلہ اور جنگل کی لکڑی اور چائے اور گرم مسالہ، ربڑ اور ٹین کو بٹور کر اپنے اپنے ملکوں میں بھیج رہے ہیں اور ان ایشیائی ملکوں کے کسان غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنی زمین ساہوکاروں کے ہاتھوں بیچنے یا گروی رکھنے پر مجبور ہو رہے ہیں اور پھر یہ سامراج کے مارے ہوئے ایشیائی پاپی پیٹ کی خاطر سات سمندر پار کر کے یوروپ اور امریکہ اور کینیڈا جا رہے ہیں تا کہ ان کی قومی دولت جو سمٹ کر وہاں پہنچ گئی ہے۔ اس کا ایک تھوڑا سا حصہ واپس لا سکیں۔

اور ان سب درجوں کے نیچے، پانی کی سطح سے بھی نیچے، جہاز میں کام کرنے والے مزدوروں، انجن میں کوئلہ جھونکنے والے اور ڈیک کو دھونے والے خلاصیوں کے کیبن ہیں۔ جہاں بلا کی گرمی ہے، انجنوں کی دھڑ دھڑاہٹ ہے۔ افسروں کی جھڑکیاں اور ٹھوکریں ہیں۔ کھانے کو پانی جیسی دال اور کنکر ملے چاول ہیں اور پینے کو ان کا اپنا خون اور پسینہ ہے۔

اس سے نیچے کوئی انسانی درجہ نہیں ہے۔ صرف 'ہولڈ' ہے۔ جہاں مسافروں کا بھاری سامان رکھا جاتا ہے۔ اور بار برداری کا تجارتی مال، سیلون اور ہندوستان کی لاکھوں ٹن چائے ہے۔ برما کی ٹیک کی لکڑی ہے۔ ملایا کا ربڑ ہے۔ مغربی ہندوستان کی کپاس ہے۔ مالا بار کا کھوپرا ہے، لونگ اور کالی مرچ ہے۔ میسور کی کانوں کا سونا ہے اور بنگال کی پٹسن ہے۔ اس مال اسباب کے وزن سے جہاز میں توازن اور ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس اقتصادی بنیاد پر یہ دنیا قائم ہے۔ یہ دنیا جو بحر ہند کو عبور کرتی ہوئی خلیج فارس کی طرف چلی جا رہی ہے۔

(3)

''یہ جہاز نہیں ہے۔ یہ دنیا ہے جو اوپر نیچے طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو ذرا فرسٹ کلاس کی طرف جانے کی کوشش کیجیے جہاں اس وقت صاحب لوگ اور ان کی موٹی موٹی میمیں ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں مزے سے بیٹھے ہیں جب کہ ہم یہاں گرمی میں جھلس رہے ہیں۔''

ٹورسٹ کلاس کے ڈرائنگ روم کی میز نمبر سات پر سلیم نے رابرٹ سے کہا اور رمیش دیسائی نے اس سے اتفاق کیا۔ ''ٹھیک کہتے ہو اور مزا یہ ہے کہ یہ امریکن اور یورپین جو منز کے بنائے ہوئے ذات پات کے اصولوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ خود اپنے سماج میں اس سے بھی کڑی تفریق جائز سمجھتے ہیں۔ ہٹلر جو یہودیوں کو انسانی برادری سے خارج سمجھتا تھا اس کا تو خاتمہ ہو گیا مگر اس کو کیا کیجئے گا کہ جمہوریت کے متحدہ محاذ میں بھی ہٹلر کے نسلی اصولوں پر عمل ہو رہا ہے۔ جنوبی افریقہ میں کالی رنگت والوں کے ساتھ اچھوتوں جیسا برتاؤ ہوتا ہے اور امریکہ کے کتنے ہی شہروں میں نیگرو بچے سفید چمڑی والوں کے اسکولوں میں تعلیم نہیں پا سکتے۔ نہ ان کے ماں باپ سفید چمڑی والوں کے ساتھ ٹرم یا بس میں بیٹھ سکتے ہیں اور اسے آپ لوگ کہتے ہیں ''عیسائی تہذیب۔'' اس کا نام آپ نے رکھا ہے جمہوریت۔''

''ہیئر۔ ہیئر۔!'' اسلم نے میز کو ٹھوکتے ہوئے کہا اور پھر وہ اور دیسائی دونوں رابرٹ کی طرف دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں ''اب بولو مسٹر کیا کہتے ہو۔؟''

رابرٹ کا قد چھ فٹ تھا اور اس کی سفید جلد برسوں ایشیا کی دھوپ میں تپ کر سنولا چکی تھی اور وہ ناک میں سے بولتا تھا اور کالر میں سے پھٹی ہوئی خاکی فوجی قمیض اور ایک میلا سا خاکی نیکر پہنے ہوئے نظر آتا تھا۔ وہ اپنے ''ہم میز'' ساتھیوں کے جوشیلے انداز پر مسکرایا اور پھر بولا'' میں بھی کہتا ہوں، ہیئر۔ ہیئر۔ میں تم لوگوں سے سو فیصدی متفق ہوں۔ تم کو شاید یہ معلوم نہیں کہ میں کسی زمانے میں پادری تھا اور مجھے چین بھیجا گیا تھا۔ تمھارے جیسے ایشیائی وحشیوں کو عیسائی بنانے کے لیے مگر ایک برس ہی میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ہمارے مشنری ایک ہاتھ میں مذہب کی بائبل اور دوسرے میں سامراج کی بندوق لے کر چلتے ہیں......''

''اور ان کے کندھوں پر تجارت کا سامان ہوتا ہے۔'' سلیم نے کہا۔'' کارخانوں کا بنایا ہوا سستا مال۔ جس کے بدلے میں وہ سیدھے سادے ایشیائیوں اور افریقہ والوں سے ان کا سونا اور چاندی اور چائے اور ہاتھی دانت اور ربڑ اور ٹین اور پٹ سن لے کر ایسے جہازوں میں بھر کر یورپ لے جاتے ہیں۔''

''بالکل صحیح ہے۔!'' رابرٹ نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' اسی لیے میں نے چھ

برس ہوئے مشن سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے بڑے پادری سے کہہ دیا کہ میرے خیال میں یہ لوگ جن کو ہم "وحشی" سمجھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے کہیں زیادہ قریب ہیں اور ہم خود عیسائیت کی روح سے اتنی دور جا رہے ہیں کہ آج اگر نیویارک یا لندن میں یسوع مسیح آ جائیں تو زیادہ تر ہوٹلوں میں سے انہیں "ڈرٹی نیٹو" کہہ کر نکال دیا جائے۔"

چار دن سے اس میز پر ان کا ساتھ تھا مگر آج تک وہ رابرٹ کو کوئی امریکن ایڈونچر ہی سمجھ رہے تھے۔ مگر اس کی یہ باتیں سن کر سلیم کے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی۔ رابرٹ؟ رابرٹ؟ اس نے پوچھا۔

"تم وہ رابرٹ تو نہیں ہو جس نے وہ کتاب لکھی ہے۔ "سرخ زمین کے سرخ ستارے؟"

رابرٹ نے ہنس کر کہا۔

"یس سر — وہی رابرٹ اسمتھ ہوں میں۔ رابرٹ کارلٹن اسمتھ۔ کسی زمانے میں پادری تھا۔ پھر اخبار کا نمائندہ بن کر پانچ برس جنگ کے دوران میں نے چین کی خاک چھانی اور اب میں بیکار ہوں کیونکہ میرے اخبار کے مالک کی رائے ہے کہ میں چینی کمیونسٹوں کا پروپیگنڈا کرتا ہوں اور یہی رائے چیانگ کائی شیک کی گورنمنٹ کی ہے اور اسی لیے مجھے پیکنگ سے نکالا گیا ہے۔"

دیسائی نے کہا۔ "معاف کرنا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اتنا مشہور ترقی پسند جرنلسٹ ہمارے ساتھ سفر کر رہا ہے۔"

اور سلیم نے کہا۔

"آپ کی کتاب میں نے علی گڑھ میں پڑھی تھی...... بڑا ہی اثر ہوا تھا ہم لوگوں پر۔ اس سے پہلے تو ہم لوگ چین کو بالکل الف لیلہ کی سرزمین سمجھتے تھے۔ اس جنگ کے دوران میں وہاں اتنا بڑا انقلاب آ گیا ہے۔ یہ تو ہمیں آپ کی کتاب سے معلوم ہوا۔"

رابرٹ نے کہا۔

"تو آپ دونوں مہربانی کر کے آئندہ مجھے ان صاحب لوگوں کی طرح نہ سمجھیں جن سے آپ کا واسطہ ہندوستان میں پڑا ہوگا۔ آپ لوگوں کو یہ جان کر دلچسپی ہوگی کہ شنگھائی کلب میں جب میں گیا تو مجھے وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ملی کیونکہ وہاں کے یوروپین اور امریکن تاجروں

کی رائے میں میں نام کا امریکن ہوں۔ دراصل ایشیائیوں سے بھی بدتر ہوں۔ بیسویں صدی کے منو مہاراج مجھے بھی اچھوت سمجھتے ہیں۔''

'یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ اس میز پر آپ کا ساتھ ہو گیا۔'' سلیم نے کہا۔ اور پھر دیسائی کی طرف مخاطب ہو کر ہندوستانی میں بولا۔'' خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین۔''

''دیوانے چار کہو۔!'' دیسائی نے کہا۔'' ابھی تک یہ چوتھی کرسی خالی ہے۔ دیکھیں کون یہاں آتا ہے۔''

''اب کون آئے گا۔؟'' سلیم بولا۔'' جہاز کو چلے پانچ دن ہو گئے۔ اب کیا سمندر کی تہہ میں سے کوئی جل پری آئے گی۔؟''

''کون جانتا ہے جل پری ہی ہو۔'' دیسائی نے مذاق سے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''ڈائننگ روم میں اسٹیورڈ کہہ رہا تھا کہ یہ چوتھی کرسی کسی لیڈی پسنجر کی ہے۔ جو جب سے بمبئی سے جہاز روانہ ہوا ہے اپنی کیبین میں بیمار ہے۔''

''تو سمجھ گیا میں۔ کوئی بھاری بھر کم شریمتی یا اونچی ناک والی بیگم صاحب ہوں گی۔ جو اپنے شوہر کے پاس لندن جا رہی ہیں اور جو ایک دن اپنا پاندان سنبھالے یا وہ سامنے والی خاتون کی طرح اچار کی بوتل ہاتھ میں لیے یہاں نازل ہوں گی اور اپنی گھریلو باتوں سے ہمیں بور کر دیں گی۔''

سلیم ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ انھوں نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم اسٹیورڈ، ایک دبلی سی پتلی سی لڑکی کو ساتھ لیے ان کی میز کی طرف آ رہا ہے۔ رابرٹ نے دیسائی کی طرف دیکھا اور دیسائی نے سلیم کو آنکھ ماری مگر اس سے پہلے کہ وہ آپس میں کوئی بات کر سکیں وہ دونوں ان کی میز کے قریب آ گئے—اور اسٹیورڈ کہہ رہا تھا۔

''دس از یور ٹیبل مس'' پھر وہ چلا گیا اور وہ تینوں ہڑبڑا کر ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر اسی طرح ہڑبڑاہٹ سے ایک ساتھ ہی بیٹھ گئے اور سلیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب ایک گھٹیا سی کامیڈی فلم کے گھٹیا سے ایکٹر ہوں۔

میز نمبر سات پر خاموشی چھا گئی۔

رابرٹ نے میلے پتلون میں سے نکلی ہوئی اپنی بن موزے کی ننگی ٹانگوں کو میز کے اندر کر لیا

اور رومال سے گردن کا پسینہ پوچھنے کے بہانے قمیض کا پھٹا ہوا کالر الٹ لیا۔

دیسائی نے مینو کا بغور مطالعہ شروع کر دیا۔ مینو کارڈ کی آڑ سے مگر تو وار دلڑ کی کو دیکھتا رہا۔

سلیم نے پورٹ ہول میں سے ایک نگاہ سمندر اور آسمان پر ڈالی جیسے قدرت کے نظارے میں منہمک ہو مگر کن انکھیوں سے وہ بھی اس لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔

لڑکی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ دبلی اتنی ہے جیسے بانس کو ساڑی پہنا دی ہو اور رنگت اتنی پیلی ہے جیسے یرقان ہو گیا ہو یا ممکن ہے علالت ہی کا اثر ہو۔ مگر آنکھیں بڑی بڑی اور خوب صورت ہیں۔ پلکیں گھنی ہیں اور سیاہ بال جن میں سنہرے پن کی بھی ایک جھلک ہے گھنے اور لمبے ہیں۔ چوٹی لڑکی کی کمر کے نیچے تقریباً گھٹنوں تک آتی ہے۔ یو پی کی کوئی کائستھ لڑکی ہوگی جو کسی مہاودیالیہ سے بی۔ اے کر کے اسکالرشپ پر انگلستان جا رہی ہے یا ممکن ہے گجراتی ہو۔ ایسا ہوا تو دیسائی فوراً ''سوں چھے۔ کم چھے'' شروع کر دے گا اور نہ جانے کیوں یہ امکان سلیم کو برا لگا۔

ویٹر شوربے کی پلیٹیں ان کے سامنے رکھ گیا۔ وہی کیبج کا سوپ اور حسب معمول ٹھنڈا اور پھیکا۔

''آپ کو نمک چاہیے۔؟'' سلیم نے لڑکی کی طرف نمک دانی بڑھائی۔

''شکریہ۔۔!'' اس نے اردو میں جواب دیا۔ اور شوربے میں نمک چھڑکنے لگی۔

''کیونکہ راستے بھر آپ کو اس میز پر ہماری موجودگی برداشت کرنی پڑے گی۔'' رابرٹ نے امریکن بے تکلفی سے کہا۔ ''اس لیے بہتر ہے کہ ہم اپنا تعارف کرا دیں۔ میرا نام ہے رابرٹ اسمتھ۔ امریکن اخبار نویس ہوں۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' لڑکی نے بڑی شستہ انگریزی میں جواب دیا۔ ''میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے اور میرا نام محمودہ اکبر علی ہے۔ میں لندن جا رہی ہوں۔ لائبریرین کا ڈپلوما لینے۔''

رابرٹ نے دوسرے ساتھیوں کا تعارف بھی کرا دیا۔ ''یہ ہیں ہریش دیسائی جو بمبئی یونی ورسٹی سے اکنامکس میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے کرنے کے بعد لندن اسکول آف اکنامکس سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری لینے جا رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں۔''

محمودہ نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

"اور یہ ہیں سلیم احمد خاں جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے باٹنی BOTANY میں ایم۔ایس سی کی ڈگری لی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے اگیری کلچر ڈپارٹمنٹ میں............"

لیکن وہ باقی تفصیلات نہ بتا سکا کیونکہ محمودہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ایک ہاتھ اٹھا کر سلیم کو آداب عرض کیا اور پھر بولی۔ "تو آپ نے علی گڑھ سے ایم۔ایس سی کیا ہے۔کون سے برس؟"

"تین برس ہو گئے۔اب تو سرکاری ملازم ہوں۔کیا آپ نے بھی علی گڑھ میں تعلیم پائی ہے۔"

"جی ہاں۔اسی سال ایم۔اے کیا ہے۔انگلش لٹریچر میں۔"

"تو آپ مسز حیدر کو جانتی ہیں۔"

"ضروری بات ہے۔وہ میری پرنسپل تھیں۔"

"اور محمود صاحب کو۔"

"وہ مجھے انگریزی پڑھاتے تھے۔

"تو آپ وہیں تھیں جب کئی برس ہوئے گرلز کالج میں لڑکیوں نے ہنگر اسٹرائک کیا تھا۔"

"بدقسمتی سے میں ہی اس اسٹرائک کی لیڈر تھی۔"

اور ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے دو علی گڑھ والوں کی سمندر کے بیچ میں جہاز پر یہ ملاقات کوئی اتفاق یا حادثہ نہ ہو بلکہ اس میں قسمت کی ستم ظریفی کا کوئی خاص کھیل ہو اور کچھ دیر کے لیے وہ دونوں دیبائی اور رابرٹ کو بھول کر ایک دوسرے سے علی گڑھ کے بارے میں سوال جواب کرتے رہے۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں کہ محمود صاحب تو اب چیئرمین ہو گئے ہیں۔"

"اور لائبریرین بشیر صاحب۔ان کا کیا حال ہے۔؟"

"اور ہماری چنی آپا کو تو آپ جانتے ہوں گے۔جنہیں سب شکیلہ توپ کہتے تھے۔اب تو وہ مسز نصیب الرحمٰن ہو گئی ہیں۔"

"ارے! وہ نصیب جو جغرافیہ میں لکچرار ہے۔وہ تو میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔سنا ہے بالکل گنجا ہو گیا ہے۔"

جیسے جادو کی ڈبیا ایک اور ڈبیا میں ہوتی ہے۔اور اس میں ایک اور...... یہاں تک ستائیس

ڈبیاں ایک دوسرے میں بند ہوتی ہیں اور ان سب کے اندر جو ڈبیا بند ہوتی ہے اس میں کالے دیو کی روح قید ہوتی ہے............ جس طرح پیاز کے چھلکے کے نیچے ایک اور چھلکا ہوتا ہے اور اس کے نیچے ایک اور، اور اس کے نیچے ایک اور، چھلکے کے اندر چھلکا، یہاں تک کہ اندر کچھ نہیں رہتا۔ سوائے پیاز کی بو اور آنکھوں میں آنسو لانے والی 'جھل' کے...... اسی طرح اس دنیا میں کتنی ہی اور دنیائیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ایک الگ دنیا ہے۔ مگر اس وقت سلیم اور محمودہ اس جہاز میں ہوتے ہوئے بھی اس دنیا سے دور ایک اور ہی دنیا میں ہیں اور اس دنیا کا نام علی گڑھ ہے۔ جو ایک قصبہ ہے۔' ایک یونی ورسٹی ہے۔ ایک ماحول ہے، ایک روایت ہے اور ایک ایسا نشہ ہے جو ایک بار چڑھ جائے تو وہ کبھی نہیں اترتا۔

جہاز اپنی مقررہ رفتار سے فاصلہ طے کرتا ہے لیکن انسانی رشتے اور تعلقات گھڑی یا سنگ میل کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ اپنی رفتار سے اور اپنے ڈھنگ سے جذبات کے فاصلوں کو طے کرتے ہیں۔ جب باتیں کرتے کرتے سلیم اور محمودہ تھک گئے تو انھوں نے دیکھا کہ نہ صرف رابرٹ اور دیسائی اپنے اپنے کیبن میں جا چکے ہیں بلکہ سارا ڈائننگ حال خالی ہے اور بیرے میزوں پر شام کی چائے کے لیے پیالیاں لگا رہے ہیں اور ان دونوں کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ برسوں سے ہم باتیں کرتے رہے ہیں اور برسوں باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

(4)

''وقت کیا ہے؟'' محمودہ نے ایرپورٹ کے ویٹنگ ہال نمبر بارہ کی گھڑی میں دیکھا کہ اسے آئے صرف دس منٹ ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ کے سب مسافر پاسپورٹ اور کسٹم کا معائنہ کرا کے اپنے اپنے گھر جا چکے ہیں۔ اب ویٹنگ ہال بالکل خالی ہے۔ صرف میں ہوں۔ اس نے سوچا میں ہوں اور وقت ہے۔ اس گھڑی کی ٹک ٹک ہے۔ پانچ بج کر چودہ منٹ اور سولہ سیکنڈ۔ نہیں سترہ سیکنڈ۔ اٹھارہ سیکنڈ...... انیس سیکنڈ اور شیشے کی دیوار میں سے وہ دیکھ سکتی ہے کہ ویٹنگ ہال نمبر گیارہ کی گھڑی میں بھی یہی وقت ہے۔

گھڑیاں الگ الگ ہیں مگر وقت ایک ہے۔ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں۔ دونوں میں بجلی کا

کنکشن ہے نا۔ ایسا ہی کوئی طلسمی تعلق کیا انسانوں میں بھی ہوتا ہے؟ کیا ان کے دلوں کی گھڑیاں بھی کسی ریڈیائی یا ایٹمی اثر سے ہم آہنگ رہتی ہیں؟

آخر وقت کا راز کیا ہے؟ اس نے سوچا۔ اس وقت شام کے پانچ بج کر چودہ منٹ اٹھائیس سیکنڈ ہوئے ہیں۔ میں لندن ائیر پورٹ میں سلیم کے پلین کا انتظار کر رہی ہوں۔ باہر برف گر رہی ہے لیکن ابھی ابھی چند لمحے ہوئے میں ایس۔ ایس ملتان میں تھی اور سلیم سے پہلی ہی ملاقات میں علی گڑھ کی باتیں کر رہی تھی میں یہاں بھی ہوں۔ میں وہاں بھی ہوں۔ اب بھی ہوں۔ جب بھی ہوں۔ حال میں بھی ہوں۔ ماضی میں بھی ہوں۔ میں ماضی میں ہوں اور ماضی مجھ میں ہے۔ جیسے بیج میں پیڑ ہوتا ہے اور پیڑ میں بیج ہوتا ہے۔ جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے اور بچے کے جسم میں دوسری ماؤں کی پیدائش کا بیج ہوتا ہے۔

تو پھر میں سلیم کا انتظار کیوں کر رہی ہوں؟ وہ تو میرے پاس ہی ہے۔ ابھی ابھی وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے؟ نہیں اس نوجوان لڑکی سے جو شیشے میں سے مجھے گھور رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ سمجھتی ہے میں اس کی رقیب ہوں۔ اور وہ سلیم کو اپنی مخصوص ملکیت سمجھتی ہے۔ تو یہ لڑکی جو میرا ماضی ہے حال میں کیسے آ گئی۔ اور اگر وہ وقت کی سرحدوں کو پھلانگ کر انیس سو انسٹھ میں آ سکتی ہے۔ تو میں بھی ویلز کی ٹائم مشین میں بیٹھ کر پندرہ سولہ برس واپس جا سکتی ہوں۔!

ٹائم مشین۔ ویلز کے تخیل کی پیداوار کا بٹن دبایا اور الٹے پاؤں ماضی کی طرف دوڑ پڑے۔ بیسویں صدی سے پندرہویں، پانچویں، پہلی صدی میں پہنچ گئے۔ دوسرا بٹن دبایا اور وقت کے میدان میں آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اکیسویں، بتیسویں، چالیسویں صدی میں پہنچ گئے۔ مگر ہر انسان کے اپنے دماغ میں بھی تو ایک ٹائم مشین لگی رہتی ہے۔ جو اس کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور جس پر سوار ہو کر انسان جب چاہے مستقبل کے آسمانوں میں پرواز کرنے لگتا ہے اور جب جی چاہے اپنے ماضی کے تنگ و تاریک مگر جانے بوجھے گلی کوچوں میں گھوم آتا ہے۔

(5)

ایس۔ ایس ملتان اب عدن سے ہو کر بحیرۂ احمر کی تنگ آبنائے میں داخل ہو رہا ہے۔

جہاز پر اور خصوصاً ٹورسٹ کلاس کے چھوٹے چھوٹے کیبنوں میں حد درجے کی گرمی ہے۔ سارے مسافر جتنا وقت ممکن ہوتا ہے ڈیک پر گذارتے ہیں۔ اس تیرتی ہوئی دنیا کی ساری آبادی ٹکڑیوں میں اور جوڑیوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ دیسائی کی دوستی دو چینی طالب علموں سے ہوگئی ہے، جو اس کی طرح لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھنے جا رہے ہیں۔ چانگ چن اور میمی ماؤلنگ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ایک ہانگ کانگ سے آیا ہے اور دوسری پیکنگ سے۔ دن بھر یہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے رہتے ہیں اور دیسائی اور چانگ چن بیئر کے لاتعداد گلاس پیتے ہیں اور میمی کافی پیتی رہتی ہے اور تینوں ایشیا کے اقتصادی اور سیاسی مستقبل کے بارے میں بحث مباحثہ کرتے رہتے ہیں کیونکہ میمی کیمونسٹ خیالات کی ہے اور چانگ چن کیمونزم کا شدید مخالف ہے اور دیسائی کبھی ان میں سے ایک سے اتفاق کرتا ہے کبھی دوسرے سے۔

رابرٹ کی ملاقات ایک نوجوان امریکن لڑکی سے ہوگئی ہے جو کراچی سے جہاز پر سوار ہوئی تھی۔ اس لڑکی کا نام سلویا ٹامسن ہے اس کے بال سنہری ہیں اور اس کی آنکھیں نیلی ہیں اور اس کی ریشمی جرابوں میں ملبوس بلکہ ملفوف ٹانگیں سڈول ہیں۔ وہ شکاگو کی رہنے والی ہے مگر اس نے لڑکیوں کے مشہور واسر کالج میں تعلیم پائی ہے اور یہ کالج نیو یارک سے سو میل پر ہڈسن ندی کے کنارے پوکیپسی کے قصبے میں واقع ہے جو رابرٹ کا وطن ہے۔ اس لیے رابرٹ کے لیے سلویا ایک خوب صورت لڑکی ہی نہیں ہے۔ اس کے وطن کی یاد ہے۔ اس کے بچپن اور جوانی کی صدائے بازگشت ہے۔ اس کو دیکھ کر، اس کی آواز سن کر رابرٹ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اس نے پھٹے ہوئے کارکی خاکی قمیض اور میلا خاکی نیکر پہننا چھوڑ دیا ہے اور سفید براق قمیض اور پتلون پہنے نظر آتا ہے۔ سلویا جو کالج سے ڈگری لے کر شکاگو کے ایک چھوٹے سے ہفتہ وار اخبار کی نمائندہ اور فوٹو گرافر کی حیثیت سے دنیا کا سفر کر رہی ہے۔ رابرٹ جیسے مشہور جرنلسٹ اور مصنف سے مل کر خوش بھی ہے اور مرعوب بھی ہے اور بار بار کہتی رہتی ہے۔

''میں سچ مچ خوش قسمت ہوں کہ اس سفر میں بین الاقوامی سیاست پر مجھے مسٹر اسمتھ سے اتنا کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا۔''

اور رابرٹ ہنس کر کہتا ہے۔

''اگر تم نے مجھے ایک بار بھی پھر مسٹر اسمتھ کہا تو میں تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

عدن پہنچتے پہنچتے سلویا اسے رابرٹ کہہ کر بلانے لگی ہے اور شام کو جب سمندر میں غروب آفتاب کا منظر ہوتا ہے تو وہ دونوں ڈیک کے کٹہرے کے سہارے دیر تک کھڑے اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے سیاہ خاکے شام کے دھندلکے میں گھل جاتے ہیں اور سلویا کا نرم و نازک گورا گورا ہاتھ رابرٹ کے بڑے سخت اور نو برس تک ایشیا کی دھوپ میں سنولائے ہوئے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے۔

اور محمودہ سوچتی ہے یہ امریکن اپنے جذبات کے اظہار میں کتنے بے تکلف اور جلد باز ہوتے ہیں۔

سلیم سے اس کی ملاقات کو ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا ہے وہ دن کا کافی حصہ ڈیک پر ساتھ گذارتے ہیں۔ دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں لیکن وہ اب بھی اسے سلیم صاحب ہی کہتی ہے۔

سلیم بھی اسے ابھی تک ''آپ'' کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہے۔

محمودہ کو وہ لوگ بالکل نہیں بھاتے جو ایک دو ملاقاتوں میں بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ علی گڑھ میں اسے ایسے کئی نوجوانوں سے واسطہ پڑا اور ان کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

وہ خوش ہے کہ سلیم ایسے چھچھورے لوگوں میں سے نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں رابرٹ اور سلویا کو بے تکلفی کے انداز سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ڈیک پر ٹہلتے دیکھ کر اس کے دل میں رشک کی ایک ہلکی سی لہر چپکے سے دوڑ جاتی ہے۔ نہ جانے کیوں۔ اور یہ وہ راز ہے جو وہ اپنے آپ سے بھی چھپائے ہوئے ہے۔

اور پھر سوئیس کی بندرگاہ آ گئی اور کتنے ہی مسافروں نے سوچا کہ جہاز تو نہر سویز میں سے رینگ رینگ کر پورے دن بھر میں اسکندریہ پہنچے گا اور پھر وہاں چوبیس گھنٹے قیام کرے گا۔ اس عرصہ میں کیوں نہ وہ قاہرہ کی سیر کر آئیں اور جب سلیم نے محمودہ کو بتایا کہ رابرٹ، سلویا، اور دیسائی کے دونوں چینی دوست۔ چانگ چن اور سیمی بھی قاہرہ کی سیر کو جا رہے ہیں تو وہ بھی فوراً تیار ہو گئی۔

خرچہ بچانے کے لیے انھوں نے مل کر دو ٹیکسیاں کر لیں۔ ایک میں رابرٹ، سلویا اور دیسائی۔ دوسری میں سلیم اور محمودہ اور میمی پچھلی سیٹ پر۔ اور چانگ چن ڈرائیور کے پاس اگلی سیٹ پر لیکن راستہ بھر چانگ چن مڑ مڑ کر میمی سے باتیں کرتا رہا۔ بات چیت کے دوران ان دونوں کے درمیان ایک جذباتی برقی رو کا احساس ہوا اور اس نے معنی خیز نگاہوں سے بیچ میں بیٹھے ہوئے سلیم کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔'' دیکھتے ہو میمی اور چانگ چن کیسے محبت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔'' اور سلیم کی نگاہوں نے مسکرا کر خاموشی سے جواب دیا۔'' اچھی بات ہی ہے نا۔؟''

پندرہ برس کے بعد کوشش کرنے پر بھی محمودہ کو یاد نہ آیا کہ سوئیس سے قاہرہ تک اور قاہرہ کے شہر میں اور قاہرہ سے اسکندریہ تک انھوں نے کیا کیا دیکھا۔ لیکن آپ ہی آپ نہ جانے کیوں بائیں گال پر اسے ایک خوشگوار چبھن محسوس ہونے لگی۔ جیسے رات کے اندھیرے میں ٹیکسی ٹھنڈے صحرا میں سے گزر رہی ہو۔۔۔ اور وہ دفعتاً اس احساس کے ساتھ بیدار ہو گئی کہ اس کا سر سلیم کے کھردرے ٹوئیڈ کے کوٹ کے کندھے پر ہے اور سلیم کا دایاں بازو اس کی گردن کے نیچے تکیے کا کام دے رہا ہے اور اتنے عرصے کے بعد بھی وہ یہ یاد کر کے مسکرا دی کہ جب قاہرہ پہنچ کر وہ ہوٹل میں اترے تو سلیم کا بازو سُن ہو چکا تھا۔

اور اس یاد کے ساتھ قاہرہ کے قیام کی کئی اور یادیں بھی اس کے ذہن کی تہہ میں بیدار ہو گئیں۔

وہ سب ایک نائٹ کلب میں ہیں جو ایک شاہی خیمے کی طرح سجایا گیا ہے اور جہاں وہ میز کرسیوں کی بجائے دیوار سے لگے مصری دیوانوں پر بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے پیتل کے نقشین تھالوں میں مصری کھانا لگا ہوا ہے۔ جسے انگریز' صاحبوں' کے علاوہ (جو وہاں بھی کانٹے چھری استعمال کر رہے ہیں) باقی سب ٹورسٹ ہنس ہنس کر ہاتھ سے کھا رہے ہیں۔ وہ ساتوں ہیں اور رابرٹ کا ایک نوجوان عرب دوست احمد رؤف ہے۔ جو شام کی کسی ترقی پسند بلکہ شاید انقلابی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی ہے جس کا نام کارلا ہے اور پھر چھت میں لگے ہوئے فانوس کی روشنی دھیمی پڑنے لگی اور خیمے کے دوسرے کنارے پر

بنے ہوئے ایک چھوٹے سے اسٹیج پر دفعتاً روشنی کے ایک دائرہ میں کلیوپٹرا زندہ ہوگئی۔ اپنے تمام کلاسیکی حسن اور شاہی وقار و دبدبے کے ساتھ۔ پہلے تو محمودہ سمجھی کہ اسٹیج پر کلیوپٹرا کا کوئی بت رکھا ہوا ہے۔ لیکن پھر اسی ''بت'' کے اعضا میں حرکت ہونے لگی اور کلیوپٹرا اپنے حسین جسم کا مظاہرہ کرنے لگی۔ مگر اب وہ کلیوپٹرا نہیں تھی۔ مصر کی ملکہ نہیں تھی۔ شاہی وقار اور دبدبے کو اس نے اپنے حریری لبادے کے ساتھ اتار پھینکا۔ اب اس کا جسم آدھے سے زیادہ برہنہ تھا اور اس کی روح بالکل مادرزاد ننگی تھی۔ اس کی ہر ادا اور جنبش میں عریانی ہی عریانی تھی۔ محمودہ جس نے ایک پردہ دار گرلز کالج میں تعلیم پائی تھی یہ نظارہ دیکھ کر بوکھلا گئی شرم کے مارے اس کے گال تمتمانے لگے۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا اور اس کی ہمت نہ پڑی کہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے سلیم کی طرف دیکھ سکے کہ بے حیائی کے اس نظارے کا ردعمل اس پر کیا ہو رہا ہے۔

''تو یہ ہے نیا مصر اور اس کا تمدن؟'' رابرٹ نے دانت بھینچ کر احمد رؤف کے کان میں کہا۔

اور احمد رؤف نے کالے کڑوے مصری قہوے کی پیالی کو ایک گھونٹ میں پی کر جواب دیا۔ ''یہ ہے شاہ فاروق کا مصر اور وہ تمدن جو فاروق ہر سال پیرس کے ناچ گھروں اور قحبہ خانوں سے سیکھ کر آتا ہے۔''

اور میمی نے چانگ چن کی طرف چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

''یہ ناچ کوئی خاص مصر کی مونوپلی نہیں ہے۔ یہ تو سرمایہ داری نظام کی علامت ہے۔ شنگھائی میں بھی اس قسم کے ناچ دیکھے جا سکتے ہیں۔!''

اب رقاصہ ان کے سامنے کھڑی اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کا بدن ناگن کی طرح بل رہا تھا۔ موسیقی کی لے تیز ہوگئی اور محمودہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ بازوؤں اور سینے اور کولہوں کی بجائے رقاصہ اب صرف اپنے پیٹ اور کمر کو ایک عجیب انداز سے ہلا رہی ہے بلکہ کولہو کی طرح پیل رہی ہے۔ جیسے اسے مرگی کا دورہ پڑ رہا ہے۔ مگر یہ جنون مقصدی تھا اور محمودہ کو محسوس ہوا کہ جتنے بھی لوگ وہاں بیٹھے ہیں ان کی نگاہیں اس رقاصہ کے برہنہ پیٹ پر رقص کر رہی ہیں۔ اس کو گدگدا رہی ہیں اور ان نگاہوں کی گدگداہٹ کی لذت آمیز کرب سے بے قابو ہو کر رقاصہ کا درمیانی جسم مچل رہا ہے، بل کھا رہا ہے، سکڑ رہا ہے، ابھر رہا ہے، تھرک رہا ہے، دھڑک رہا ہے،

تڑپ رہا ہے۔ جیسے مچھلی جال میں تڑپتی ہے۔ جیسے مینڈک ڈی سیکٹنگ بورڈ پر بے ہوش ہونے سے پہلے تڑپتا ہے۔ محمودہ نے انٹرمیڈیٹ میں سائنس کا میڈیکل کورس لیا تھا کیونکہ اس وقت وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور دفعتاً اسے زولوجی کا اپنا پہلا پریکٹیکل یاد آ گیا۔ جب اسے مینڈک کو الٹا لٹا کر اس کے چاروں پیروں کو کیلوں سے بورڈ میں پیوست کر کے اس کا پیٹ چاک کرنا پڑا تھا۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ متلی سے بے قابو ہو کر باتھ روم کی طرف بھاگ گئی تھی اور صبح کیا ہوا ناشتہ الٹی ہو کر نکل گیا تھا۔ اس وقت مصری رقاصہ کا یہ 'پیٹ کا ناچ' دیکھ کر اس کی پھر وہی حالت ہوئی اور وہ واش بیسن تک پہنچی ہی تھی کہ قے ہو گئی۔

یہ سمجھ کر کہ محمودہ کو کھانے میں کوئی چیز ناموافق آئی ہے۔ وہ سب نائٹ کلب سے اٹھ آئے تھے مگر سلیم اصلی وجہ بھانپ گیا تھا اور راستے میں اس نے محمودہ سے کان میں کہا۔

''وہ ناچ دیکھ کر تو میرا بھی جی متلا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ضبط کیا۔''

اور پھر اگلے دن جب وہ قاہرہ کا عجائب گھر دیکھنے گئے تو مصر کی قدیم تہذیب کے نادر نمونے دیکھ کر وہ سب دنگ رہ گئے۔ سلیم کہنے لگا۔

''اور ہم ہندوستانی سمجھتے ہیں کہ ہم سے پرانی تہذیب ہی کسی ملک کی نہیں ہے۔!''

اور اس پر رابرٹ نے کہا۔

''تمھاری موہنجوداڑو کی تہذیب تو پھر تقریباً اتنی ہی پرانی ہے لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ یورو پروپیین جو دو ہزار سال پہلے بدن پر جانوروں کی کھالیں لپیٹے گھومتے تھے۔ مصر اور ہندوستان اور چین کو تہذیب و تمدن سکھانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور پھر ہم امریکن ہیں جو دنیا کی تاریخ میں ابھی گویا طفلِ مکتب ہیں مگر ہم قوم کو سبق دینے کے لیے تیار ہیں۔''

اس عجائب گھر کے ایک کمرے میں انھوں نے توتن خامن اور قدیم مصر کے بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی ممیاں دیکھی تھیں۔ ہزاروں برس گزرنے کے بعد بھی لاشوں کے خدو خال پہچانے جاتے تھے۔ ان پر لپٹی ہوئی پٹیوں کا کپڑا اب تک سالم تھا اور ایک شہزادی کے گلے میں ایک ہار پڑا تھا جس کے پھول صدیوں کے بعد زرد پڑ گئے تھے۔ راکھ ہو گئے تھے لیکن پھر بھی وہ پھول تھے۔

ان ممیوں کو دیکھ کر ان کے گروہ میں سے ہر ایک کا ردعمل اس کے کردار اور خیالات کا آئینہ تھا۔

سلویا نے کہا۔

''جی! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ آج رات کو خواب میں ان سب کے بھوت مجھے ستائیں گے۔''

رابرٹ نے کہا۔

''سلویا ڈارلنگ۔ یہ کیا حماقت ہے۔ سائنس اور عقل کے اس دور میں تم جن بھوتوں سے ڈرتی ہو۔؟''

میمی ماؤ لنگ نے کہا۔

''شہنشاہ اور بادشاہ ابدیت حاصل کرنے کی جتنی بھی کوشش کریں، اپنے سنگ مرمر کے مجسمے کھڑے کرائیں یا اپنی لاشوں کی ممیاں بنوائیں ان کا دور ختم ہو چکا ہے اور واپس نہیں آ سکتا۔''

جس پر چانگ چن نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔

''روس میں بھی تو لینن کی ممی رکھی ہوئی ہے۔ اسی ابدیت کی تلاش میں۔''

دیسائی نے کہا۔

''شریر فانی ہے۔ اس لیے جلا دیا جاتا ہے۔ صرف آتما امر ہے۔!''

احمد رؤف نے اپنی گھنی سیاہ بھویں پھڑکاتے ہوئے کہا۔

''ماضی پرستی کی بیماری عام ہے۔ کہیں مادہ پرستی ہے۔ ہمارے ہاں قبر پرستی ہوتی ہے۔''

''مگر—!'' سلیم نے کہا۔'' تم لوگ تو فلسفہ بگھارنے لگے۔ اس پر کسی نے غور نہیں کیا کہ نوجوان شہزادی کے سوکھے ہوئے، پچکے ہوئے چہرے میں اور اس کی بوڑھی دادی کی لاش میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ممی بنانے والوں کے کمال کے باوجود اس کا حسن مٹی میں مل گیا۔ اس کے باپ کی تمام دولت— ہیرے، جواہرات، زیور، محلات سب مٹی میں مل گئے۔ کسی چیز کا نشان باقی نہیں لیکن ان پھولوں کو دیکھو جو اس کی موت پر کسی چاہنے والے نے چڑھائے تھے۔ وہ اب تک باقی ہے۔''

''ہاؤ رومانٹک—!'' سلویا جلدی سے بولی۔'' تو مسٹر خان آپ کا مطلب ہے کہ صرف محبت ہی لازوال ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' سلیم نے کہا۔ اور نہ جانے کیوں یہ کہتے ہوئے اس نے محمودہ کی طرف دیکھا۔

اور نہ جانے کیوں محمودہ کے گال تمتمانے لگے اور صرف اس نے ان میموں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔

(6)

''تو یہ بحرِ روم ہے۔'' محمودہ نے اسکول میں پڑھا ہوا جغرافیہ یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''ہائے اللہ! کتنا نیلا پانی ہے۔ بالکل جیسے سمندر نہ ہو۔ نیلی روشنائی سے بھری ہوئی بہت بڑی دوات ہو۔''

سلیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

محمودہ نے دیکھا کہ سلیم کے چمکیلے اور گھنے سیاہ بال سمندر کی ہوا سے پریشان ہو کر اس کی پیشانی پر آپڑے ہیں۔ مگر وہ اسی طرح افق کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ محمودہ نے سوچا یہ میرے دل کو کیا ہو رہا ہے۔ میں محمودہ اکبر علی ایم۔ اے ہوں۔ کوئی چودہ سالہ ہائی اسکول کی طالب علم نہیں ہوں کہ کسی پنجابی نوجوان کی گوری رنگت اور چمکیلے سیاہ بال کو دیکھ کر دل کی دھڑکن تیز ہو جائے۔ ہائے اللہ، وہ اتنے قریب کھڑے ہیں۔ اگر میں کچھ دیر بھی اور خاموش رہی تو کہیں وہ میرے دل کی حالت کو نہ بھانپ لیں۔ کچھ بھی بات تو کرنی چاہیے۔

(اور کئی برس بعد سلیم نے اسے بتایا تھا کہ اس لمحے میں وہ افق پر ٹکٹکی بندھے اس لیے دیکھ رہا تھا کہ کہیں اس کی آنکھوں میں محمودہ اس کے ان جذبات کو نہ دیکھ لے جو وہ اتنے دن سے اپنے آپ سے بھی چھپائے ہوئے تھا۔)

''کیا آپ نے عربی پڑھی ہے۔؟'' محمودہ نے یونہی سوال کیا۔

''بچپن میں قرآن حفظ کرایا گیا تھا۔ اور انجمن حمایت اسلام ہائی اسکول میں چھٹی جماعت تک عربی پڑھی تھی لیکن اسے عربی کی تعلیم نہیں کہہ سکتے۔ مولوی صاحب کہتے، سلیم اس فقرے کا عربی میں ترجمہ کرو۔ اونٹ کی رسی ٹوٹ گئی، اونٹ بھاگ گیا۔ تو آپ جانتی ہیں میں کیا ترجمہ کرتا تھا۔؟''

اور اب اس کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں نے اتنی دیر میں پہلی بار محمودہ کی طرف دیکھا اور محمودہ نے سوچا کتنی عجیب آنکھیں ہیں یہ۔ جب جی چاہے اتنی گہری سوچ میں ڈوب جاتی ہیں۔ جیسے اتھاہ سمندر اور جب جی چاہتا ہے ہنسنے لگتی ہیں جیسے سمندر کی سطح پر صبح کی کرنیں چمک رہی ہوں۔

''کیا ترجمہ کرتے تھے؟ بتایئے نا۔''

''ال اونٹو۔ الرسی ٹونٹو۔ ال اونٹو بھاگو۔''

اور یہ عجیب دغریب عربی سن کر وہ ہنس پڑی تھی۔ اور اس کو ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنس پڑا تھا۔ اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر وہ دونوں دیر تک ہنستے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ڈیک پر دوسرے مسافر جو ٹہل رہے تھے۔ وہ مسکرا کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ اور رابرٹ اور سلویا جو فوجیوں کی طرح قدم سے قدم ملائے ڈیک کے چکر لگا رہے تھے۔ ان کے پاس آ کر کہنے لگے۔ یہ کیا مذاق ہے۔ ہم کو بھی تو بتاؤ۔''

(اور برسوں کے بعد سلیم نے اقرار کیا تھا کہ وہ جھوٹ موٹ کا عربی ترجمہ اس نے اسی وقت ایجاد کیا تھا، صرف محمودہ کو ہنستے ہوئے دیکھنے کی خاطر۔'' تم اتنی سنجیدہ اور اپنے آپ کو لیے دیئے رہتی تھیں کہ ہر روز میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات کروں کہ ایک بار تم کھلکھلا کر ہنس پڑو۔'' تب محمودہ نے پوچھا۔'' اور جب میں ہنس پڑی تو تم نے کیا سوچا تھا۔؟ یہی نا کہ یہ لڑکی بالکل چھچھوری نکلی۔ خواہ مخواہ سنجیدگی کا پوز بنائے ہوئے تھی۔؟'' اور سلیم نے کہا ''نہیں۔۔۔ میں نے سوچا تھا کہ محمودہ کے دانت کتنے خوب صورت ہیں۔ اور جب وہ ہنستی ہے تو اس کے گالوں کے گڑھے اتنے خوب صورت لگتے ہیں۔ اتنے خوب صورت لگتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ان کو چوم لوں۔'' اور بارہ برس کے بعد ان الفاظ کو یاد کر کے محمودہ کے ہاتھ آپ سے آپ ان گڑھوں کو محسوس کرنے کے لیے اپنے گالوں تک پہنچ گئے۔)

سو اس شام کو جو مارسیلز پہنچنے کی شام تھی وہ نہ جانے کتنے گھنٹے وہیں ڈیک پر کھڑے رہے۔ سورج نیلے سمندر میں ڈوب گیا۔ چھٹی یا ساتویں رات کا چاند نکل آیا اور پیچھے جہاں جہاز پانی کو کاٹتا جا رہا تھا، جھاگوں کی بنی ہوئی سڑک چاندنی میں ایسے چمک اٹھی جیسے دور تک کسی حسینہ کا سفید لیس کا دوپٹہ پھیلا ہوا ہو۔ ڈنر کی گھنٹی بجی۔ ڈیک پر سے سب مسافر کھانا کھانے نیچے

ڈائننگ روم میں گئے اور گھنٹہ بھر بعد ان میں سے اکثر واپس آ گئے۔ مگر سلیم اور محمودہ وہیں ڈیک پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔

محمودہ نے بتایا کہ وہ میرٹھ کی رہنے والی ہے۔ اس کے باپ وہاں کے اچھے مشہور بیرسٹر تھے لیکن کئی برس ہوئے ان کا انتقال ہو گیا اور اس وقت سے اس کی والدہ سب بچوں کو لے کر علی گڑھ ہی میں رہتی ہیں کیونکہ سب وہیں پڑھتے ہیں اور اس طرح بورڈنگ ہاؤس کا خرچ بچ جاتا ہے۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے دو بھائی ہیں۔ ایک کالج میں پڑھتا ہے اور ایک اسکول میں اور تین بہنیں ہیں۔ وہ سب گرلز کالج اور اس کے اسکول میں پڑھتی ہیں۔ ابا نے جو روپیہ اور جائیداد چھوڑی تھی۔ اس سے کوئی دو سو روپے کی آمدنی ہے۔ بڑی مشکل سے گذارہ ہوتا ہے۔ میں نے تو وظیفے لے لے کر یہاں تک پڑھا ہے۔ اب بھی گورنمنٹ اسکالرشپ لے کر جا رہی ہوں۔"

"مگر یہ لائبریرین کا کورس آپ نے کیوں منتخب کیا۔ کوئی اور ڈگری کیوں نہیں لیتیں۔؟"

"نہ جانے کیوں مجھے لائبریرین کا کام سب سے اچھا لگتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ہمارے ملک میں تعلیم اتنی کم ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق اتنا کم ہے۔ آج نہیں تو کل سارے ملک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لائبریریوں کی ضرورت ہوگی۔ اسی وقت کے لیے میں اپنے آپ کو تیار کر رہی ہوں۔

اور سلیم نے بتایا کہ وہ لاہور کا رہنے والا ہے اور اس کے باپ میجر کلیم احمد خاں پچھلے سال ہی فوج سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بڑا بیٹا بھی ان کے نقش قدم پر چل کر فوج میں کمیشن کی کوشش کرے۔ مگر سلیم نے باٹنی میں ایم۔ ایس سی کرنے کے بعد اپنے لیے محکمۂ زراعت میں نوکری کرنا پسند کیا تھا۔ اور تین برس سے وہ شملہ کے ایک تجرباتی زراعتی فارم پر گیہوں اور آلو کی کاشت پر ریسرچ کر رہا تھا۔ "مگر آپ کو ان بیکار باتوں سے کیوں بور کروں" اس نے کہا تھا۔ "آپ کو گیہوں اور آلو سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔؟"

محمودہ نے جلدی سے جواب دیا۔

"نہیں۔ نہیں مجھے بہت دلچسپی ہے۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ گیہوں اگانا کوئی ایسا پیچیدہ

کام ہے جس میں ریسرچ اور تجربہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ معاف کیجئے گا۔ مجھ جیسی جاہل لڑکی تو یہی سمجھتی تھی کہ ہمارا معمولی کسان بھی جانتا ہے کہ گیہوں کیسے اگایا جاتا ہے۔؟''

''کم سے کم ہمارا کسان یہی سمجھتا ہے کہ اسے گیہوں اگانے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے اور یہی ہماری ٹریجڈی ہے۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ ہمارے ملک میں لاکھوں ٹن غلہ ہر برس گھن اور گیہوں کی دوسری بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔؟''

''گیہوں کی بیماریاں۔؟ کیا فصلوں کو بھی نمونیہ بخار ہوتا ہے؟''

بالکل ہوتا ہے۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ پالا اتنا سخت پڑا کہ پوری فصل ٹھٹھر کر رہ گئی۔ فصل کو سردی سے نمونیہ ہوتا ہے۔ گرمیوں میں آندھیوں کی لو بھی لگتی ہے۔ گیہوں کو دق بھی ہو سکتی ہے۔ جب کیڑے اندر ہی اندر اس کے ہر دانے کو کھا جاتے ہیں اور اسے دق کے مریض کے پھیپھڑوں کی طرح کھوکھلا کر دیتے ہیں۔''

اور کتنی ہی دیر تک سلیم گیہوں کے موضوع پر بات چیت کرتا رہا تھا۔ اور عمر میں پہلی بار محمودہ کو محسوس ہوا تھا کہ جو گیہوں کی روٹی وہ روز کھاتی ہے اس کو پیدا کرنے میں کتنے مختلف اور پیچیدہ مسائل الجھے ہوتے ہیں۔ پھر سلیم نے اسے بتایا تھا کہ اس کی زندگی کا یہی مشن ہے کہ وہ گیہوں کے بارے میں اتنا کچھ سیکھ جائے کہ ان بیماریوں کی روک تھام کر سکے جو ہر برس فصلوں کو تباہ کر کے ملک میں قحط ڈالتی ہیں۔'' اس مضمون پر اتنا کام کیا جا سکتا ہے۔ اور اتنا کام کرنا چاہیے کہ میرے جیسے درجنوں سائنٹسٹ بھی اس کام کے لیے نا کافی ہیں۔ جانتی ہوں روس میں ان لوگوں نے گیہوں کی ایسی قسم پیدا کی جو ان سرد علاقوں میں بھی پیدا ہو سکتا ہے جو سال میں چھ مہینے برف سے ڈھکے رہتے ہیں اور امریکہ اور کنیڈا میں ایسے فارم ہیں جو زراعت کے جدید طریقوں سے فی ایکڑ ہندوستان سے تین چار گنا زیادہ اناج پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہمارے کاشتکاروں کی حالت اچھی نہ ہوگی تو سیاسی آزادی سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ پیٹ میں روٹی ہوگی تبھی لوگ تعلیم کی طرف توجہ دیں گے۔ ورنہ آپ کی سب لائبریریاں خالی اور سنسان پڑی رہیں گی اور ان کی الماریوں میں کتابوں پر دھول جمی رہے گی۔''

اور دفعتاً محمودہ ہنس پڑی تھی۔

—

"کیا ہوا۔؟ آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟ میں گیہوں کے بارے میں اتنی بکواس کر کے آپ کو بور کر رہا ہوں۔اس لیے۔؟"

"نہیں۔نہیں۔ یہ بات نہیں۔مگر میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں اور آپ الگ الگ راستوں سے شاید ایک ہی جگہ پہنچنا چاہتے ہیں۔آپ اناج کی پیداوار بڑھانا چاہتے ہیں تا کہ لوگ کتابیں پڑھنے کے قابل بن سکیں اور میں لوگوں کو کتابیں پڑھانا چاہتی ہوں تا کہ سائنس اور نئے خیالات کی مدد سے وہ زیادہ اناج اگا سکیں۔ترقی کا کتنا اچھا فارمولا ہے۔گیہوں اور کتاب۔کتاب اور گیہوں۔مگر پھر بھی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔!"

"وہ کیا۔؟"

"کہ اگر آپ کو زراعت میں اتنی دلچسپی ہے۔اور آپ اناج کی پیداوار بڑھانے کے جدید طریقے سیکھنا چاہتے ہیں۔تو آپ انگلستان کیوں جا رہے ہیں۔ وہاں آپ کیا سیکھیں گے؟ آپ کو تو روس یا کینیڈا یا امریکہ جانا چاہیے تھا۔"

سلیم کے جواب کی چوٹ اتنے برسوں کے بعد اب بھی محمودہ محسوس کر سکتی تھی۔اس نے کہا تھا۔

"مگر میں امریکہ ہی تو جا رہا ہوں۔سلویا اور رابرٹ کے ساتھ کل مارسلیز پر میں بھی دوسرا جہاز بدلنے والا ہوں۔"

اور محمودہ کو ایسا لگا تھا جیسے سارا گہرا اندھیرا سمندر ایک دم لہر بن کر اس پر ٹوٹ پڑا ہو۔اور اس سمندری طمانچے سے اس کا گال ہی نہیں اس کی ساری ہستی ہی دیر تک جھنجھناتی رہی ہو۔

ایک پل میں مستقبل کی کتنی ہی جھلکیاں اس کے شعور میں بجلی کی طرح کوند گئیں۔

رابرٹ اور سلویا نیو یارک میں جہاز سے اکٹھے اتر کر سیدھے شادی کے رجسٹرار کے دفتر کی طرف جا رہے ہیں۔

لندن کے اسکول آف اکنامکس میں دیسائی اور میمی ماؤ ننگ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لکچر سننے اکٹھے جا رہے ہیں۔

امریکہ کے مڈویسٹ (وسط مغرب) کی کسی یونی ورسٹی کیمپس پر سلیم ایک سنہری بالوں والی

امریکن لڑکی کے ساتھ کھڑا ہنس رہا ہے اور دونوں محبت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہیں۔

اور وہ خود لندن کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہے۔ اور اس کی سنگت کے لیے بس شیلف میں موٹی موٹی کتابیں ہیں۔ اور گیس پر گنگناتی ہوئی چائے کی کیتلی ہے۔ اور قالین پر لیٹی اونگھتی ہوئی ایک کالی بلی ہے۔

(اور ایک برس بعد سلیم نے بتایا تھا کہ اس لمحے میں اس کا جی چاہا تھا کہ کچھ بھی کر کے اپنا امریکہ جانا منسوخ کر دے۔ انگلستان ہی کی کسی یونی ورسٹی میں داخلہ لینے کی کوشش کرے تاکہ محمودہ کے پاس رہ سکے۔'' پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟'' اور سلیم نے جواب دیا تھا'' اس لیے کہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو تمھاری نگاہوں سے گر جاؤں گا۔ تم مجھے نہایت گھٹیا قسم کا پیشہ ور عاشق سمجھو گی۔ پھر تم نہ میری عزت کرو گی اور نہ مجھ سے محبت۔'')

(7)

لندن ———!

دنیا کا سب سے گنجان شہر۔ اسّی لاکھ کی آبادی۔ اسّی لاکھ مرد عورتیں، بچے۔ اسّی لاکھ چیونٹیاں صبح سویرے اپنے اپنے سوراخوں سے نکلتی ہیں اور دن بھر کام کر کے رات ہوتے واپس اپنے اپنے سوراخوں میں بند ہو جاتی ہیں۔

سیاہ سڑکیں۔ دھوئیں اور دھند سے سنولائے ہوئے مکان 'ٹیوب' کی زمین دوز اندھیری سرنگیں۔ بم مارے ہوئے مکانوں کے کھنڈر، ہر شخص سیاہ کپڑوں میں ملبوس، ہر ایک کے پاس ایک کالی ہیٹ، ایک کالی چھتری، ہر وقت اندھیرا، ہر وقت بارش، بارش، بادل، دُھند، کہرا، اندھیرا، سردی۔ سردی، اندھیرا۔ تنہائی کی سردی، تنہائی کا اندھیرا۔

محمودہ کالج سے آکر گیس کی انگیٹھی کے پاس بیٹھی رہتی۔ چائے کی کیتلی کی گنگناہٹ اور لینڈ لیڈی کی کالی بلی کی خرخراہٹ سنتی رہتی اور سوچتی ہائے اللہ میں کہاں اور کس مصیبت میں پھنس گئی۔ اس سردی سے تو میری رگوں کا خون بھی جم جائے گا۔ اس تنہائی سے میں دیوانی ہو جاؤں گی۔

"کیا ہوا۔؟ آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟ میں گیہوں کے بارے میں اتنی بکواس کر کے آپ کو بور کر رہا ہوں۔اس لیے۔؟"

"نہیں۔نہیں۔یہ بات نہیں۔مگر میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں اور آپ الگ الگ راستوں سے شاید ایک ہی جگہ پہنچنا چاہتے ہیں۔آپ اناج کی پیداوار بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ لوگ کتابیں پڑھنے کے قابل بن سکیں اور میں لوگوں کو کتابیں پڑھانا چاہتی ہوں تاکہ سائنس اور نئے خیالات کی مدد سے وہ زیادہ اناج اگا سکیں۔ترقی کا کتنا اچھا فارمولا ہے۔گیہوں اور کتاب۔کتاب اور گیہوں۔مگر پھر بھی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔!"

"وہ کیا۔؟"

"کہ اگر آپ کو زراعت میں اتنی دلچسپی ہے۔اور آپ اناج کی پیداوار بڑھانے کے جدید طریقے سیکھنا چاہتے ہیں۔تو آپ انگلستان کیوں جا رہے ہیں۔وہاں آپ کیا سیکھیں گے؟ آپ کو تو روس یا کینیڈا یا امریکہ جانا چاہیے تھا۔"

سلیم کے جواب کی چوٹ اتنے برسوں کے بعد اب بھی محمودہ محسوس کر سکتی تھی۔اس نے کہا تھا۔

"مگر میں امریکہ ہی تو جا رہا ہوں۔سلویا اور رابرٹ کے ساتھ کل مارسلیز پر میں بھی دوسرا جہاز بدلنے والا ہوں۔"

اور محمودہ کو ایسا لگا تھا جیسے سارا گہرا اندھیرا سمندر ایک دم لہر بن کر اس پر ٹوٹ پڑا ہو۔اور اس سمندری طمانچے سے اس کا گال ہی نہیں اس کی ساری ہستی ہی دیر تک جھنجھناتی رہی ہو۔

ایک پل میں مستقبل کی کتنی ہی جھلکیاں اس کے شعور میں بجلی کی طرح کوند گئیں۔

رابرٹ اور سلویا نیویارک میں جہاز سے اکٹھے اتر کر سیدھے شادی کے رجسٹرار کے دفتر کی طرف جا رہے ہیں۔

لندن کے اسکول آف اکنامکس میں دیسائی اور میمی ماؤننگ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لکچر سننے اکٹھے جا رہے ہیں۔

امریکہ کے مڈ ویسٹ (وسط مغرب) کی کسی یونی ورسٹی کیمپس پر سلیم ایک سنہری بالوں والی

امریکن لڑکی کے ساتھ کھڑا ہنس رہا ہے اور دونوں محبت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہیں۔

اور وہ خود لندن کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہے۔ اور اس کی سنگت کے لیے بس شیلف میں موٹی موٹی کتابیں ہیں۔ اور گیس پر گنگناتی ہوئی چائے کی کیتلی ہے۔ اور قالین پر لیٹی اونگھتی ہوئی ایک کالی بلی ہے۔

(اور ایک برس بعد سلیم نے بتایا تھا کہ اس لمحے میں اس کا جی چاہا تھا کہ کچھ بھی کر کے اپنا امریکہ جانا منسوخ کر دے۔ انگلستان ہی کی کسی یونی ورسٹی میں داخلہ لینے کی کوشش کرے تاکہ محمودہ کے پاس رہ سکے۔'' پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟'' اور سلیم نے جواب دیا تھا'' اس لیے کہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو تمھاری نگاہوں سے گر جاؤں گا۔ تم مجھے نہایت پھٹیچر قسم کا پیشہ ور عاشق سمجھو گی۔ پھر تم نہ میری عزت کرو گی اور نہ مجھ سے محبت۔'')

(7)

لندن ـــــ!

دنیا کا سب سے گنجان شہر۔ اسی لاکھ کی آبادی۔ اسی لاکھ مرد عورتیں، بچے۔ اسی لاکھ چیونٹیاں صبح سویرے اپنے اپنے سوراخوں سے نکلتی ہیں اور دن بھر کام کر کے رات ہوتے واپس اپنے اپنے سوراخوں میں بند ہو جاتی ہیں۔

سیاہ سڑکیں۔ دھوئیں اور دھند سے سنولائے ہوئے مکان 'ٹیوب' کی زمین دوز اندھیری سرنگیں۔ بم مارے ہوئے مکانوں کے کھنڈر، ہر شخص سیاہ کپڑوں میں ملبوس، ہر ایک کے پاس ایک کالی ہیٹ، ایک کالی چھتری، ہر وقت اندھیرا، ہر وقت بارش، بارش، بادل، دُھند، کہرا، اندھیرا، سردی۔ سردی، اندھیرا۔ تنہائی کی سردی، تنہائی کا اندھیرا۔

محمودہ کالج سے آ کر گیس کی انگیٹھی کے پاس بیٹھی رہتی۔ چائے کی کیتلی کی گنگناہٹ اور لینڈ لیڈی کی کالی بلی کی خرخراہٹ سنتی رہتی اور سوچتی ہائے اللہ میں کہاں اور کس مصیبت میں پھنس گئی۔ اس سردی سے تو میری رگوں کا خون بھی جم جائے گا۔ اس تنہائی سے میں دیوانی ہو جاؤں گی۔

اور پھر ایک صبح اس نے پلنگ کے پاس کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھا کہ بارش کے بجائے نرم نرم روئی کے چھوٹے چھوٹے سفید گالے برس رہے ہیں۔ برف اور دروازے پر ڈاکیے کی گھنٹی سن کر اس کا دل نہ جانے کیوں دھڑک اٹھا۔ آج تو ہندوستان کی ڈاک آنے کا دن نہیں تھا۔ ایک لمبا نیلا لفافہ۔ ایک انجانے قلم سے اس کا پتہ لکھا ہوا۔ امریکہ کے ڈاک کے ٹکٹ۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے لفافہ چاک کیا۔ پتلے پتلے کاغذوں پر لکھا ہوا خط مگر اس سے کچھ پڑھا نہ گیا۔ لکھائی بہت مہین ہے۔ یا 'ہال' کے اکلوتے پیلے بلب کی روشنی بہت مدھم ہے۔؟ یا اس کی آنکھوں پر خوشی اور گھبراہٹ کے آنسوؤں کا پردہ پڑ گیا ہے؟ وہ اپنے کمرے میں آئی اور ٹیبل لیمپ جلا کر خط پڑھنے بیٹھی۔ "مائی ڈیر محمودہ' مائی ڈیر محمودہ۔ مائی ڈیئر محمودہ!! تین ہزار میل تک پھیلے ہوئے اٹلانٹک کے گہرے پانی میں آخر کار وہ کمبخت "مس اکبر علی" ڈوب گئی اور اس کی جگہ زندہ ہو گئی محمودہ۔ ڈیئر محمودہ مائی ڈیئر محمودہ! ہائے اللہ! باہر گرتی ہوئی یہ برف کتنی خوب صورت لگتی ہے۔

(اور پندرہ برس بعد ائیر پورٹ کی کھڑکیوں کے شیشوں میں سے وہ پھر برف گرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ جوانی کا زمانہ بھی کیسا عجیب ہوتا ہے جب ایک خط۔ صرف ایک خط کے آنے سے زندگی کا موسم بدل جاتا ہے۔ اور آج وہ خط کی بجائے خود آ رہا ہے اور دل کی وہ حالت نہیں۔ کیوں؟ کیا میرے دل کی رگوں میں خون کا دوران کم ہو گیا ہے؟ کیا عمر کے ساتھ ساتھ میرا احساس مدھم پڑتا جا رہا ہے؟ یا اتنے برسوں کی تنہائی اور مایوسی اور جدائی کے بعد خوشی کے تصور سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔)

محمودہ نے اسی دن خط کا جواب لکھا اور اس کے بعد امریکہ سے ہر ہفتہ خط آنے لگا۔ اور لندن کی سیاہ بدصورت عمارتیں اور بم شدہ کھنڈر برف کی سفید چمکیلی چادر میں چھپ گئے۔ پھر کرسمس آیا اور گرجوں میں گھنٹیاں بجیں اور سڑکوں پر بچے کیرول گاتے ہوئے پھرنے لگے اور انجانے لوگ بھی محمودہ کو راستہ چلتے مسکرا مسکرا کر 'ہپی کرسمس' اور 'میری کرسمس' کہنے لگے اور سفید بالوں والی، کرخت آواز والی لینڈ لیڈی کے چہرے کی جھریاں بھی مسکرانے لگیں اور اس نے محمودہ کے لیے کرسمس کیک اپنے ہاتھ سے تیار کیا اور پھر نیا سال آیا اور محمودہ نے پہلی بار اپنی ہلکی نیلی

بنارسی ساڑی نکالی اور زربفت کا بلاؤز پہنا اور لندن میں خریدے ہوئے اونی اوورکوٹ پر کشمیری کام کی شال اوڑھ کر کالج کے نیوایر ''ہال'' میں گئی اور جب اس کے ایک پروفیسر نے اصرار کیا تو اس نے پورٹ کا ایک گلاس بھی پی لیا اور پھر اس کو آرکسٹرا کی دھنیں بہت ہی اچھی لگیں اور اپنے ایک شرمیلے انگریز کلاس فیلو جیک ہومر کے ساتھ اس نے ڈانس بھی کیا اور کیونکہ اسے ڈانس کرنا نہیں آتا تھا اس لیے وہاں اپنی ساڑی میں الجھ کر گرنے لگی اور اس کے شرمیلے ساتھی کو اسے سہارا دینا پڑا اور پھر وہ خوب ہنسی۔ خوب ہنسی اور واپسی پر جب وہ انگریز لڑکا اسے ٹیکسی میں گھر واپس لایا تو انھوں نے راستے میں دیکھا کہ پکیڈلی روشنیوں سے جگمگا رہا ہے اور لال اور نیلے اور سبز اور پیلے قمقموں کی قطاریں ہر طرف دوڑ رہی ہیں اور اس وقت پکیڈلی کے رنگ برنگی لائٹ سے لکھے ہوئے برانڈی کے اشتہار بھی اسے بہت اچھے لگے اور پھر پکیڈلی کی بھیڑ میں ان کی ٹیکسی رک گئی اور سارے گرجاؤں کے گھنٹے بیک وقت بجنے لگے اور ٹیمز میں سارے اسٹیمروں کے سائرن بیک وقت بول پڑے اور پٹاخے چھٹنے لگے اور سڑک پر لوگ خوشی کے مارے ناچنے لگے اور جیک نے شرما کر کہا۔

''ہیپی نیوایر محمودہ۔'' اور جب محمودہ نے جواب دیا۔ ''ہیپی نیوایر جیک۔'' تو شرمیلے انگریز نوجوان نے جھک کر دھیرے سے ہندوستانی لڑکی کا گال چوم لیا اور پردہ دار گرلس کالج میں پڑھی ہوئی لڑکی بالکل خفا نہ ہوئی۔ صرف یہ سوچ کر مسکرا دی کہ جیک کے ہونٹ کتنے ٹھنڈے ہیں۔ بالکل ان انگریزوں کے سرد دلوں کی طرح اور اسی رات جب کہ پورٹ کی گرمی وہ اب بھی محسوس کر رہی تھی اس نے سلیم کو نئے سال کی مبارکباد کا ایک طویل خط لکھا۔ ''آج رات کو بارہ بجے میرے ایک انگریز کلاس فیلو نے ''ہیپی نیوایر'' کہہ کر میرے گال کو چوم لیا۔ اس کے ہونٹ بہت ٹھنڈے تھے۔ سلیم کاش وہ کسی اور کے ہونٹ ہوتے۔''

لیکن صبح کو خط ڈاک میں ڈالنے سے پہلے جب پورٹ کا اثر ختم ہو چکا تھا اس نے جب وہ سطریں پھر پڑھیں تو وہ اپنی بے حیائی پر شرما گئی اور اس نے پہلے ان سطروں کو قلم سے کاٹا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے سارا خط ہی پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور ایک نیا خط لکھنے بیٹھ گئی۔

(8)

فروری کے جاتے جاتے برف پگھلنے لگی اور ٹیمز کا پانی پھر چلنے لگا۔ مارچ آیا تو ٹھٹھرے ہوئے، خزاں کے مارے پیڑوں میں نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ ٹھنڈی اور تند ہوائیں آسمان سے بادلوں کو اڑا کر لے گئیں اور اپریل کی ملائم ملائم دھوپ میں ہر طرف لاکھوں کروڑوں شگوفے مسکرا اٹھے۔ سرپنٹائن ندی کے پتلے دھارے میں لمبی لمبی نازک نازک کشتیاں چلنے لگیں اور لندن کے ہر پارک میں سبزے کے قالین بچھ گئے۔ سینٹ جیمس پارک کے قدرتی تھیئٹر میں محمودہ نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ شیکسپیئر کے کتنے ہی ڈرامے دیکھ ڈالے اور اب اسے ایسا لگا کہ سورج کی زندگی بخش روشنی نے انگریزوں کے برفیلے دلوں کو بھی پگھلا دیا ہے۔ کالے کپڑوں کی بجائے اب رنگ برنگے فراک، رنگین چھتریاں، سفید پتلونیں، نیلے بلیزر، پیلی اور گلابی اور سرخ ٹائیاں نظر آنے لگیں۔ ''اوپن ایئر تھیئٹر'' میں سبزے پر بیٹھے ہوئے شیکسپیئر کے لازوال جملوں پر سر دھنتے ہوئے، ہنستے مسکراتے، چپس اور ''چسٹ نٹ'' اور آئس کریم کھاتے ہوئے یہ انگریز ان انگریزوں سے کتنے مختلف تھے۔ جو ہندوستان میں خاکی وردیوں، سولا ہیٹ HELMET اور ٹوپ ہیٹ اور مارننگ سوٹ اور ڈنر سوٹ میں جکڑ بند نظر آتے تھے اور جو اپنے چہروں پر ہر وقت شہنشاہی جاہ وجلال کا بھیانک پوز مسلط کیے رکھتے تھے۔

ایک دن محمودہ کی کلاس فیلو مارگریٹ نے کہا۔

''چلو آج ہائیڈ پارک چلیں۔''

محمودہ نے ہائیڈ پارک کے بارے میں بڑی خطرناک باتیں سنی ہوئی تھیں کہ اندھیرا ہوتے ہی وہاں ہوسناک شیطانوں کے غول کے غول منڈلاتے نظر آتے ہیں اور شریف لڑکیوں کی عزت خطرے میں ہوتی ہے لیکن مارگریٹ نے (جو ویلز کے ایک کان کن کی ہٹی کٹی بیٹی تھی اور اکنامکس میں ڈاکٹریٹ کے لیے برطانوی ٹریڈ یونین تحریک کی تاریخ پر تھیسس لکھ رہی تھی) اسے یقین دلایا کہ وہ اکیلی کتنے ہی بدمعاشوں کا مقابلہ کر سکتی ہے اور اس کے ساتھ اس کا ''بوائے فرینڈ'' مائیکل ہوگا اور ان دونوں کی موجودگی میں محمودہ کو کسی قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔ 'اور پھر' مارگریٹ نے اسے اطمینان دلایا ہم رات ہونے تک نہیں ٹھہریں گے۔ شام کو جلدی ہی لوٹ آئیں گے۔

اور سو وہ تینوں ہائیڈ پارک کورنر کے ٹیوب اسٹیشن سے نکل کر پارک کی طرف ہو لیے۔ اس دن محمودہ پیازی ساڑی پر ایک سرخ رنگ کا بغیر آستینوں کا سویٹر پہنے ہوئے تھی اور اس کے چمکیلے سیاہ بالوں میں گلاب کا ایک پھول لگا ہوا تھا جو چلتے وقت اس کی لینڈ لیڈی نے اسے گلدان میں سے نکال کر دیا تھا اور مارگریٹ بھی بڑے بڑے پھولوں کا ایک فراک پہنے ہوئے تھی اور ان دونوں کے جسموں میں جوانی کا خمیر اور جوانی کا خون تھا۔ ان کی چال میں جوانی کا آہنگ تھا اور پارک میں ہر طرف بہار چھائی ہوئی تھی۔ کیاریوں میں پھول کھلے تھے اور سبزے پر پھولوں جیسے بچے کھیل رہے تھے۔ ہوا میں بہار تھی، خوشبو تھی' ایک خوشگوار دھیمی دھیمی گرمی تھی۔ مارگریٹ اور مائیکل ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کوئی گیت گنگنا رہے تھے اور بیچ بیچ میں خواہ مخواہ بلا کسی وجہ کے ہنستے جا رہے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں محمودہ کو اپنے دل میں ایک عجیب خلا کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے سب کچھ ہونے پر بھی اس کے پاس کچھ نہ ہو۔ جیسے وہ اپنے بوڑھے مرجھائے ہوئے جسم پر جوانی کا فینسی ڈریس پہنے گھوم رہی تھی جیسے وہ پھول سب کاغذ کے ہوں اور وہ سبزہ کرائے پر لیا ہوا ایک قالین ہو جس کے لیے کسی دم بھی فرنیچر والا بل پیش کر دے گا۔

محمودہ سوچ رہی تھی۔ ''نہیں میں خوش ہونے پر بھی خوش کیوں نہیں ہوں؟ کس چیز کی کمی میرے دل میں کھوکھلے پن کا احساس پیدا کر رہی ہے؟''

اور اس دم اس نے دیکھا کہ ہنستے کھیلتے ہوئے مارگریٹ اور مائیکل دونوں اس سے آگے نکل گئے ہیں اور اب وہ اکیلی چل رہی ہے اور اس کے پیچھے بجری کی سڑک پر کسی کے قدموں کی آواز آ رہی ہے۔

''ہئی۔ بے بی۔'' لندن کے'' کاکنی' انداز میں کسی نے آواز دی۔ ''وانٹ اے بوائے فرینڈ؟''

بوائے فرینڈ! ایک لفظ جس نے اس کے سارے تن بدن کو جھنجھنا دیا۔ دفعتاً اس کو محسوس ہوا کہ اس کے گال تمتما رہے ہیں۔ اس کے کان گرمی کے مارے جل رہے ہیں۔ اس کا دل ایک نا معلوم خوف سے دھڑک رہا ہے۔ اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ مڑ کر دیکھے کہ اس پر فقرہ کسنے والا کون ہے۔ حالانکہ مارگریٹ نے اسے بارہا سمجھایا تھا کہ اگر کوئی ایسا ویسا کچھ کہے تو فوراً اسے زور سے ڈانٹ دینا چاہیے۔ پھر اس کو چھیڑنے کی کسی کو ہمت نہ پڑے گی۔

مارگریٹ اور مائیکل ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئے تھے اور ان کے قہقہوں کی دھیمی دھیمی آواز جیسے دوسری دنیا سے آرہی تھی۔ محمودہ نے قدم تیز کیے تو اس کا پیچھا کرنے والے کے قدموں کی آواز بھی تیز ہوگئی۔ گھبرا کر اس نے داہنی جانب نظر کی تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے بینچ پر ایک بہت بوڑھا انگریز کپڑے کی چھجے دار ٹوپی آنکھوں پر جھکائے بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ پھر اس نے جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے بائیں جانب نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک جھاڑی میں سے چار ٹانگیں نکلی ہوئی ہیں۔ دو ٹانگیں ریشمی موزوں اور اونچی ایڑی کے جوتوں میں ملبوس ہیں اور دو سفید فلالین کی پتلون اور ٹینس کے جوتوں میں۔ اور یہ بے دھڑ کی چاروں ٹانگیں سبزے پر ایسی بے حرکت پڑی ہیں جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ جیسے ان کو کاٹ کر کوئی وہاں پھینک گیا ہو اور انہیں دیکھ کر محمودہ کا دل اور بھی خوف سے دھڑکنے لگا مگر یہ عجیب قسم کا خوف تھا جس میں ایک سنسناہٹ بھی تھی تجسس بھی تھا اور شرم کا احساس بھی۔

''ہئے بے بی۔!'' پیچھا کرنے والے نے آواز دی اور اس بار یہ آواز بالکل قریب سے آئی تھی۔

محمودہ نے قدم اور تیز کر دیے مگر وہ قدم جو اس کا پیچھا کر رہے تھے اتنے ہی اور تیز ہو گئے اور اب محمودہ کو اپنی گردن اور کمر کے اس حصے پر جو چولی سے باہر نکلا ہوا تھا کسی کے سانس کا گرم گرم بھپکا محسوس ہو رہا تھا۔

دفعتاً وہ بھاگ کھڑی ہوئی اور بھاگتی ہی چلی گئی جب تک کہ اس نے مائیکل اور مارگریٹ کو نہ پالیا۔

''کیا ہوا محمودہ؟'' مارگریٹ نے تعجب سے پوچھا۔ ''تم تو ایسے ہانپ رہی ہو جیسے اولمپک کے میدان میں پورا ایک میل دوڑی ہو۔''

لیکن اس سے پہلے کہ محمودہ کوئی جواب دے سکے ایک گونجتی ہوئی آواز نے اس چونکا دیا۔

''ڈرو روز قیامت سے۔ ڈرو دوزخ کی آگ سے۔ یاد رکھو کہ اب اس پاپ کی دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ کیا تم آسمانی کتاب میں لکھی ہوئی پیشین گوئی بھول گئے ہو کہ جب انسان کے گناہ حد سے بڑھ جائیں گے۔ جب لہو و لعب اور عیش و عشرت میں پڑ کر انسان اپنے خدا کو بھول

جائے گا۔ تب صور اسرافیل پھونکا جائے گا اور سمندروں کا پانی گرم ہو کر ابلنے لگے گا اور سارے جوالا مکھی بیک وقت آگ اگلنے لگیں گے۔ فضا پر کالی کالی آندھیاں چھا جائیں گی اور آسمان میں سورج اتنا نیچے آجائے گا کہ اس کی گرمی سے جنگلوں میں آگ لگ جائے گی— تب اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تمھیں مہلت نہیں ملے گی— ڈرو اس وقت سے اے گناہ گارو..........''

اور اب محمودہ نے دیکھا کہ ہائیڈ پارک کے اس کنارے پر انگلستان کی مشہور و معروف آزادیٔ تقریر کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ میزوں پر، کرسیوں پر، لکڑی کے ڈبوں پر مختلف مقرر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہیں اور مختلف موضوعوں پر بول رہے ہیں۔ کالے کپڑے میں ملبوس قیامت سے ڈرانے والے پادری کے پاس ہی ایک موٹی تازی عورت گوشت خوری کے خلاف تقریر کر رہی ہے اور گائے اور سور کا گوشت کھانے والے انگریزوں کو گاجر اور چقندر اور ساگ کھانے کی تلقین کر رہی ہے۔ پھر ایک دبلا سوکھا بوڑھا ہے جو شراب نوشی کے بھیانک نتیجے بیان کر رہا ہے۔'' تمھارے پھیپھڑے کھوکھلے ہو جائیں گے۔ تمھاری رگوں میں خون کے بدلے الکوہل دوڑنے لگے گی۔ تمھارا جگر اور تمھارے گردے کام کرنے سے انکار کر دیں گے یہ وہسکی اور برانڈی اور بیئر جو تم ہر شام کو پیتے ہو یہ زہر ہے۔''

اور یہ سن کر ایک موٹا سا آدمی جیب سے برانڈی کی چپٹی بوتل نکال کر چلّاتا ہے ''زہر زندہ باد'' اور یہ سن کر سب ہنس پڑتے ہیں۔ پھر ایک لال منہ والا کہتا ہے۔ ''ارے بھائی تم نے اچھا یاد لایا۔ پب میں جانے کا وقت ہو گیا۔'' اور آدھے سے زیادہ آدمی ہنستے، چلاتے، پھبتیاں کستے وہاں سے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور شراب بندی کا مبلّغ چلاتا رہ جاتا ہے۔'' دنیا کے سب بڑے بڑے ڈاکٹر متفق ہیں کہ شراب زہر ہے۔ کیوں اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈھکیلتے ہو؟ کیوں اپنی بیوی کو بیوہ اور اپنے پیارے بچوں کو یتیم بنانے پر تلے ہوئے ہو؟............ لیکن اس وقت تک اس کی تقریر کو سننے والا صرف بوڑھا رہ جاتا ہے جو دونوں کانوں سے بہرہ ہے اور اپنے کان لگے ہوئے آلے کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔''ذرا زور سے بولو بھائی۔''

اور آزادیٔ تقریر کے اس جشن میں محمودہ اس نامعلوم پیچھا کرنے والے کو بھول گئی اور

مارگریٹ اور مائیکل کے ساتھ مختلف مقرروں کے دلچسپ اور متضاد فلسفوں پر خیال آرائی کرتے ہوئے آگے بڑھتی گئی۔ ایک جگہ معمول سے زیادہ بھیڑ دیکھی تو وہ لوگ رک گئے۔ پھونس جیسے زرد بالوں والا ایک نوجوان پیوند لگا موٹا ٹویڈ کا کوٹ پہنے، لال ٹائی لگائے تقریر کر رہا تھا۔

''ہم نے آخری جنگ میں آزادی اور جمہوریت کے نام پر فتح حاصل کی ہے لیکن جب آزادی اور جمہوریت کا مطالبہ ہندوستانی کرتے ہیں تو ان پر گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ ان کے لیڈروں کو جیل میں بند کر دیا جاتا ہے اور یہ سب ہو رہا ہے ہمارے اور تمھارے یعنی برطانوی عوام کے نام سے لیکن میں آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ ہندوستان کے عوام ہی نہیں، سارے ایشیا کے عوام اب جاگ گئے ہیں، اب کوئی سرمایہ داری یا شہنشاہی طاقت ان کو غلام نہیں رکھ سکتی......''

اور محمودہ نے دیکھا کہ پھونس جیسے زرد بالوں والے نوجوان کی نیلی آنکھوں میں ایک شدید اعتقاد کی آگ سلگ رہی ہے اور اس کی لال ٹائی ٹیمز کی طرف سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا میں ایک مختصر مگر انقلابی پرچم کی طرح اڑ رہی ہے اور سننے والوں میں سے چند ہیئر۔ ہیئر کر رہے ہیں اور چند مقرر کا منہ چڑا رہے ہیں۔ اور مائیکل جو اعتدال پسند لبرل پارٹی سے متعلق تھا کہہ رہا تھا۔'' ضرور یہ کوئی کمیونسٹ ہوگا۔'' اور لیبر پارٹی کی مارگریٹ کہہ رہی ہے۔'' وہ جو بھی ہے ٹھیک کہتا ہے۔'' اور محمودہ کو اچنبھا ہو رہا ہے کہ پانچ ہزار میل دور اس ہائیڈ پارک میں ہندوستان اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی صدائے بازگشت ایک انگریز نوجوان کی زبان سے سنائی دے رہی ہے اور اسے یہ سوچ کر آپ ہی شرم محسوس ہونے لگی کہ چند ہی مہینے میں میں اپنے ملک اور اس کے مسائل سے کتنی دور اور کتنی اجنبی ہوگئی ہوں۔ میں نے تو مدت سے ہندوستان کی کوئی خبر بھی نہیں پڑھی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد جیل میں ہی ہیں یا چھٹ گئے۔

اور اس رات محمودہ بہت دیر تک نہ سو سکی۔ بگ بین نے بارہ بجائے۔ پھر ایک، پھر دو۔ تب کہیں اس کی آنکھ لگی۔ مگر عجیب عجیب خواب نظر آتے رہے۔ ایک بہت بڑا ہال ہے۔ اس میں ایک فوجی موچھوں والا انگریز ایک بہت بڑا قالین بچھا رہا ہے جو ہائیڈ پارک کی گھاس کی طرح سبز ہے۔ لیکن وہ فوجی مونچھوں والا انگریز سبز قالین بچھاتا جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔'' یہ تمھارا

ملک ہے۔'' اور اب یہی الف لیلہ کا اڑنے والا قالین بن گیا ہے۔اور وہ اس پر اڑتی ہوئی جارہی ہے اور اسے معلوم نہیں کہ وہ کہاں جارہی ہے لیکن پیچھے سے کوئی اس کے کان میں کھس پس کر رہا ہے'' ہے بے بی۔ وانٹ اے بوائے فرینڈ۔؟'' اور وہ ڈر کے مارے مڑ کر نہیں دیکھ سکتی لیکن دیکھنا چاہتی بھی ہے اور اس کی رگوں میں خون شراب بن کر دوڑ رہا ہے اور کوئی چلا رہا ہے۔'یہ زہر ہے زہر۔!' اور ایک دوسری آواز آرہی ہے۔'زندہ باد زہر' اور وہ قالین اب ایک نیلے سمندر پر سے اڑ رہا ہے۔اور ایک پہچانی ہوئی آواز کہہ رہی ہے۔'' یہ بحرالکاہل ہے۔یعنی نیلا سمندر۔'' اور محمودہ کا جی چاہتا ہے کہ وہ اس گہرے سمندر کے نیلے ٹھنڈے پانی میں کود جائے مگر ڈر بھی لگتا ہے۔اور یہ ایک عجیب احساس ہے جس میں لذت بھی ہے اور کرب بھی ہے اور خواہش بھی ہے اور خوف بھی ہے اور ٹھنڈک بھی ہے اور گرمی بھی ہے.................وہ سمندر میں کودنے والی ہی ہے کہ دیکھتی ہے کہ دور سے ایک سفید پرندہ اس کی طرف اڑتا ہوا آرہا ہے اور نہ جانے کیوں اس کو معلوم ہے کہ یہ پرندہ اس کے لیے ایک ضروری پیغام لا رہا ہے لیکن جب وہ اڑتا ہوا اس کے قریب آتا ہے تو وہ دیکھتی ہے کہ وہ پرندہ نہیں ایک کاغذ ہے جو ہوا میں اڑتا ہوا آرہا ہے......

پھر اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی ہے اور لینڈ لیڈی اس کے پلنگ کے پاس کھڑی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک نیلا ائیر میل کا لفافہ ہے۔اور لفافہ پر امریکہ کے ٹکٹ لگے ہوئے ہیں اور مہین مہین حرفوں میں اس کا پتہ لکھا ہوا ہے۔

(9)

''ڈیئر محمودہ۔!'' سلیم نے لکھا تھا۔'' تمھیں یہ معلوم کر کے دلچسپی ہوگی کہ چند روز ہوئے اچانک میری ملاقات سلویا ٹامسن سے ہوگئی جو کسی اخبار کے لیے ہماری یونی ورسٹی کے بارے میں رپورٹ لکھنے یہاں آئی تھی۔ یاد ہے نا سلویا ٹامسن جو ہمارے ساتھ جہاز پر تھی اور جس کی دوستی رابرٹ اسمتھ سے ہوگئی تھی۔ اپنے ملک واپس آ کر تو وہ اور بھی زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ ہوگئی ہے۔ (خدا کے لیے تم JEALOUS مت ہو جانا۔) میں نے اس سے پوچھا۔ کہو رابرٹ کا کیا حال ہے؟ کیا تم ابھی تک سلویا ٹامسن ہی ہو یا مسز رابرٹ اسمتھ ہوگئی ہو؟ یہ سن کر

اس کی تو رنگت پیلی پڑ گئی اور وہ گھبرا کر آہستہ سے بولی۔ ''مسٹر خان، ایسی باتیں یہاں نہ کرو— کیا تم اخبار نہیں پڑھتے۔؟'' اور پھر وہ کسی کام کا بہانہ کر کے وہاں سے چلی گئی مگر جاتے جاتے مجھ سے کہہ گئی کہ ''کل سویرے میرے ساتھ ہوٹل میں ناشتہ کرنا۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ رابرٹ کے نام پر سلویا اتنی بھڑکی کیوں۔ پھر میں نے سوچا یہاں امریکہ میں تو چٹ ملاقات پٹ محبت، چٹ بیاہ اور پٹ طلاق کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ضرور رابرٹ نے کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لی ہوگی اور شاید اس کی وجہ سے سلویا اس کے ذکر سے گھبراتی ہے۔ مگر اگلے دن جب میں سلویا کے ہوٹل ناشتے کے لیے پہنچا تو سلویا نے اصلی بات بتائی۔ ''کیا تم نے اخبار میں UN-AMERICANS کی فہرست نہیں پڑھی۔ جس میں اخبار نویس، ناولسٹ، ہالی ووڈ کے اسکرپٹ رائٹر اور دوسرے دانشور شامل ہیں اور ان میں رابرٹ کا نام سب سے نمایاں ہے اور اس پر کمیونسٹ ہونے اور کمیونزم کا پرچار کرنے کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ اگر میں اس سے ملوں تو مجھے بھی کمیونسٹ سمجھا جائے گا۔!''

''کیا واقعی رابرٹ کمیونسٹ ہے۔؟'' میں نے پوچھا۔

سلویا نے بتایا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ مگر اس زمانے میں ہمارے ملک میں ہر ترقی پسند چینی کمیونسٹوں کے حامی کو کمیونسٹ سمجھا جاتا ہے اور ہر کمیونسٹ کو لائق گردن زدنی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی روسی فلم چلتا ہے تو F.B.I. والے سامنے کیمرے لیے کھڑے رہتے ہیں اور ہر شخص جو روسی فلم ایک معمولی تماشبین کی حیثیت سے دیکھتا ہے اس پر کمیونسٹ ہونے کا لیبل لگا دیا جاتا ہے اور پھر کم از کم اس کو کوئی کام تو نہیں مل سکتا اور اسے سینیٹر میکارتھی کی کمیٹی کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ تو یہ ہے رابرٹ اور سلویا کا معاملہ۔ رابرٹ کا ایک گمنام خط آیا تھا۔ جس میں اس نے اپنے نام کے بجائے تمہارا الیس۔ الیس ملتان والا دوست لکھا تھا۔ جس میں اس نے اطلاع دی تھی کہ ''میرے لیے اب امریکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ میں شاید پیرس چلا جاؤں۔''

اس خط کے چند ہفتے بعد ہی رابرٹ کا ایک خط محمودہ کے پاس پیرس سے آیا تھا۔ جس میں اس نے پوری صورت حال بتائی تھی۔ ''محمودہ! اب کسی شریف آدمی یا با اصول ادیب یا جرنلسٹ کا

امریکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں اور دس بارہ دوسرے غیر ملکی امریکن جن میں زیادہ تر لوگ ہالی ووڈ میں ڈائریکٹر اور اسکرپٹ رائٹر کا کام کرتے رہے تھے پیرس پہنچ گئے ہیں۔

یونی ورسٹی میں چھٹیاں ہوئیں تو محمودہ پہلی بار پیرس گئی۔ سلیم نے لکھا تھا پیرس جانا ہو تو وہاں میرے نیگرو دوستوں مسٹر اور مسز جیفرسن سے ضرور ملنا۔ ان کے پاس اپنا فلیٹ موجود ہے۔ وہ لوگ بڑی خوشی سے تمہیں اپنے ہاں رکھ لیں گے۔ تم انہیں تار سے اطلاع دے دینا۔ محمودہ کی ٹرین پیرس پہنچی تو اسے کوئی نیگرو انتظار کرتا ہوا نظر نہیں آیا لیکن ساری پہنے اکیلے وہی اتری تھی اس لیے ایک گورا چٹا جوڑا اس کی طرف آیا اور کہا۔

''مس اکبر علی۔؟''

''یس۔ یو آر۔؟''

''پیگی اور سنکلیر جیفرسن۔ آپ کے دوست سلیم نے آپ کے بارے میں ہمیں لکھا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں آپ کی میزبانی اور نگرانی کرنی چاہیے۔''

اب محمودہ نے غور سے اس جوڑے کو دیکھا تو دونوں کی رنگت تو دودھ اور شہد کی طرح گوری اور گلابی تھی مگر بال سیاہ تھے۔ نیگرو تو نہیں لگتے تھے لیکن شاید خون میں ملاوٹ ہو۔ ان کے انداز میں اتنی گرمجوشی اور خلوص تھا کہ محمودہ کو ان کے ساتھ جانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔

ان کا فلیٹ پیرس کے لیفٹ بینک پر تھا۔ امیرانہ ٹھاٹ باٹ تو نہیں تھے مگر اچھا خاصا تھا اور خاص بات یہ کہ اس کا اکلوتا بیڈ روم محمودہ کے لیے تیار تھا۔

محمودہ نے پوچھا۔

''آپ دونوں کہاں سوئیں گے؟''

''ہماری فکر نہ کریں۔ ہم ڈرائنگ روم میں سو جائیں گے۔'' پیگی جیفرسن نے کہا۔ ''اب آپ اپنے کمرے میں آرام کیجیے۔ شام کو آپ سے ملنے کے لیے میں نے چند دوستوں کو بلایا ہے۔''

محمودہ نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے سے پہلے کہا۔

''معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ دونوں کو اسٹیشن پر پہچانا نہیں تھا۔ سلیم کے خط سے مجھے کچھ اور ہی اندازہ ہوا تھا۔''

پگی نے قہقہہ لگایا اور اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پھر وہی غلط فہمی۔ میں کہتی ہوں ہمیں اپنے گلے میں ایک تختی لٹکا لینی چاہیے کہ ہم نیگرو ہیں۔"

پھر محمودہ کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔

"مس اکبر علی! ہم دونوں کی رنگت سفید ضرور ہے جس کی وجہ کسی 'پلانٹیشن اونر' کی مہربانی رہی ہوگی لیکن اس سے امریکہ میں کسی نے دھوکا نہیں کھایا اور وہاں ہمارے ساتھ وہی سلوک ہوتا تھا جو دوسرے کالوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا تھا کہ ہم اپنے چہروں پر کالا رنگ چڑھالیں تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔"

"اور اس لیے بھی کہ بلیک از بیوٹی فل۔" اس کے شوہر نے لقمہ دیا۔!

یہ طرزِ فکر محمودہ کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ دیر تک پلنگ پر لیٹی اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

وہ جس ملک سے آئی تھی وہاں تو کالے کرسچین اپنے آپ کو اینگلو انڈین اور اینگلو انڈین اپنے آپ کو انگریز سمجھتے تھے اور کالی لڑکیاں میک اپ کی مدد سے میموں کی طرح گوری نظر آنے کی کوشش کرتی تھیں۔

شام کو مہمان آنے شروع ہوئے۔ سب کے سب دانشور اور ادیب تھے۔ ایک ہالی ووڈ کا رائٹر اور ایک ڈائریکٹر بھی تھا۔ ہر ایک اپنے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ تاکہ دعوت کا پورا بار جیفرسن پر ہی نہ پڑے۔

وہ سب لوگ امریکہ میں ہزاروں ڈالر ہفتہ وار کما رہے تھے لیکن اپنے اصولوں کی خاطر پیرس میں مفلسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

ہالی ووڈ کے اسکرپٹ رائٹر نے بتایا کہ اس کے پروڈیوسر نے اسے ایک اسکرین پلے لکھنے کو کہا تھا لیکن اس شرط پر کہ نام کسی اور کا لکھا جائے اور پانچ سو ڈالر دینے کے لیے کہا۔ جب کہ اسی نے پچھلے اسکرین پلے کے لیے پانچ ہزار دیے تھے۔

جیفرسن نے اس سے کہا۔

"اور کیا تم نے یہ پیش کش منظور کر لی۔؟"

"ہاں بھئی! کیا کروں۔ پیٹ پالنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ مگر میں نے اپنا

اسکرین پلے انگلستان میں کاپی رائٹ کرا لیا ہے تاکہ جب پکچر ریلیز ہو تو میں اپنے نام کا حق مانگ سکوں۔''

محمودہ، ڈائریکٹر اور جیفرسن کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس نے ڈائریکٹر سے پوچھا۔ ''آپ نے کون کون سی فلمیں بنائی ہیں۔''

جواب میں ایک اچھی خاصی لمبی فہرست اس نے سنائی۔ ان فلموں میں سے اکثر محمودہ نے دیکھی تھیں۔ ترقی پسند خیال سب میں موجود تھے۔

''اور اب آپ کیا کرتے ہیں۔؟'' محمودہ نے پوچھا۔

''آج کل تو بیکار ہوں۔ لیکن ایک برٹش پروڈیوسر سے آج کل پکچر بنانے کی بات چیت چل رہی ہے۔''

جب دعوت ختم ہوئی اور سب لوگ چلے گئے تو جیفرسن نے نیلا اوورآل پہنا۔ اور محمودہ کو خدا حافظ کہہ کر اور اپنی بیوی کو چوم کر باہر چلا گیا۔

محمودہ نے تعجب سے پیگی سے پوچھا۔

''یہ رات کو کہاں گئے ہیں۔؟''

جواب ملا۔

''مذبح خانے میں کٹی ہوئی گایوں کا بوجھ اٹھانے۔ فی الحال تو یہی کام ملا ہے۔''

اگلے دن جب رابرٹ اس سے ملنے آیا تو محمودہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے اس کے ساتھ سلویا ٹامسن کو بھی دیکھا۔ وہ بحرِ اوقیانوس عبور کر کے رابرٹ کے پاس آ گئی تھی اور اب ان دونوں نے شیشے کی ان دیواروں کو توڑ ڈالا تھا جو ان کے بیچ کھڑی تھیں۔

سلیم کو خط لکھتے وقت جہاں اس نے پیرس کی قابلِ دید جگہوں کا ذکر لکھا وہاں UN-AMERICANS کا ذکر بھی لکھا جو اسے جیفرسن کے ہاں ملے تھے۔ رابرٹ اور سلویا سے ملاقات کا حال بھی لکھا۔ سلیم نے جواب میں اسے ان 'خطرناک' لوگوں کے نام لکھنے سے منع کیا تھا چونکہ اب خطوط کا سنسر ہو رہا تھا۔

(10)

محمودہ کو سلیم کا ایک تار ملا۔ جس میں لکھا تھا میں فلاں وقت ہوائی جہاز سے لندن پہنچ رہا ہوں مجھے ائیرپورٹ پر ملنا۔

محمودہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس نے انتظار کے تین دن بڑی بے چینی سے گذارے۔ اس دن اپنے لباس اور سنگھار وغیرہ پر خاص دھیان دیا اور گھنٹہ بھر پہلے ہی لندن کی ایئرپورٹ پر پہنچ گئی۔ یہ آج کی ایئرپورٹ نہیں تھی۔ نہ اتنی شاندار تھی۔ نہ ایسے شیشے سے ڈھکے ہوئے کوری ڈور تھے۔ پھر بھی ایک ہندوستانی لڑکی کے لیے جس نے کبھی ہوائی سفر نہیں کیا تھا کافی رعب دار جگہ تھی۔

دراصل وہ کئی مہینے سے سلیم کو چھٹیوں میں لندن آنے کے لیے لکھ رہی تھی کیونکہ ان کو ایس۔ ایس ملتان پر ملے ہوئے ایک برس سے زیادہ ہو چکا تھا اور دونوں طرف جذبات کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

محمودہ کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ وہ عین کسٹم کے دروازے کے سامنے ایک سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک کتاب پڑھتی رہی۔

ہوا موافق ہونے کی وجہ سے ہوائی جہاز وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا اور کسٹم کی لائن میں بھی سلیم آگے تھا۔ کسٹم کرا کے وقت پر باہر نکل آیا۔ محمودہ اس کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑ پڑی۔ دونوں بغل گیر ہوگئے۔ پھر محمودہ کچھ شرما کر الگ ہوئی تو سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ باہر لایا ائیرپورٹ کی بس میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے دونوں ٹرمنل آئے۔

محمودہ جوش و خروش سے اپنے کورس کے بارے میں بتا رہی تھی۔

سلیم جو امریکہ کے مڈویسٹ کی KANSAS یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ وہ امریکہ کے کلچر کا ذکر کرتا رہا۔ وہاں انگلستان سے بھی زیادہ دولت تھی اور سماجی آزادی بھی۔ مگر نیگرو لوگوں کو دبا کر رکھا جا رہا تھا۔ جس کے ردعمل میں کالے لوگ بھی اب فریاد کرنے کی بجائے اپنے قوت بازو کے استعمال پر اتر آئے تھے۔ ان کے غصے اور غم کا اظہار کبھی جرم کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ کبھی پولیس والوں پر حملے کی شکل میں۔

رابرٹ کے بارے میں محمودہ نے پوچھا تو سلیم نے کہا کہ پیرس آنے سے پہلے وہ نیویارک کے ایک کالے لوگوں کے روزنامے میں ملازمت کر رہا تھا اور اس طرح اس نے اپنے آپ کو

کالوں کے CAUSE کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔

ٹرمنل سے ٹیکسی لے کر سلیم ایک ہوٹل میں گیا۔ جہاں اس نے ٹھہرنے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اس ہوٹل میں لڑکیوں کو اوپر اپنے کمرے میں لے جانا مشکل ہوتا ہے۔ محمودہ جس لینڈ لیڈی کے ساتھ رہتی تھی وہ بھی لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ صرف ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کی اجازت دیتی تھی۔ خیر گرمیوں کے دن تھے۔ کئی دن تک تو ہوٹل کی لابی کے علاوہ وہ دونوں میوزیم وغیرہ کی سیر کرنے کے بعد ریجنٹ پارک اور ہائیڈ پارک میں گھومتے رہے۔

ایک دن ہائیڈ پارک میں سے گذر رہے تھے کہ انھوں نے ایک پنجابی نوجوان کو (جو قراقلی پہنے ہوئے تھا) تقریر کرتے ہوئے سنا۔ جو کسی نئے ملک کی بات کر رہا تھا۔ جو وہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کا نام تھا پاکستان!— وہ فر اٹے دار انگریزی بول رہا تھا۔!

''یاد رکھیے، حضرات! پاکستان کا نظریہ نیا ضرور ہے۔ مگر جب ہندوستان آزاد ہوگا تو یہ ملک ضرور بن کر رہے گا۔ اس میں، ہم وہ سب علاقے ملائیں گے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ پنجاب سے ہم نے 'پ' لیا ہے۔ 'ا' شمالی مغربی سرحدی افغان علاقے کے لیے ہے۔ 'ک' کشمیر کا ہے۔ 'س' سندھ کا ہے۔ اور 'ستان' بلوچستان وغیرہ کا۔ یہ ملک ہندوستان کے ہندو کانگریسیوں کے اثر سے آزاد ہوگا۔ ہم اس ملک میں ایک خالص اسلامی حکومت بنائیں گے......''

کوئی پاگل ہے یہ بھی۔ ہائیڈ پارک کی مشہور 'آزادرائے' کا ایک سے ایک نمونہ۔ کہیں ملک بھی تقسیم ہوا کرتے ہیں۔ ادھر سنو۔

دوسری طرف کوئی نیگرو کالے لوگوں کے بارے میں بول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔'' میں امریکہ سے آیا ہوں۔ وہاں سفید فام لوگوں کے مظالم ہمارے خلاف بڑھتے جا رہے ہیں۔ جو نیگرو بھی اپنے ہم رنگ لوگوں کے لیے آواز اٹھاتا ہے۔ اسے یا تو کمیونسٹ قرار دے کر پکڑ لیا جاتا ہے یا پولس کی مار پڑتی ہے اس بیچارے پر............''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے— رابرٹ کا بھی یہی خیال ہے۔''

''چلو اب یہاں سے۔ میں سیاسی لکچروں سے بور ہوگئی ہوں۔''

''اور میں انگلستان کے اخلاقی ماحول سے بور ہوگیا ہوں۔ کہو دو تین دن کے لیے کہیں

باہر چلتی ہو۔ میں ایک کار کرائے پر لے لیتا ہوں۔ امریکہ میں جو کار ہے میرے پاس اس کا اسٹیرنگ وہیل تو بائیں طرف ہے کیونکہ وہاں ٹریفک داہنے ہاتھ چلتا ہے اور یہاں بائیں ہاتھ۔ مگر دو چار میل ہی میں عادت ہو جائے گی۔''

اگلے دن سلیم موٹر لے کر اور اس میں ہوٹل میں سے اپنا سامان رکھ کر محمودہ کے ہاں پہنچا۔ اس نے اپنا ایک چھوٹا سا بیگ تیار کر رکھا تھا۔ جس میں دو تین ساڑیاں اور شب خوابی کا ایک لباس رکھا ہوا تھا۔ ساری رات سلیم کے ساتھ چند روز گذارنے کے خیال سے اس کو خوشی بھی تھی اور گھبراہٹ بھی۔ ایک سنسنی سی سارے جسم میں دوڑ رہی تھی۔

کار میں اگلی سیٹ پر سلیم کے ساتھ بیٹھ کر اور اس کا لمس محسوس کر کے محمودہ نے پھر وہی سنسنی محسوس کی۔

سلیم کار بہت اچھی چلاتا تھا۔ تھوڑی دیر ہی میں وہ امریکہ کے الٹ ٹریفک کا عادی ہو گیا کیونکہ عمر بھر ہندوستان میں تو ٹریفک کو اس نے بائیں ہاتھ ہی چلتے دیکھا تھا۔ شروع شروع میں اسے امریکہ میں کار چلانے میں زیادہ دقت ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ لندن کے ٹریفک سے آزاد ہو گئے اور انگلستان کی COUNTRYSIDE کا لطف اٹھانے لگے۔ ہوا میں صرف تھوڑی سی خنکی تھی۔

''ٹھنڈا کیوں ہے تمھارا ہاتھ، محمودہ؟ اتنی سردی تو نہیں ہے؟''

سلیم نے محمودہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے پیار کی گرمی محمودہ کے ہاتھ کو گرماتی رہی اور محمودہ کے تن بدن میں ایک خطرناک مگر دلکش گرم گرم لہر دوڑ رہی تھی۔

نہ جانے کب تک اس کا ہاتھ سلیم کے ہاتھ میں رہا۔ وقت تھم گیا تھا۔ مگر موٹر دوڑتی جا رہی تھی۔ DOWNS کی اونچ نیچ سے گزرتے ہوئے وہ چلے جا رہے تھے۔ اور محمودہ کو ایسا لگا جیسے وہ کسی کشتی پر سوار ہیں اور وہ ہلکے ہلکے اڑتی ہوئی کسی جھیل کی ساکن سطح پر جا رہی ہے۔

دوپہر کو انھوں نے ایک INN میں لنچ کیا INN KEEPER اور اس کی بیوی دونوں انھیں ہنی مون پر آیا ہوا رومانی جوڑا سمجھ کر ان کی خاطر کرتے رہے۔ نہ سلیم نے اس سے انکار کیا اور نہ ہی محمودہ نے۔ یہاں تک کہ ہنی مون اسپیشل، کہہ کر انھوں نے ایک روز "WINE" کی بوتل بھی ان کے سامنے رکھ دی۔ سلیم شراب پینے کا امریکہ میں عادی ہو چکا تھا اور اس نے اصرار کر کے محمودہ کو بھی

پلادی۔ میٹھی شراب تھی۔ محمودہ کو ایک گرم گرم شہد حلق سے اتر کر رگوں میں جاتا ہوا محسوس ہوا۔

جب وہاں سے چلے تو سلیم کا ہاتھ محمودہ کی کمر کے گرد تھا۔ موٹر میں بیٹھے تب بھی وہ ہاتھ وہیں رہا۔

اب ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سارے ماحول پر رنگ چھایا ہوا تھا۔ کوئی بیس میل ڈرائیو کرنے کے بعد ایک پیڑ کے نیچے سلیم نے محمودہ کا منہ پہلی بار چوما اور محمودہ کو ایسا لگا جیسے وہ خوشی کے مارے مر جائے گی۔

''ذرا سنبھال کر موٹر چلاؤ۔'' محمودہ نے سلیم کو وارننگ دی۔ جب اس نے چلتی ہوئی موٹر میں بھی اس دل خوش تجربے کو دوہرانا چاہا۔ راستے میں سلیم نے کہا۔

''محمودہ! مجھ سے شادی کرو گی؟''

یہ سوال اتنی غیر متوقع جگہ کیا گیا تھا کہ وہ فوراً جواب نہ دے سکی۔ کئی منٹ تک وہ چپ رہی۔

''کیوں ــــ؟ میں پسند نہیں ہوں کیا؟'' سلیم نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں سلیم ــــ! یہ بات نہیں ہے۔'' آخر کار محمودہ نے کہا۔ اور ہلکے سے سلیم کا ہاتھ دبایا۔ پھر کہا۔ ''مگر مجھے اپنی ماں سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی تمھیں پسند کریں گی۔''

''تو تمھاری طرف سے میں 'ہاں' سمجھوں۔؟''

محمودہ نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔

اور سلیم نے موٹر روکے بغیر صرف آہستہ کر کے محمودہ کو چوم لیا۔

شام کے قریب ایک چھوٹے سے خوب صورت دیہاتی ہوٹل کے قریب سلیم نے موٹر روکی۔

اندر گئے تو مالک اور منیجر (جو ایک ہی آدمی تھا) نے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔

''ڈبل بیڈ روم سر'' مالک نے مسکرا کر پوچھا۔

''اس سے پہلے کہ سلیم 'یس'' کہہ دیتا محمودہ کے اندر سے روایتی اخلاق سے بندھی ہوئی لڑکی کی آواز آئی۔

''نو پلیز۔ دو سنگل رومز!''

سلیم نے چونک کر محمودہ کی طرف دیکھا اور بیچارگی کے انداز میں کہا۔

''یس۔ ٹو سنگل رومز، پلیز۔''

دونوں نے علٰیحدہ علٰیحدہ کمروں کے لیے دستخط کیے اور ان کا سامان علیحدہ علیحدہ کمروں میں پہنچادیا گیا۔

کھانا انھوں نے ایک ہی میز پر ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ پھر کوری ڈور میں سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

محمودہ نے اندر سے کمرہ بند کرلیا۔

سلیم نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

محمودہ اپنے پلنگ پر گر کر رونے لگی۔ '' مجھے معاف کردو، سلیم ڈارلنگ۔ مگر میں پرانے خیالات کی لڑکی ہوں۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے۔''

اگلے دن وہ صبح کو اٹھے اور نیچے ناشتے کی میز پر بیٹھے تو سلیم نے دیکھا کہ محمودہ کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ لگتا تھا کہ محمودہ رات کو سو نہیں سکی۔

خاموشی سے ناشتہ کرنے کے بعد جب دونوں موٹر میں بیٹھے تو سلیم نے دھیرے سے محمودہ کا ہاتھ دبایا۔ محمودہ اس کی نرم محبت بھری لمس سے کانپ اٹھی اور بے اختیار رونے لگی۔

''اب کیا ہوا۔؟''

''میں ایک بیوقوف لڑکی ہوں ڈارلنگ۔ میں جانتی ہوں کہ تم ہزاروں ڈالر خرچ کرکے مجھ سے ملنے یہاں آئے ہو۔ مگر آج کی رات میں یہ بیوقوفی نہیں کروں گی۔ PROMISE۔''

''اچھا۔ اب ریلیکس کرو۔'' سلیم نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مگر آج ہماری چھٹی کا آخری دن ہے۔ کل میں امریکہ واپس لوٹ جاؤں گا۔''

دن بھر جھیلیں اور وادیاں اور پہاڑیوں کے دلفریب نظارے دیکھتے ہوئے وہ رات کے قریب ایک اور چھوٹے سے IVORY COVERED ہوٹل میں پہنچے جس کا نام HOTEL—HAPPINESS تھا۔ یہ نام ان دونوں کو پسند آیا کیونکہ وہ خوشی ہی کی تلاش میں تھے۔

یہاں بھی ان سے وہی سوال کیا گیا۔

''ڈبل بیڈروم، سر؟''

آج محمودہ نے اس روایتی اخلاق والی قدامت پسند لڑکی کا گلا گھونٹ دیا جو اس کے اندر چھپی بیٹھی تھی۔

"یس پلیز—" سلیم نے جواب دیا اور رجسٹر میں لکھ دیا۔ مسٹر اینڈ مسز سلیم احمد۔"

ان کا سامان ایک ہی کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک ہی پلنگ تھا لیکن لمبا چوڑا۔ کمبل صرف ایک تھا۔ مگر منیجر نے ان سے کہا کہ اور کمبلوں کی ضرورت ہو تو الماری کے اوپر رکھے ہوئے ہیں۔

ڈنر پر جب شراب آفر کی گئی تو سلیم نے انکار کر دیا۔ جب اس نے انکار کیا تو محمودہ نے سوالیہ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"جانتی ہو کیوں نہیں منگا رہا ہوں۔؟"

"کیوں۔؟"

"اس لیے کہ میں ویسے ہی خوشی کے نشے میں ہوں۔ اس کے علاوہ میں تمھیں پلا کر تمھاری مدہوشی کا فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔"

کھانے کے بعد ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے بالکل نئے بیاہے جوڑے کی طرح وہ دونوں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچے۔ سلیم اپنا شب خوابی کا لباس اٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔ اور محمودہ سے کہا۔ "میں پانچ منٹ سے پہلے نہیں نکلوں گا۔ تم اپنے کپڑے بدل سکتی ہو۔"

محمودہ کو اس کا اتنا خیال رکھنا اچھا لگا۔ کتنا شریف اور بااخلاق ہے میرا سلیم۔ اس نے اپنا سوٹ کیس کھولتے ہوئے سوچا۔ سوٹ کیس کی تہہ سے اس نے ایک بہت ہی DARING سلیپنگ گاؤن نکالی جو اسی موقع کے لیے اس نے خریدی تھی اور آج تک نہیں پہنی تھی۔

جلدی سے گاؤن کو پہن کر وہ بستر میں گھس گئی۔ کمبل کو اپنی ٹھوڑی تک گھسیٹ لیا۔

سلیم باتھ روم سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ اس کی محمودہ لیٹی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

سلیم نے بڑی نرمی سے اس کا گال چوم لیا۔

پھر ذرا زیادہ گرمی سے اس کے ہونٹ چوم لیے۔

پھر وہ بھی کمبل کے اندر گھس گیا۔

محمودہ اس کی بانہوں میں آ گئی۔

ان کے ہونٹوں نے ایک دوسرے کو پالیا۔
ان کی زبان نے ایک دوسرے کے منہ کا مزہ چکھا۔
اور محمودہ ایک انجانی مسرت سے لبریز ہوگئی۔
پھر سلیم کے ہاتھوں نے اس کے بدن کا جائزہ لینا شروع کیا۔!
سلیم کے ہونٹوں نے اس کی چھاتیوں کو چوم لیا۔

محمودہ کو ایسا لگا کہ اتنی خوشی اور مسرت وہ برداشت نہ کر سکے گی۔ اس کو لگا کہ سلیم نے اپنا سلیپنگ سوٹ اتار دیا ہے اور اس کا برہنہ جسم اس کے جسم سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے۔

اس وقت محمودہ کو نہ جانے کیا ہوا، وہ چلائی۔
''نہیں۔ سلیم نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔''
سلیم گھبرا کر علیحدہ ہوگیا۔
''کیا ہوا تمہیں۔؟''
محمودہ نے اپنے سلیپنگ گاؤن کو سمیٹتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔
'نہیں سلیم۔ یہ نہیں۔ یہ نہیں۔''

سلیم کمبل کے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنا سلیپنگ سوٹ پہن لیا۔ ایک اور کمبل الماری کے اوپر سے اتار لیا۔

اچھا محمودہ، میں تمہیں ریپ کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہماری تمھاری محبت کی ہتک ہوگی۔
اور وہ دوسرے کمبل میں لپٹ کر اس بڑے پلنگ کے دوسرے کنارے پر سو گیا۔
رات بھر محمودہ سوچتی رہی کہ اس نے جو کیا وہ اچھا کیا یا برا کیا۔؟

شادی سے پہلے ہم بستری؟ یہ تو اس کی اخلاق کی کتاب کے خلاف اسے بتایا گیا تھا کہ جو لڑکیاں ایسا کرتی ہیں وہ اپنے منگیتروں کی عزت کھو بیٹھتی ہیں اور ان کی تو باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی۔!

اگلے دن صبح کو سلیم پہلے اٹھا اور غسل خانے سے نہا دھو کر کپڑے بدل کر نکلا۔ محمودہ کو ہلکے سے ایک بوسہ دے کر وہ نیچے چلا گیا۔ اس سے کہہ گیا کہ وہ بھی تیار ہو جائے کیونکہ آج انہیں

لندن سویرے پہنچنا تھا۔

ناشتے کی میز پر انھوں نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔ پھر ہوٹل کا بل ادا کر کے وہ روانہ ہو گئے اب سلیم ڈرائیونگ پر CONCENTRATE کرتا رہا۔ اس کے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر ہی رہے۔ ان کے درمیان ایک ہلکے سے شیشے کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔ ایک خوب صورت ہری بھری اور سرسبز CONLING SIDE ان دونوں کے دونوں طرف سے گزرتی رہی لیکن جتنا انھوں نے آتے ہوئے ENJOY کیا تھا۔ اب انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی ادھر نہیں دیکھا۔

لندن پہنچ کر سلیم نے کار گیراج میں واپس کی جہاں سے کرایہ پر لی ہوئی تھی۔ پھر کرایہ ادا کیا پھر اپنا سامان ایک ٹیکسی میں رکھ کر محمودہ کے ہاں آیا۔

محمودہ اندر سامان رکھنے گئی اور جب واپس آئی تو سلیم ٹیکسی میں انتظار کر رہا تھا۔

''تم ایئر پورٹ تو چلو گی۔؟''

''کیوں نہیں۔؟''

اور وہ سلیم کے برابر بیٹھ گئی۔

''آئی ایم سوری، سلیم FOR WHICH HAPPENED

YOU MEAN WHICH DIDN'T HAPEN مگر محمودہ، وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم انتظار کرا کے میرا امتحان لینا چاہتی ہو نا۔ تو ایسا ہی ہوگا۔ تم چاہتی ہو کہ میں برات لے کر علی گڑھ آؤں تو ایسا بھی ہوگا؟ تم اپنی والدہ کی مرضی کے بغیر ہاں نہیں کر سکتیں تو ان سے بھی مشورہ کر لو۔ تم چاہتی ہو تو میں ایک دن سہرا باندھے گھوڑے پر سوار آگے آگے بھانگڑہ ڈانسرس کو لیے تمھارے گھر آؤں گا۔ ایک رات تو نکاح کے بعد میری دلہن بننا ہے۔ تب تو تمھاری شب عروسی کی رات ہوگی نا؟ پھر سب بدلے اتار لوں گا۔''

''سلیم۔''

''ہاں محمودہ۔''

''میں تمھاری عزت پہلے سے بھی بہت زیادہ کرنے لگی ہوں۔''

''مگر مجھے عزت نہیں۔ محبت چاہیے تمھاری۔''

''وہ تو ہمیشہ سے ہی رہے گی۔

''یقین ہے تمھیں۔''

''ہاں یقین ہے۔''

ایئرپوٹ پر سلیم نے محمودہ کو گلے لگا کر ایک برادرانہ بوسہ دیا اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر کسٹم میں چلا گیا اور محمودہ ائیر پورٹ بس میں بیٹھ کر واپس آ گئی۔

(11)

وہ کورس پورا کر کے ہندوستان چلی گئی تھی جہاں اس وقت فرقہ وارانہ فسادات کا زور تھا۔ بیشتر ہندو اور اکثر مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ یہ سن 1947 تھا۔ محمودہ کو علی گڑھ یونی ورسٹی ہی میں اسسٹنٹ لائبریرین کی نوکری مل گئی تھی۔

سلیم اپنی ترقی پسندی کے سلسلے میں کیمونسٹوں کے زیر اثر آ گیا تھا جو پاکستان کو مسلمانوں، (یا مسلمان قومیتوں) کا جائز مطالبہ کہتے تھے۔ اس کے علاوہ پنجابی مسلمان ہونے کی وجہ سے بھی اس کی ہمدردی پاکستان سے تھی۔

سلیم کے خطوط اب بھی آ رہے تھے لیکن ان میں سے ایک خط میں تو سلیم کی طرف سے باقاعدہ پیش کش کی گئی تھی۔ ''پیاری محمودہ۔ میں تم سے شادی کر کے تمھیں شریک زندگی بنانا چاہتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تمھیں لاہور میں رہنا ہوگا یا جہاں کہیں بھی میرا تقرر ہوگا مگر وہ ہوگا پاکستان میں ہی۔''

لاہور۔ پاکستان، وہ ملک جواب بننے والا تھا! ہندوستان سے الگ تھلگ۔ اور پھر سلیم کو چھوڑ کر اور سب پنجابیوں سے واسطہ پڑے گا۔

یہ خیال محمودہ کے لیے کسی طرح خوش آیند نہیں تھا۔ دہلی، علی گڑھ، آگرہ۔ یہ سب جگہیں اس کے لیے اجنبی ہو جائیں گی۔ پھر ایک قتل و خون کے سمندر سے پاکستان کا ملک ابھر رہا تھا۔

محمودہ کو بھی خون کے اس سمندر کو پار کرنا ہوگا۔

اپنی ماں اور بہنوں سے بچھڑنا ہوگا۔

کیا وہ سلیم کی محبت کے لیے ایسا کر سکے گی؟

• کبھی وہ سوچتی۔ ''ہاں'' محبت کے لیے سب قربانیاں دی جاسکتی ہیں۔

مگر جب اس نے اپنی ماں، بہنوں سے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ بہت سے ہندوستانی مسلمان بھی پاکستان جاسکیں گے تو اس کی ماں نے صاف انکار کر دیا۔

اس کی ماں سیاست نہیں جانتی تھی مگر وہ اپنے وطن میں رہنا چاہتی تھی۔ جہاں ان کے باپ دادا کی قبریں تھیں۔

محمودہ نے سلیم کو لکھا کہ اسے سوچنے کا موقع دے۔

سلیم نے لکھا۔ سوچنا ہے تو سوچ سکتی ہو مگر وقت کم ہے۔ جتنی جلدی فیصلہ کرلو اتنا ہی بہتر ہوگا۔

اس عرصے میں قومی عارضی حکومت بھی بن گئی جس میں کانگریسی اور مسلم لیگی دونوں شامل تھے۔ محمودہ کو تھوڑا سا سہارا مل گیا۔ ممکن ہے ہندوستان کی تقسیم نہ ہو۔

مگر تقسیم تو ہندوستان کی قسمت میں ہی تھی اور وہ ہو کر رہی۔ کانگریسی لیڈروں نے بھی ہتھیار ڈال دیے...... جواہر لال نہرو نے بھی جن پر محمودہ کو ذاتی طور سے بہت بھروسہ تھا کہ کم سے کم وہ ملک کی تقسیم کو منظور نہیں کریں گے۔ سیاست کتنی الجھی ہوئی تھی؟

ادھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی شاطرانہ چالیں چل رہا تھا۔ ادھر کشت وخون کا بازار گرم تھا اور ماؤنٹ بیٹن کے تقسیم کے کیلنڈر کے ورق الٹ رہے تھے۔

محمودہ ایک طرف تو الزام نہیں دے سکتی تھی۔ دوسری طرف علی گڑھ میں تو امن کی جگہ تھی مگر دہلی سے وحشت ناک خبریں آرہی تھیں۔ دلی میں ایک فسادی کے ہاتھ سے پنڈت جواہر لال نہرو نے تلوار چھین لی تھی لیکن تلواریں ہزاروں تھیں اور ہر جگہ موجود تھیں۔ ہندو تلواریں اور مسلمان تلواریں اور سکھ کرپانیں اور ان کو چھیننے والا ایک جواہر لال نہرو ہی تھا۔ جو رات دن جیپ لیے دوڑتا پھرتا تھا کہ کسی طرح سے دہلی کے مسلمانوں کو بچایا جا سکے، ان ہندوؤں اور سکھوں سے جو مغربی پنجاب کے قتل وخون کا بدلہ لینے پر تلے ہوئے تھے۔

سلیم واپسی میں نیویارک سے دہلی ہو کر لاہور گیا تھا۔ خاص طور سے محمودہ سے ملنے کے

لیے یہ خطرہ اس نے مول لیا تھا۔ وہ ایک گاڑی سے دن بھر کے لیے علی گڑھ آیا۔

محمودہ کے دل کی حرکت تیز ہو گئی تھی۔ کتنا خوب صورت اور شاندار ہو گیا تھا وہ۔ جب اسٹیشن پر ہی سلیم نے محمودہ کو گلے سے لگا لیا تو اس کو ایسا لگا کہ اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ وہ خوشی کے مارے رونے لگی۔

مگر محمودہ کی ماں اب بھی بیٹی کے پاکستان جانے کے حق میں نہیں تھی۔ محمودہ نے اور وقت مانگا۔

سلیم نے ریلوے اسٹیشن پر ایک بار پھر محمودہ کو سمجھایا۔

''محمودہ! اس ملک میں مسلمانوں کا خیریت سے رہنا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ تم سمجھ جاؤ۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میرے پاکستان کے افسروں میں کتنے ہی دوست ہیں۔ تمھاری والدہ اور بہنوں سب کے جانے کا انتظام ہو جائے گا۔ اگر تم چاہو تو ہوائی جہاز سے آسکتی ہو۔''

مگر محمودہ کے دل کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔

آدھا دل ہندوستانی تھا۔

آدھا دل (سلیم کی وجہ سے محبت میں) پاکستانی تھا اور وہ بیچ میں کھڑی تھی۔

محمودہ کا ہاتھ سلیم نے محبت سے دبایا اور ریل جب علی گڑھ سے روانہ ہوئی تو محمودہ کا جی چاہا کہ چلتی ہوئی ریل میں کود پڑے۔ اپنے سلیم کے ساتھ چلی جائے۔ مگر اب تو ٹرین جا چکی تھی۔ محمودہ کھڑی فولادی ریل کی پٹریوں کے جال کو دیکھ رہی تھی۔

سلیم چلا گیا۔ خیریت سے لاہور پہنچنے کا تار بھی آ گیا۔ اب محمودہ نے اپنی ماں بہنوں کو منا لیا کہ پاکستان ہی چلی جائیں۔

جنوری کی تیس تاریخ تھی۔

محمودہ نے ایک تار لاہور سلیم کے پتے پر لکھا ''ہم لوگ آ رہے ہیں انتظام کر دو۔''

دوسرا تار پاکستان کے سلیم کے ایک دوست کے نام دہلی لکھا جس میں پاکستان جانے کی حامی بھری گئی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ محمودہ نے سوچا شہر کا تار گھر تو بند ہو چکا ہوگا۔ محمودہ نے اسٹیشن کے لیے سائیکل رکشا کیا اور وہاں تار دینے گئی مگر اسٹیشن پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یہاں کا تار گھر بھی بند ہو گیا تھا۔ وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ گاندھی کا قتل ہو گیا ہے۔ دل کو دھچکا سا لگا ممکن ہے دہلی کے کسی پاگل مسلمان نے یہ کام کیا ہو۔ مگر جلد ہی نتھو رام گوڈ سے کا نام معلوم ہو گیا۔ ہندو مہا سبھائی ذہنیت کے ہندوؤں کا کام تھا۔ جو گاندھی جی اور ان کی انسان دوستی کو مسلمانوں کی خوشامد کہتے تھے اور اس لیے خلاف تھے کیونکہ گاندھی جی اصرار کر رہے تھے کہ دہلی کے مسلمانوں کی حفاظت کی جائے اور پاکستان کے حصے کے کروڑوں روپے فوراً ادا کر دیے جائیں۔

جو، دونوں تار دہ دینے والی تھی وہ اس نے چاک کر دیئے۔

گاندھی جی کی شہادت نے ہر ذی حس انسان کے دل پر اثر کیا ہر ہندوستانی مسلمان کے دل پر مرہم رکھا۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک بنے گا اس کا یقین دلایا۔ اب محمودہ کو پاکستان جانا گاندھی جی کی روح کے ساتھ غداری معلوم ہوا۔ دونوں تاروں کو اس نے چاک کر کے پھینک دیا اور سلیم کو خط لکھ کر بھیج دیا کہ ان کا فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بدلنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ''مگر تمھاری محبت میرے دل میں اب بھی ویسی ہی اٹل ہے۔''

تین ہفتے کے بعد سلیم کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا۔

''میں تمھارے جذبات کو سمجھتا ہوں اور ان کا احترام کرتا ہوں، غم محبت کے علاوہ دنیا میں دوسرے بھی غم ہیں۔

اس کے بعد ہر ہفتے سلیم کے خط آتے رہے۔

سال گزرتے گئے، برسوں یہ خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔ بیچ میں پاکستان اور ہندوستان کی مختصر جنگیں بھی ہوئیں۔

لیکن سلیم کسی نہ کسی طرح دوسرے ملکوں کے ذریعے خط بھیجتا رہا۔ اس نے لکھا تھا۔

''میں اب بھی امید کرتا ہوں کہ تم ایک دن ضرور یہاں آ جاؤ گی۔''

مگر محمودہ نے ہاں نہیں کی۔ دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی ہو گئی مگر بڑی بہن کنواری ہی رہی۔ سلیم اب بھی تیار تھا۔ ایگری کلچر ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے لگا۔ پاکستان میں گیہوں کی

پیداوار بڑھاتا گیا۔ یہ اسی کا کارنامہ تھا۔ جہاں ایک ایک دانہ پیدا ہوتا تھا۔ وہاں دو دانے بلکہ تین دانے پیدا ہونے لگے۔ سلیم نے اپنی کامیابی کا ذکر خط میں لکھا تو محمودہ کا دل فخر سے بھر گیا۔

وقت پانی کے دھارے کی طرح بہتا گیا۔ نہ سلیم نے شادی کی اور نہ محمودہ نے۔ حالانکہ محمودہ نے کئی بار سلیم کو لکھا کہ کوئی اچھی پاکستانی لڑکی تلاش کر کے اس سے شادی کر لے لیکن سلیم اپنی ضد پر قائم رہا۔

سلیم کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن محمودہ مجبور ہوکر پاکستان آ ہی جائے گی۔ مگر وہ ہندوستان چھوڑ کر نہیں گئی۔ ''محبت'' سے زیادہ اسے اپنے وطن سے لگاؤ تھا۔ وہ پاکستان جانے کے امکان پر غور کرنے کو تیار نہیں تھی۔

آخر کار ایک دن سلیم کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کی بدلی اب ایک خاص کام پر ہوگئی ہے۔ جس کی تفصیل اس نے نہیں لکھی تھی۔

محمودہ نے اس نئے کام کی تفصیل جاننا چاہی تو جواب میں سلیم نے اسے ٹال ہی دیا۔ مہینے گزر گئے اور اس نے لکھا کہ وہ لندن کے راستے سے نیویارک جا رہا تھا۔ جہاں کوئی کانفرنس ہو رہی تھی۔ وہ دو دن کے لیے لندن میں ٹھہرے گا۔ کیا وہ (محمودہ) لندن آسکتی ہے؟

محمودہ نے فوراً اپنے بینک بیلنس کا جائزہ لیا اور سلیم کو لکھا کہ وہ لندن پہنچ جائے گی۔ اور اس کا انتظار ایئرپورٹ پر ہی کرے گی۔

سو وہ اب لندن کی ائیر پورٹ پر کھڑی پاکستان کے پلین کا انتظار کر رہی تھی۔

آخر کار P.I.A. کا پلین آ ہی گیا۔

محمودہ کو P.I.A کے ائیر ہوسٹس کی یونیفارم پسند آئی۔ اس میں ایک خاص مشرقی انداز تھا جو بھلا لگتا تھا۔ برخلاف ائیر انڈیا کی اونچی ایڑی اور مغربی انداز کے کپڑوں کے۔۔۔!

ایک ایر ہوسٹس آگے آگے چل رہی تھی اور باقی مسافر اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ آخر دور سے شیشے کی دیوار میں سے محمودہ کو سلیم نظر آیا۔ بوڑھا تو نہیں ہوا تھا لیکن کنپٹی کے کتنے ہی بال سفید ہو گئے تھے۔ رنگت بھی پیلی پڑ گئی تھی مگر اس کا شاداب چہرہ اب بھی وہی تھا۔ وہ شیشے کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور اشاروں سے سلیم کو بلانے لگی۔

آخر کار سلیم نے اس کو دیکھ ہی لیا۔ اپنی طرف کی شیشے کی دیوار سے لگ کر وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ ایک شیشے کی دیوار تھی جو ان کے درمیان تھی۔ محمودہ کا جی چاہتا تھا کہ اس دیوار کو توڑ ڈالے، جس نے اتنے دنوں سے اسے سلیم سے علیحدہ کر رکھا تھا۔

مگر ایسے ہی شیشے کی دیواریں کتنے ہی محبت کرنے والوں کے درمیان کھڑی تھیں۔

عرب احمد رؤف اور یہودن کارلا کے درمیان جو صرف ایک سو میل ایک دوسرے سے دور تھے۔ رؤف لبنان میں اور کارلا اسرائیل میں۔ مگر نسلی غرور اور تشدد اور نفرت کی دیوار کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ ایسی ہی ایک دیوار میمی اور چانگ چن کے درمیان تھی۔ میمی کینٹن میں رہتی تھی اور چانگ چن ہانگ کانگ میں۔ صرف ساٹھ میل کا فاصلہ تھا مگر نا قابل عبور۔

ساری دنیا میں یہ شیشے کی دیواریں کھڑی تھیں اور کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ان کو توڑ سکے۔

ایسی ہی ایک ان دیکھی دیوار ان دونوں کے درمیان بھی کھڑی تھی۔ لندن کی جگمگاتی ایئرپورٹ پر قومی غرور کی دیوار، تعصب کی دیوار، گورنمنٹوں کے نظریوں کی دیوار، محمودہ سلیم کو الزام دیتی تھی۔ وہ ہندوستان کیوں نہیں آجاتا؟ یہاں ایک سیکولر ماحول تھا جو اس جیسے ترقی پسند خیالات کے قائل آدمی کو اپنے سینے سے لگا سکتا ہے۔ سلیم کا یہی خیال محمودہ کے بارے میں تھا۔ وہ بھی آخر پاکستان کیوں نہیں آجاتی۔

مگر اب وہ دونوں دیوار کے آر پار ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ شیشے پر جہاں محمودہ نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ شیشے کے ادھر سلیم نے بھی وہیں ہاتھ رکھ دیا اور محمودہ نے محبت کا ایک کرنٹ شیشے کے ادھر محسوس کیا۔

محمودہ نے جواب میں مٹھی تان کر شیشے کو ادھر سے دکھایا وہ سلیم سے کہنا چاہتی تھی کہ کب تک یہ شیشے کی دیواریں ہمارے درمیان کھڑی رہیں گی۔

سلیم نے بھی مسکرا کر شیشے کو اپنے داہنے ہاتھ سے دھکایا۔

محمودہ یہ دیکھ کر کہ سلیم بھی شیشے کی دیوار سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے مسکرا دی۔

پھر پاکستان انٹرنیشنل ایئرویز کی ایک ایئرہوسٹس پیچھے سے سلیم کے پاس آئی اور اپنی مسکراہٹ چمکا کر اس کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ محمودہ کی طرف اس نے دیکھا بھی نہیں مگر سلیم محمودہ کی

طرف ہاتھ ہلا کر ہوسٹیس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔
اور اب کوئی دیوار ان دونوں کے درمیان نہیں تھی۔
محمودہ اور سلیم کسٹم کے باہر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ سلیم نے دوسرے مسافروں کی بھیڑ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے محمودہ کو چوم لیا۔
مگر نہ جانے کیوں محمودہ کو سلیم کے بدن میں وہ پرانی طاقت نہیں محسوس ہوئی جو اس نے پندرہ برس پہلے محسوس کی۔
سلیم نے بھی محمودہ کے چہرہ پر وہ پرانی شگفتگی نہیں محسوس کی۔
محمودہ فرط محبت سے رونے لگی۔ سلیم نے اس کی آنکھوں کو چوم کر اس کے آنسوؤں کو پی لیا۔
اپنا سامان لے کر سلیم باہر نکلا اور HERTZ ROUT A CAR کے ڈیسک پر جا کر ایک کار کرائے پر لی جس کا انتظام اس نے پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔
کار فوراً ہی وہاں آ گئی۔ مگر اس بار سلیم نے خود کار نہیں چلائی۔ ڈرائیور بھی کار کے ساتھ تھا۔ وہ وہیل پر بیٹھا رہا اور سلیم اور محمودہ دونوں سامان ڈگی میں بند کر کے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔
کار جیسے ہی ایئر پورٹ سے چلی تو برفیلی سڑک پر وہ دونوں پھر بغل گیر ہونے کو تیار تھے مگر ڈرائیور کی موجودگی ان کے راستے میں حائل تھی۔
''کہاں لے چلوں—؟'' ڈرائیور نے اپنے ''کاکنی ACCENT میں پوچھا۔
سلیم نے کہا۔
''ایک ڈسٹرکٹ میں ایک ہوٹل ہے۔''
محمودہ نے فوراً کہا:

HOTEL HAPPINESS

''اس برفیلی رات میں وہاں چل سکتے ہو؟''
''یس سر—!'' ڈرائیور نے کہا۔ ''جہاں آپ کہیں وہاں چل سکتا ہوں۔ ہوٹل ہپی نیس تو کافی مشہور ہے۔ مگر رات زیادہ ہوگئی ہے آپ کو وہاں پہنچتے پہنچتے سویرا ہو جائے گا۔''
''تو کوئی پرواہ نہیں—!'' سلیم نے انگریزی میں کہا۔

کار رات کے اندھیرے کو اپنی ہیڈ لائٹس سے چیرتی ہوئی چلتی رہی، برف گرتی رہی اور سلیم اور محمودہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ایک دوسرے کو گرمی پہنچاتے رہے سلیم محمودہ کو اپنی گود میں گرا کر اس کے بالوں کو، ماتھے کو، آنکھوں کو اور ہونٹوں کو چومتا رہا اور محمودہ نے اپنی آنکھوں کو بند کر کے اس کو اپنے جذبات سے کھیلنے دیا۔ اس بار وہ فیصلہ کر کے آئی تھی۔

پو پھٹ رہی تھی جب وہ ''ایک ڈسٹرکٹ'' میں تھے۔

ہوٹل پی نیس میں پہنچے تو منیجر آنکھیں ملتا ہوا نکلا۔

سلیم نے رجسٹر میں لکھا۔ ''مسٹر اینڈ مسز سلیم احمد۔''

مگر قومیت کے خانے میں اپنے نام کے آگے لکھا۔ 'پاکستانی' اور محمودہ کے سامنے 'ہندوستانی' لکھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ دونوں یہاں ایک بار پہلے بھی آئے تھے مگر صرف ایک رات ٹھہرے تھے۔ وہی کمرہ دے دیتا ہوں۔

سلیم نے کہا۔

'' اچھا خیال ہے۔ وہ کمرہ بہت اچھا تھا۔ اس بار ہم دو تین دن یہاں ٹھہریں گے۔ ہمارے ڈرائیور کو بھی ایک کمرہ دے دیجیے۔

ڈرائیور نے ان کا سامان اسی ڈبل بیڈ روم میں پہنچا دیا۔

''گڈ نائٹ سر۔ گڈ نائٹ میڈم۔ گڈ نائٹ۔ آئی مین گڈ مارننگ۔۔۔!''

اور یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہاں پہنچ کر دروازہ بند ہوتے ہی محمودہ سلیم کی آغوش میں تھی۔ برسوں کے بعد ان کے جذبات آج پھٹے پڑ رہے تھے۔

محمودہ نے سلیم کی کنپٹی کے سفید بالوں اور کان کو چومتے ہوئے کہا۔

''سلیم ڈارلنگ۔ آج وہ ہو جائے جو اس دن میری بیوقوفی سے نہیں ہوا۔''

سلیم نے دھیرے دھیرے محمودہ کی ساڑھی، بلاؤز اور چھٹی کوٹ اتارا۔

وہ کمبل میں گھس گئی۔۔۔ سلیم بھی اپنے کپڑے اتار کر وہیں گھس گیا۔

''ڈارلنگ۔ڈارلنگ۔۔۔'' کہہ کر محمودہ اس سے چمٹ گئی۔

پھر وہ ہوا جو پہلے نہیں ہوا تھا۔

محمودہ کو محسوس ہوا کہ شیشے کی دیواریں یک لخت ٹوٹ گئیں اور اس کے سارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

سارے جہان کی پھلجھڑیاں ایک دم جل اٹھیں۔ایک عجیب و غریب مگر دلفریب موسیقی سے اس کا تن بدن مسحور ہو گیا اور اس کو ایسا لگا جیسے سلیم کی ساری محبت ایک رقیق مادہ بن کر اس کے مرجھائے ہوئے بدن کی آبیاری کر رہی تھی۔

اور پھر سلیم باہر آ گیا۔محمودہ کا جی چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ کبھی بند نہ ہو۔ بڑے پیار سے سلیم نے محمودہ کو تھپ تھپایا۔ایک بار پھر اسے چوما۔مگر اس بوسے میں پیار ہی پیار تھا کوئی PASSION نہیں تھا۔چند ہی منٹ میں محمودہ نے بھی سلیم کو ایک بوسہ دیا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو پیار کرتی ہے اور سلیم کے کان کو چومتے ہوئے اس سے سرگوشی میں کہا۔

''سلیم ڈارلنگ۔۔۔ کیا سب لوگ اسی طرح محبت کرتے ہیں۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔!'' سلیم نے کہا۔''جو لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں۔''

پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹ کر سو گئے۔ جیسے دو بچے ہوں اور محموذہ نے خواب میں دیکھا کہ دنیا بھر کی شیشے کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں اور دنیا بھر کے عاشق معشوق ایک دوسرے کی بانہوں میں ہیں۔

احمد اور کارلا۔

میمی اور جانگ چن۔

رابرٹ اور سلویا۔

ہندوستانی اور پاکستانی

عرب اور یہودی

ہندوستانی اور پاکستانی
عرب اور یہودی
گورے امریکن اور کالے امریکن
برہمن اور ہریجن
ساری دنیا کی شیشے کی دیواریں چکنا چور ہو گئی تھیں۔
وہ لوگ لنچ کے وقت پر سو کر اٹھے اور ہاتھ میں ہاتھ دیئے دونوں نیچے آئے۔
منیجر نے ان سے کہا:
''لنچ از ریڈی، سر۔'' LUNCH IS READY SIR
سو وہ ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ جہاں منیجر نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں گلابی اور سرخ پھولوں کا ایک گلدستہ لگا ہوا تھا۔

اب محمودہ نے دن کی روشنی میں سلیم کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک خاص زردی پائی۔

''ڈارلنگ۔ کیا تم کچھ بیمار ہو—؟''
''کیوں—؟'' سلیم نے کوشش کر کے مسکرا کر کہا۔ ''کیا میری رات کی محبت میں کچھ کمی پائی—؟''
''نہیں— مگر تمھارے چہرے پر یہ زردی—؟''
''ارے بھئی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اب چہرے پر جوانوں کی سی لالی کہاں سے آئے گی۔ آج مرے کل دوسرا دن—!''

خبردار جو مرنے کا ذکر کیا۔'' محمودہ نے اپنی انگلی سلیم کے ہونٹوں پر رکھ دی۔
''چلو نہیں کرتے! تم بھی میرے چہرے کی زردی نہ دیکھو۔ بات یہ ہے کہ ملیریا ہندوستان اور پاکستان دونوں میں واپس آ گیا ہے— بخار آ گیا تھا۔''
محمودہ کو نہ جانے کیوں یقین نہیں آیا کہ سلیم صرف چند روز کے بخار سے اتنا پیلا ہو سکتا ہے۔
کھانا کھانے کے بعد ڈرائیور کو ساتھ لے کر وہ برفیلی ماحول کی میر کو گئے۔
کہاں لے چلوں، سر؟

جہاں تمہارا جی چاہے۔
اسٹریٹ فورڈ یہاں سے قریب ہے۔ وہاں لے چلتا ہوں۔ شیکسپیئر کا گھر دیکھنا پسند کریں گے آپ؟
کیوں محمودہ۔ کیا خیال ہے۔؟
ضرور ضرور—!
شیکسپیئر کا گھر دیکھ کر سلیم کو ہملیٹ یاد آ گیا۔
''ٹوبی اور ناٹ ٹوبی۔'' یاد ہے شیکسپیئر کیا کہتا ہے۔ ''ٹوبی اور ناٹ ٹوبی۔''

To be, or not to be, that is the question: wether this nabber in the mind to suffer the slings and arrows of outrageous fortunt.
or to take arms against a sea of troubles,
and by opposing end them?
to die to sleep;

''کیوں محمودہ ٹھیک کہا ہے نا شیکسپیئر نے؟''
''کیوں منحوس باتیں منہ سے نکالتے ہو۔؟''
''اس لیے کہ موت اتنی ہی لازمی ہے جتنی زندگی۔''
''تو زندگی کی بات کرو نا۔ زندگی کی۔ محبت کی۔''
''چلو پھر محبت ہی کی بات کرتے ہیں۔''
اور اس رات کو ان کا محبت بھرا ملاپ پھر ہوا۔
اور اگلے دن پھر۔
جب تک وہاں رہے۔ ہر رات کو وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے رہے۔
پھر......
پھر جدائی کا دن آ ہی گیا۔ اس شام کا پلین لے کر وہ امریکہ جانے والا تھا۔
''امریکہ کیوں جا رہے ہو سلیم؟'' محمودہ نے سوال کیا۔
''کچھ نہیں۔ ایک کانفرنس ہے اور میڈیکل ٹیسٹ کرانے ہیں۔'' سلیم نے بظاہر بغیر کسی

فکر کے جواب دیا۔

"دیکھوڈارلنگ۔ میں تم سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا لیکن تم کو یاد ہے کہ میں نے لکھا تھا کہ میری بدلی ہوگئی ہے۔"

"ہاں۔مگر کس ڈیپارٹمنٹ میں۔؟"

"یہ بات کسی سے کہنا نہیں۔مگر میں وہاں ایک ایٹومک ATOMIC RADIATION بجلی گھر کا انچارج ہوں۔ جو ہمارے ایگری کلچر ڈیپارٹمنٹ کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔"

دفعتاً محمودہ کو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔اور وہ کانپ اٹھی۔

"تمھارا مطلب ہے کہ ایٹومک ریڈیشن..........."

"ہاں۔غلطی میری ہی تھی— بے خیالی میں ایک دن میں ری ایکٹر کے بہت قریب چلا گیا تھا۔یہاں تک کہ اپنے بلیپ کی وارننگ بھی نہیں سنی۔"

محمودہ ازحد پریشان ہوگئی اور پریشانی میں سلیم سے لپٹ گئی۔

"اوہ مائی ڈارلنگ،اتنے خطرناک کام کیوں کرتے ہو؟"

"اب تو جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔"سلیم نے محمودہ کو چومتے ہوئے کہا۔"دیکھیں امریکہ کے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔!"

اور پھر اسے محمودہ کو تسلی دلانے کے لیے ایک بار پھر اس سے محبت کرنی پڑی اور اس بار تو محمودہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ سلیم کو اپنے بدن کے اندر ہی ہمیشہ کے لیے قید کر لے۔

جب وہ دونوں روانہ ہوئے تو محمودہ کو معلوم تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔اب وہ کبھی نہ ملیں گے۔

محمودہ نے لندن تک سلیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے رکھا۔جیسے کوئی اسے زبردستی کہیں لے جارہا ہو۔

ائیرپورٹ پر پہنچ کر ان دونوں نے ایک دوسرے کو آخری بار چوما اور پھر اپنا سوٹ کیس اٹھا کر سلیم اندر چلا گیا۔مگر شیشے کی دیواروں میں سے محمودہ اس کو کھڑی دیکھتی رہی۔ جب کوری ڈور کے موڑ پر وہ پہنچا تو اس نے ہاتھ ہلا کر اس کو آخری بار سلام کیا اور پھر وہ ہوائی جہاز کے اندر سما گیا۔

محمودہ چند روز لندن اپنی ایک سہیلی کے ہاں رہی۔ جو ڈاکٹری پڑھ رہی تھی۔
وہاں ایک دن "واشنگ مشین" میں کپڑے دھو رہی تھی کہ اسے چکر آ گیا۔
شام کو جب اس کی سہیلی گھر آئی تو محمودہ نے اس سے اپنا معائنہ کرایا۔
"کم بخت یہ تو نے کیا کیا۔۔۔؟ تو تو کہتی تھی کہ تیری شادی ہی نہیں ہوئی۔۔۔ تو تو ماں بننے والی ہے۔۔۔؟"
"سچ۔۔۔!" محمودہ نے تعجب اور خوشی سے کہا۔
ہندوستانی کسٹم والوں نے نئی دہلی ایئر پورٹ پر محمودہ سے پوچھا۔
"میڈم۔ ہیو یو گوٹ سم تھنگ ٹو ڈکلیر HAVE YOU GOT SOME THING TO DECLARE
محترمہ کیا آپ کے ساتھ کوئی غیر قانونی سامان تو نہیں ہے۔
"جی ہاں۔ ہے تو۔ مگر وہ سامان آپ کو دکھائی نہیں دے گا۔۔۔؟ میں نے اسے اپنے اندر قید کر رکھا ہے۔"
کسٹم کے افسروں نے اس کے سوٹ کیس کی پوری تلاشی لی۔ کچھ لندن کی دوکانوں سے خریدے ہوئے چھوٹے چھوٹے کپڑے نکلے اور بس۔۔۔!
"جایئے میڈم۔۔۔!"
اور محمودہ نے ایک پورٹر سے سوٹ کیس اٹھانے کو کہا اور بڑے فخر کے ساتھ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی تمام شیشے کی دیواروں کے پار چلی گئی۔

○

بمبئی رات کی بانہوں میں

(ایک ناول: ایک قلم)

1967

مایا موہ کے راستے پر چل کر بہت سے
لوگوں نے اپنی جان گنوائی ہے—
(کٹھ اپنشد)

ترتیب

1- آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے
2- تین خط
3- کبوتر اور انسان
4- رات خوب صورت ہے
5- ایک ٹیکسی دو مسافر
6- سلگتا ہوا سوال
7- پیار کی پیالی
6- اندھیرے میں روشنی
9- میں کون ہوں؟
10- سچ اور سپنا
11- شیشے کی دیواریں
12- رات کی بانہوں میں
13- نئی کرن

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے......

کہتے ہیں کیچڑ ہی میں کنول کے پھول کھلتے ہیں۔ مگر یہ کیچڑ زہریلی تھی جس میں پودوں اور پھولوں کا سانس گھٹ جاتا ہے۔ گندی، بدبودار، زہریلی نیلی نیلی کیچڑ، جس پر کائی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

ربڑ کے گم بوٹ اس کیچڑ میں چلتے ہوئے آرہے تھے ہر قدم پر پھسلنے کا ڈر تھا۔ ہر قدم کیچڑ میں دھنستا جاتا تھا۔ گم بوٹوں میں، پتلون پہنے ہوئے لمبی لمبی ٹانگیں تھیں۔ ان ٹانگوں کا مالک ایک اونچے قد والا نوجوان تھا جس کی آنکھیں دھوپ کی تیزی سے چندھیا رہی تھیں۔ مگر جو اپنے کیمرے کی آنکھ سے بمبئی کی اس گندی بستی کو اور اس کے رہنے والوں کی زندگی کو دیکھ رہا تھا۔ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر کیمرے کی نگاہ کے سامنے آرہا تھا۔ ایک 'کلک' کی آواز ہوتی تھی اور وہ منظر جیسے تصویر بن کر قید ہو جاتا تھا۔

کیمرے کی آنکھ اور ایک جرنلسٹ کی نگاہ سب کچھ دیکھتی ہے اور سب کچھ دکھاتی ہے۔ دکھ، سکھ، غم اور — 'اندھیرا اجالا' محلوں کی اونچائی اور گندی بستیوں کی پستی — دنیا کا کوئی رخ ان سے چھپا نہیں رہتا۔ اِن آنکھوں نے جنگ کی ہولناکی دیکھی تھی۔ انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ فساد کے خون خرابے دیکھے تھے۔ اکال کے مارے چلتے پھرتے ڈھانچے دیکھے تھے۔ ماؤں کی سوکھی ہوئی چھاتیوں سے لپٹے ہوئے بچے دیکھے تھے۔ بمبئی کی اس غریب

گندی بستی، اس کی ٹین، ٹاٹ، لکڑی کی بنی ہوئی جھونپڑیوں اور ان میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کی ایسی کوئی بات نہیں تھی جو امر کمار جیسے تجربہ کار جرنلسٹ نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

پھر بھی نہ جانے کیوں اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس گندگی اور اس کیچڑ کا نہ صرف اس بستی کے رہنے والوں کے ساتھ' بلکہ اس کی اپنی زندگی کے ساتھ کوئی گہرا تعلق ہے۔ شاید اس لیے کہ کیچڑ نہ صرف بدبودار اور گندی تھی' بلکہ دلدل کی طرح گہری اور پھسلواں تھی۔ امر کمار نے پھسلتے ہوئے، پھنستے ہوئے، پیروں کو دلدل میں سے نکالتے ہوئے سوچا۔ یہ کیچڑ سرمایہ داری نظام کی نشانی ہے جس میں لوگوں کے پیر پھسلتے ہیں یا پھر دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ دلدل، جو ایک بھیانک اژدہے کی طرح اپنے شکار کو اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔ اس دلدل کے لیے، تو میرے لمبے گم بوٹ بھی کافی نہیں ہیں۔ یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔

دلدل میں سے نکل کر اس نے پوری بستی پر ایک طرف سے دوسری طرف ایک جھلکتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں جو اس کیچڑ کی جھیل کے چاروں طرف بنی ہوئی تھیں اور نہ جانے کس جھونپڑی میں سے ریڈیو پر ایک جانی پہچانی دھن سنائی دی۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا—'' اقبال نے شاید اپنے ہندوستان میں اس بستی کا شمار نہیں کیا تھا۔

جھونپڑیوں کے سامنے عورتیں اور بچیاں بیٹھی ہوئی ایک دوسری کے سر کے بالوں میں جوئیں دیکھ رہی تھیں، بچوں کا ایک جھنڈ جمع ہو گیا تھا۔ جو سب اس لمبے نوجوان کو تعجب سے دیکھ رہے تھے جو ان کی بستی کی تصویریں لے رہا تھا۔ ''بھلا ہماری بستی کی جھونپڑیوں میں تصویر لینے کے قابل کون سی خوب صورت چیز ہے''؟ بچوں کی خاموش نگاہیں پوچھ رہی تھیں اور اب چار آدمی امر کمار کے سامنے کھڑے تھے۔

دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور جانچا۔

امر کمار نے دیکھا کہ یہ چاروں آدمی ادھیڑ عمر کے ہیں۔ مگر ان کے چہروں پر بڑھاپے کے آثار قبل از وقت نمایاں ہو گئے ہیں۔ ایک کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے کی مونچھیں جھکی ہوئی ہیں۔ تیسرے کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ چوتھے کی کمر جھکی ہوئی ہے۔ ان کی آنکھوں میں تعجب بھی تھا کہ کوئی ان کی بستی میں دلچسپی لے رہا ہے۔ امید کی چمک بھی تھی کہ شاید اس طرح

ان کی بہتری کی کوئی صورت نکل آئے اور ایک گہری مایوسی بھی تھی کہ ان کی مدد کا وعدہ تو بہت سوں نے کیا تھا، مگر اب تک وہ وعدہ پورا نہیں ہوا تھا۔

اور ان چار آدمیوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے ایک لمبے قد اور اچھی شکل کا نوجوان کھڑا ہے۔ پیروں میں گم بوٹ ہیں، جن پر وہ کیچڑ اب بھی لگی ہوئی ہے جس میں چل کر آیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی ہے۔ مگر ایک پیشہ ورانہ تجسس بھی ہے جیسے دنیا میں دکھ درد تو اس نے بہت دیکھے ہوں مگر ان کی وجہ اس کو اب تک معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں کھلا کیمرہ جھول رہا تھا اور اس کا لینس LENS ایسا لگتا تھا جیسے وہ فوٹو کھینچنے کا آلہ نہ ہو بلکہ اس کی اپنی تیسری آنکھ ہو۔

چاروں میں سے ایک نے کہا— ''صاحب! ہم کس حالت میں یہاں رہ رہے ہیں—!''

''ہاں بھئی— ''نوجوان نے جواب دیا— ''میں نے بھی دیکھا۔ اور میرے کیمرے کی آنکھ نے بھی دیکھا۔ مگر اس بستی کا مالک کون ہے؟''

''اس بستی کا نام ہے ڈالیر یا واڑی۔'' دوسرے آدمی نے کہا جیسے یہ کہنا ہی کافی ہو۔ مگر تیسرے نے بات پوری کر دی— ''اور اس بستی کے مالک کا نام ہے سیٹھ سوناداس ڈالیریا۔''

سوناداس ڈالیریا! امر کمار کے دماغ میں جیسے خطرے کی گھنٹی بجی ہو۔ ڈالیریا! سیٹھ ڈالیریا! لوگ کہتے تھے، ڈالیریا کی بادشاہت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ ڈالیریا انڈسٹریز۔ ڈالیریا مل، ڈالیریا فیکٹریاں، ڈالیریا بینک، ڈالیریا بلڈنگیں، ڈالیریا دھرم شالے، ڈالیریا مندر سارے ہندوستان اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ سیٹھ ڈالیریا سے ٹکر لینا لوہے کے چنے چبانا تھا۔

چوتھے آدمی نے امر کمار کو سوچ میں پڑا ہوا پاکر ایک ایسی آواز میں للکارا جس میں تلخی ہی تلخی تھی۔ تلخی اور ناامیدی— ''کروڑپتی ہے نا؟ اس کے خلاف ہماری فریاد کون سنے گا؟''

امر کمار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک فیصلہ کن آواز میں کہا— جیسے ایک بہت بڑی جنگ شروع ہونے کا اعلان کر رہا ہو۔ ''میں سناؤں گا۔''

○

تین خط

ہر بار جب 'آزاد قلم' اخبار کے پریس کی مشینیں چالو ہوتی تھیں، تو امر کمار کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ پریس کی مشینیں نہیں ہیں، بلکہ ایک انقلابی فوج کی توپیں ہیں مشینوں کی دھڑ دھڑاہٹ میں اس کو توپوں کی گرج سنائی دیتی — مشین گنوں کی پے در پے گولیاں چلنے کی آواز آتی، تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی، گھوڑے کے ٹاپوں کی صدا آتی۔ یہ لمحہ اس کے لیے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ "جو کچھ میں نے دیکھا ہے۔ جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے، جو کچھ میں نے لکھا ہے، اب وہ چھپ کر پڑھنے والوں کے سامنے آئے گا۔ میرے دل کی دھڑکن لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن جائے گی۔ میری آواز کی گونج ساری دنیا میں سنائی دے گی— جس دن امر کا کوئی فیچر آرٹیکل اخبار میں ہوتا۔ اس دن وہ پریس میں اخبار چھپنے کے وقت تک موجود رہتا اور جب آٹومیٹک مشینیں اخبار کی کاپیاں اگلنا شروع کر دیتیں تو وہ سب سے پہلی کاپی لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا۔ اس کو جرنلزم کرتے سات برس ہو گئے تھے، مگر اب بھی اپنا نام پڑھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ اس کو ایک عجیب مسرت اور فتح مندی کا احساس ہوتا— خصوصاً جب اس کا مضمون اور اس کا نام پہلے صفحہ پر ہوتا، جیسا کہ آج تھا۔

"سیٹھ ڈالیریا کا بھانڈا پھوڑ۔" سرخی جلی حرفوں میں چھپی ہوئی تھی فرنٹ پیج پر۔ یہ خاص

مضامین کے سلسلے کا پہلا مضمون تھا۔ جس میں اس نے سیٹھ ڈالیریا کا پورا کچا چٹھا لکھ دیا تھا۔ پہلا مضمون غریبوں کی ان بستیوں کے بارے میں تھا جس میں سیٹھ ڈالیریا کے مزدور رہتے تھے۔ ساتھ میں وہ تصویریں لگی ہوئی تھیں جو امر کمار نے اپنے کیمرے سے کھینچی تھیں۔

پریس میں کھڑے ہی کھڑے امر کمار نے اپنے مضمون کو پڑھتے ہوئے سوچا۔ 'نہ جانے مضامین کے اس سلسلہ کو پڑھ کر سیٹھ ڈالیریا کیا سوچے گا۔ کیا کرے گا۔ میری آواز کو دبانے کے لیے کون سا حربہ استعمال کرے گا۔' اس کو معلوم تھا کہ ایک جرنلسٹ جس نے سیٹھ ڈالیریا کے خلاف لکھا تھا۔ آج ایک جھوٹے مقدمے میں پھنس کر جیل کی ہوا کھا رہا ہے، دوسرے کو ہتک عزت کے الزام میں دو لاکھ ہرجانہ دینا پڑا تھا۔ اس کا پریس نیلام کر دیا گیا تھا۔ اس کا اخبار بند ہو گیا تھا۔ اور وہ خود قرض کے چنگل سے آج تک نہ نکل سکا تھا۔ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ ڈالیریا نے اپنے منیم کو قتل کروا دیا تھا کیونکہ اس نے انکم ٹیکس کو ڈالیریا انڈسٹریز کی آمدنی خرچ کا کچا چٹھا بتانے کی دھمکی دی تھی......امر کمار کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سیٹھ ڈالیریا اس سے انتقام لے گا مگر ایک ایسے ڈھنگ سے جو امر کمار سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

'آزاد قلم' کے دفتر میں حسب معمول ہنگامہ تھا۔ ٹائپ رائٹر کھڑک رہے تھے، ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی، آفس بوائے کو بلانے کے لیے مختلف سب ایڈیٹر اور رپورٹر اپنی اپنی میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کو بار بار بجا رہے تھے۔

آفس بوائے نے خطوں کا ایک پلندہ میز پر رکھا تو امر نے پوچھا۔ ''ارے بھئی یہ سب کیا ہیں؟ کسی فلم اسٹار کی ڈاک ہے کیا؟''

اور آفس بوائے نے جو بڑا شریر اور منہ چڑھا تھا' جواب دیا۔ یہ سب چٹھیاں آپ کے لیے ہیں۔ آپ کسی فلم اسٹار سے کم ہیں کیا؟''۔ اور یہ کہہ کر وہ رحمٰن ٹائپسٹ کی میز سے چائے کی خالی پیالی اٹھانے کے لیے چل دیا۔

امر ٹائپ رائٹر پر کوئی رپورٹ تیار کر رہا تھا۔ پہلے اس نے سوچا رپورٹ ختم کر دوں۔ پھر خطوں کو اطمینان سے پڑھوں گا۔ پھر اس نے سوچا۔ یہ خط بھی تو ایک جرنلسٹ کی زندگی میں بڑے اہم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی کام کا خط نکل آئے۔ شاید سیٹھ ڈالیریا کے سلسلے میں ہی کسی

نے کوئی بھید کی بات لکھی ہو۔

سگریٹ کو منہ سے ہٹا کر ایش ٹرے میں رکھ کر امر نے پہلا خط کھول کر پڑھا تو اس کو ایسا لگا جیسے کسی نے 'آزاد قلم' کے اڈیٹوریل کا ہی منہ چڑایا تھا: ''پر یہ شری امرکمار! آپ نے سیٹھ ڈالیریا کا ہی بھانڈا نہیں پھوڑا آپ نے پونجی پتی سماج کے چہرے سے سے نقاب اتار دیا ہے۔''

اس کو الگ رکھتے ہوئے دوسرا خط اٹھایا اور پڑھا تو بے اختیار مسکرا دیا۔ یہ کوئی رومان زدہ خاتون تھیں۔ لکھا تھا۔'' مائی ڈیر امرکمار جی! واہ واہ کیا لیکھ لکھا ہے، جی چاہتا ہے آپ کا قلم چوم لوں، کیا آپ مجھے اپنا فوٹو......''

آخر تک پڑھنا بیکار تھا ایسے خط اس کے پاس اکثر آتے رہتے تھے، یہ سب لڑکیاں جو سب اس سے عشقیہ خط وکتابت کرنا چاہتی تھیں۔ بعض تو ملاقات کی تجویزیں بھی پیش کرتی تھیں۔ ان کو یہ نہ معلوم تھا کہ امرکمار دنیا میں صرف ایک ہی لڑکی سے محبت کرتا ہے اور وہ ہے۔ اس کی بیوی آشا! اور بیوی کا خیال آتے ہی امرکمار نے سوچا۔ '' ہے بھی اور نہیں بھی!''

تیسرا خط کھول کر پڑھا تو امرکمار کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے کیونکہ خط میں لکھا تھا۔

> ''شری امرکمار جی! میں آپ کے لیکھ بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور اس سلسلے میں کچھ بات چیت کرنے کے لیے آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ دلّی آنے کی کرپا کریں گے؟
>
> —آپ کا سونا داس ڈالیریا۔''

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ خط واقعی سونا داس ڈالیریا نے بھیجا ہے یا کسی نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے' آزاد قلم' کے اڈیٹر رام رتن آزاد صاحب ٹہلتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ گنجا سر، آنکھوں پر چشمہ' منہ میں پائپ' پتلون میں پرانی قسم کی گیلس لگائے ہوئے۔ آزاد صاحب پچھلے تیس برس سے یہ اخبار چلا رہے تھے۔ کتنی بار جیل گئے۔ نہ جانے کتنا جرمانہ ادا کیا، دو دفعہ غنڈوں کے ہاتھ مار پڑی— مگر ان کی پیشانی پر کبھی بل نہ آیا۔ ان سب خطروں کو وہ ایک بیباک جرنلسٹ کی زندگی کا ایک ضروری جز سمجھتے تھے۔ اس لیے پچپن برس کے ہو گئے تھے لیکن

آج تک انھوں نے شادی نہیں کی تھی نہ کرنے کا ارادہ تھا۔ لوگ کہتے تھے۔ ''رام رتن کی شادی تو ان کے اخبار سے ہوگئی ہے۔ جہیز میں ان کو ایک آزاد قلم اور روشنائی کی ایک دوات ملی ہے جس کے چھینٹوں سے ہر سفید پوش ڈرتا ہے۔'' وہ دفتر میں سب سے پہلے آتے تھے اور آدھی رات گئے سب کے بعد جاتے تھے۔ جب اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے، پروف پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو پائپ کا کش کھینچتے ہوئے اپنے اسٹاف کے کام کی نگرانی کرتے۔

امر کے چہرے ہی سے آزاد صاحب نے بھانپ لیا کہ جو خط وہ ہاتھ میں لیے ہوئے ہے، وہ کوئی معمولی خط نہیں ہے۔ مگر اُن کا قاعدہ تھا کہ خود براہ راست سوال نہیں کرتے تھے، مذاق مذاق میں بات نکلوالیا کرتے تھے۔

''امر کیا ہوا؟'' آزاد صاحب نے پائپ کو منہ سے نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''اتنے پریشان کیوں ہو؟''

امر کمار نے اپنی پریشانی کی وجہ بے ساختہ بتا ہی دی۔ ''سیٹھ ڈالیریا نے دِلّی بلایا ہے۔ سیٹھ جی سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک چٹھی ڈال دی اور میں بھاگا چلا آیا تا کہ وہ مجھے غنڈوں سے پٹوادیں۔'' اور یہ کہہ کر اس نے ثبوت کے لیے دو خط ایڈیٹر صاحب کے حوالے کر دیا۔

غور سے پڑھنے کے بعد آزاد صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں ڈر گئے۔؟'' اور خط امر کمار کو واپس کر دیا۔

''نہیں آزاد صاحب!'' امر کمار نے تجلدی سے جواب دیا کہ کہیں اُس کی ساکھ نہ چلی جائے۔ ''آپ تو جانتے ہی ہیں۔ میں شیطان سے بھی نہیں ڈرتا۔''

''تو پھر تم آج ہی دِلّی جانے کی تیاری کرو۔'' ایڈیٹر صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔ اور جرنلزم کا وہ اصول دوہرایا جو انھیں عمر بھر کا آدرش رہا تھا۔ اور جس کے لیے ''آزاد قلم'' اپنے مخالفوں میں بھی مقبول تھا۔ کیونکہ اُس کے کالم اُن کے خیالات کے اظہار کے لیے بھی کھلے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ''بات دشمن کی بھی سننی چاہیے۔'' تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بہت دور کچھ دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اور پھر سیٹھ ڈالیریا کوئی معمولی دشمن نہیں ہے۔''

کبوتر اور انسان

ہاتھ سانولا تھا، بھدا تھا، ہاتھ کی اُنگلیاں موٹی اور چھوٹی تھیں۔ مگر اُن میں دو انگوٹھیاں تھیں اور انگوٹھیوں پر بڑے بڑے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ہاتھ لینا جانتا تھا۔ ہاتھ دینا بھی جانتا تھا۔ سود لینا جانتا تھا۔ بھیک دینا جانتا تھا۔

ہیرے کی انگوٹھیوں والے انگلیوں نے اناج سے بھرے ایک بلوری پیالے میں غوطہ لگایا۔ اور مٹھی بھر دانے نکال کر دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے پھینک دیئے دانوں کے زمین پر گرتے ہی سینکڑوں کبوتر جو انتظار میں منڈلا ہی رہے تھے۔ جھپٹ پڑے اور اپنی چونچوں سے دانوں پر ٹھونگیں مارنے لگے۔

ہاتھ سانولا تھا، بھدا تھا، ہاتھ کی انگلیاں موٹی اور چھوٹی تھیں۔ مگر اُن میں دو انگلیاں تھیں اور انگوٹھیوں پر بڑے بڑے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ہاتھ لینا جانتا تھا۔ ہاتھ دینا جانتا تھا۔ سود لینا جانتا تھا۔ بھیک دینا جانتا تھا۔

ہیرے کی انگوٹھیوں والی انگلیوں نے سکوں سے بھرے ہوئے ایک بلوری پیالے میں غوطہ لگایا اور مٹھی بھر سکے دوسری منزل کے کھڑکی سے نیچے پھینک دیے، سکوں کے زمین پر گرتے ہی درجنوں ننگے، ادھ ننگے بھکاری جو انتظار میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے، سکوں پر جھپٹ پڑے

اور لگے ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کرنے۔

یہ سیٹھ سوناداس ڈالیریا کا روز صبح کا معمول تھا۔ پہلے اشنان پھر پوجا پاٹھ پھر پیٹ پوجا۔ یعنی گھی درجن بھر پوریوں کا ناشتہ چار قسم کی ترکاریوں کے ساتھ اور آدھ سیر ربڑی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ یہ دو مٹھی دان کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کا من شانت ہو جاتا تھا اور پھر وہ اپنی ساری توجہ دھندے اور بیوپار کی طرف مبذول کر سکتے تھے۔

دان کرنے کے بعد توند پر ہاتھ پھیرتے، ڈکار لیتے ہوئے سیٹھ جی اپنی پیڑھی پر آتے جہاں سے وہ چھ ٹیلیفونوں کے ذریعہ اپنی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی بزنس کو چلاتے تھے۔ ایک بہت بڑے ہال میں ایک نچلا سا چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر گدے لگے تھے۔ دیوار کے سہارے تکیے رکھے تھے۔ تکیوں کے اوپر پچھلی ساری دیوار پر تصویریں لگی تھیں۔ دیوی دیوتاؤں کی، سیٹھ جی کے باپ دادا، پردادا کی، وائسرائے اور گورنروں کی، چیمبر آف کامرس کے گروپ فوٹو تھے اور تین بڑی بڑی اور بڑی پرانی گھڑیاں بھی دیوار پر لگی تھیں مگر یہ سب اس وقت خاموش تھیں اور الگ الگ وقت بتا رہی تھیں اور دوسری طرف دیوار پر ایک لمبا چوڑا دنیا کا نقشہ بنا تھا۔ جس پر ہر وہ ملک اور ہر وہ شہر دکھایا گیا تھا، جہاں ڈالیریا انڈسٹریز کی شاخیں تھیں۔ جہاں سیٹھ جی بیٹھتے تھے، وہاں تین طرف سہارا لینے کے لیے گاؤ تکیے لگے تھے۔ چوتھی طرف یعنی سامنے ایک لمبی سی چوکی تھی جس پر ایک گلوب رکھا تھا۔ دوسری طرف گئو ماتا کی ایک چھوٹی سی مورتی اور بیچ میں ایک چوکور بلور کا پیالہ، جو سکوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے حقیر سکے پانچ پیسے، تین پیسے اور دو پیسے کے نہیں، جو سیٹھ صاحب دان کرتے تھے بلکہ دوسرے ملکوں کے قیمتی اور بیش بہا سکے۔ سیٹھ صاحب بات کرتے کرتے ان سکوں سے کھیلتے رہتے ...... مٹھی بھر کر آہستہ آہستہ گراتے رہتے۔ شاید گنتے بھی رہتے۔ بالکل جیسے کوئی مالا جپتا ہے یا تسبیح کے دانے گھماتا ہے۔

سیٹھ صاحب اپنی گدی پر پدھارے ہی تھے کہ اندرونی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی جس پر وہ اپنے سکریٹری سے بات کر سکتے تھے۔ ٹیلی فون اٹھاتے ہی ان کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان اور خوشی کے آثار پیدا ہوئے۔ اپنے سکریٹری سے انھوں نے کہا۔ ''بھیج دو۔ اور سنو، کوئی ٹیلی فون آئے تو خود ہی بات کر لینا ہمیں ڈسٹرب نہ کرنا۔''

ٹیلی فون واپس رکھ کر ان کا ہاتھ ایک بجلی کے بٹن کی طرف بڑھا۔ جس کے تاروں کے نیچے 'آزاد قلم' کے ہندی، اردو اور انگریزی کے ایڈیشن پڑے ہوئے تھے۔ سیٹھ سونا داس ڈالیریا نے بجلی کا بٹن دبایا۔ جیسے نیچے پڑے ہوئے اخباروں کی سرخیوں کو مسل رہے ہوں۔

ہال کا دروازہ کھلا اور امر کمار اندر داخل ہوا۔ وہ اپنا اکلوتا نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کندھے پر برساتی پڑی ہوئی تھی۔ دروازہ جو ایک ملازم نے کھولا تھا اب بند ہو گیا۔ امر کمار نے ہال کی لمبائی چوڑائی کا جائزہ لیا۔ چھت میں لگے ہوئے جھاڑ فانوس کو دیکھا۔ ہال کی سجاوٹ پر نظر ڈالی۔ طاقچوں میں سنگ مرمر کی یونانی مورتیاں رکھی تھیں، کہیں کہیں ہندوستانی سنگتراشی کے نمونے بھی تھے۔ ہال خالی تھا، صرف دوسری طرف جدھر چبوترہ تھا اور چبوترہ پر سیٹھ جی کی گدی اور دو نیچی نیچی چوکیوں پر چھ ٹیلی فون رکھے تھے، ادھر عین سیٹھ صاحب کے سامنے باریک کھدائی کے کام کی ایک کرسی رکھی تھی۔ اسی کرسی کی طرف اب امر کمار بڑھا۔ اور اس نے سامنے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی سلک کا کرتا پہنے، دھوتی باندھے، گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے بڑے اطمینان سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ موٹی موٹی مونچھوں کے نیچے موٹے موٹے ہونٹ تھے جو اس کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

سیٹھ ڈالیریا نے دیکھا کہ ایک لمبے قد کا نوجوان ان کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ ان کی جہاندیدہ نگاہوں نے امر کمار کے لباس کا جائزہ لیا۔ کالے جوتے گھسے ہوئے تھے اور شاید ان کے اندر موزے پھٹے ہوئے تھے۔ پتلون کسی قدر اونچی ہو گئی تھی تین چار سال پہلے کا فیشن تھا یا دھوبی کے ہاں دھلتے دھلتے یہ حال ہو گیا تھا۔ ٹائی معمولی اور سستی تھی کالر میں نہ کلپ لگی تھی۔ نہ استری کیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سیٹھ ڈالیریا نے سوچا— ''اس نوجوان کو قابو میں کرنا مشکل نہیں ہوگا'' اور ان کی مونچھوں کے نیچے موٹے موٹے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور ابھر آئی۔ پھر بھی اس کے انداز میں، اس کی آنکھوں کی چمک میں، جس میں لاابالی طریقے سے اس نے اپنی برساتی کو کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ ایک خودداری بلکہ سرکشی کی جھلک تھی اور یہ بھی سیٹھ صاحب کو پسند تھی۔ جب نوجوان اس کے سامنے پہنچ ہی گیا اور کرسی کے پاس کھڑے ہو کر ایک خاموش سوالیہ نگاہ ان پر ڈالی تو سیٹھ صاحب نے ہاتھ پھیلا کر کرسی کی طرف اشارہ کیا— 'پدھاریے امر کمار جی!' اور

اسی 'جی' میں بہت کچھ معنی چھپے ہوئے تھے۔

'شکریہ—!' امرکمار نے اپنی برساتی کو کندھے سے اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا اور کرسی پر بیٹھ کر سیٹھ صاحب کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ سیٹھ صاحب مسکرا رہے تھے۔

امرکمار کو اس مسکراہٹ پر غصہ آرہا تھا۔

سیٹھ صاحب کی انگلیاں سکوں سے کھیل رہی تھیں۔

امرکمار کو جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ آخر سیٹھ کا بچہ بولتا کیوں نہیں۔

سیٹھ خاموشی سے امرکمار کو ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے شیر شکار پر جست لگانے سے پہلے خاموشی سے فاصلہ کا اندازہ لگاتا ہے۔

آخر کار امرکمار کو ہی بولنا پڑا— ''سیٹھ صاحب! آپ کے خط میں لکھا تھا کہ آپ مجھ سے ان آرٹیکلس کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ جو میں نے آپ کے خلاف لکھے ہیں۔''

بلوری پیالے میں سکے گرنا بند ہو گئے۔ بڑی ہی ملائمت، بڑی ہی نرمی سے سیٹھ صاحب بولے— ''تم نے میرے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ تم نے جو کچھ لکھا ہے، سچائی کی طرف داری میں لکھا ہے۔ جنتا کی بھلائی کے لیے ہی تو لکھا ہے—''

امرکمار کو امید تھی کہ سیٹھ ڈالیریا چیخے گا' دھمکیاں دے گا، شاید غنڈوں سے پٹوائے گا۔ یہ مٹھاس بھرا لہجہ سن کر وہ حیرت میں رہ گیا— کیا یہ واقعی سمجھتا ہے کہ میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاؤں گا؟ یا ہوسکتا ہے یہ مجھ پر صرف ہنس رہا ہے۔ طنز کر رہا ہے۔

''آپ نے میرا مذاق اڑانے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟'' وہ کسی قدر اونچی آواز اور کڑوے لہجہ میں بولا— ''اسی لیے میں آنا نہیں چاہتا تھا مگر ایڈیٹر صاحب نے مجبور کیا' ان کا کہنا ہے کہ اپنے دشمنوں کی بات سننا چاہیے۔''

''تمھارے ایڈیٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں—'' سیٹھ ڈالیریا کے لہجہ میں اب بھی وہی مکھن مٹھاس تھی۔ ''لیکن میں تمھارا دشمن نہیں ہوں' تمھارا دوست ہوں۔ جب ہی تو تم سے ملنا چاہتا تھا—''

امرکمار نے ایک جیب سے نوٹ بک نکالی' دوسری جیب سے اپنا قلم نکالا اور بڑے غیر

متعلق انداز میں کہا۔ ''فرمایئے' کیا کہنا ہے؟ ہم آپ کا انٹرویو بھی چھاپنے کو تیار ہیں۔''

''نا۔نا۔نا!'' سیٹھ صاحب نے ہاتھ ہلا کر انکار کیا۔ پہلی بار ان کے ٹھنڈے لہجہ میں گرمی آئی۔ ''مجھے جو کہنا ہے وہ پیپر میں چھپنے کے لیے نہیں ہے۔ صرف تمھارے سننے کے لیے ہے۔''

''امرکمار جی۔!'' سیٹھ صاحب نے گاؤ تکیہ چھوڑ کر آگے آتے ہوئے کہا۔ 'تم ایک معمولی جرنلسٹ نہیں ہو۔ تمھارے قلم میں بڑی شکتی ہے تم جو لکھتے ہو سب لوگ اسے بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں،' پھر ایک ایک لفظ کو تول کر جانچ کر ادا کیا۔ ''اور ان لوگوں میں میں بھی ہوں۔''

اب تو امرکمار شبہ میں پڑ گیا۔ کیا یہ واقعی طنز ہے؟ کوئی چال ہے؟ یا سچ مچ ایک کروڑ پتی سرمایہ دار ایک سوشلسٹ اخبار نویس کی لکھائی سے متاثر تھا۔ ''آپ میرا لکھا، دلچسپی سے پڑھتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''سیٹھ ڈالیریا کا جواب اور بھی اچنبھے میں ڈالنے والا تھا..... ''کیوں نہیں! تم جو لکھتے ہو، اس میں بڑی سچائی ہوتی ہے۔''

میں نے لکھا ہے کہ آپ کی بمبئی کی بستیوں میں آپ کے غریب کرائے دار اندھیری جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، جہاں پہنچنے کے لیے ایک گندی دلدل میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ''اس کی آواز اونچی ہوتی گئی'' میں نے لکھا ہے کہ آپ کے ملوں میں مزدوروں کو مزدوری اتنی کم ملتی ہے کہ ان ملوں کو بند کر دیا جائے تو اچھا ہے'' اس کی آواز اور اونچی ہوگئی اور اس میں ان تمام لوگوں کی آوازوں کی گونج سنائی دینے لگی جن کے خون پسینے سے سیٹھ ڈالیریا نے اپنی دولت کمائی تھی۔ ''میں نے لکھا ہے کہ آپ تیس کمپنیوں کے مالک ہیں اور ہر کمپنی ہر سال گھاٹا دکھاتی ہے جبکہ آپ کی اپنی تجوریوں میں کروڑوں روپے بھرتے جاتے ہیں۔ کیا آپ ان سب باتوں کو سچ مانتے ہیں؟''

امرکمار کی آواز میں، اس کے سوال کرنے کے انداز میں ایک چیلنج تھا لیکن سیٹھ ڈالیریا کے ماتھے پر شکن بھی نہ پڑی، نہ اس کی آواز اونچی ہوئی۔ اسی میٹھے دھیمے لہجہ میں اس نے جواب دیا 'جب تم نے لکھا ہے تو سچ ہی ہوگا!'

امرکمار حیرت میں رہ گیا کہ سیٹھ اس کی باتوں سے کیسے اتفاق کر سکتا ہے۔ پھر پہلو بدلتے

ہوئے سیٹھ صاحب نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''تب ہی تو سوچتا ہوں کہ اپنی بستیوں کی گندی اور اندھیری جھونپڑیوں کو تڑوادوں اور اسی زمین پر اونچی اونچی بلڈنگیں بنواؤں اور ایک ایک فلیٹ لاکھ لاکھ روپے میں بیچوں...... پھر دوسرا پہلو بدل کر وہ بولتے ہی گئے۔ ''میری ملوں میں اتنا کپڑا تیار ہو چکا ہے کہ ہم اسے کئی برس تک بیچ سکتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ بیچارے مزدوروں کو کم مزدوری دینے کی بجائے ملیں ہی بند کرادوں۔''

اب امر کمار کی کچھ کچھ سمجھ میں آرہا تھا کہ سیٹھ ڈالمیا دفعتاً مزدوروں اور غریبوں کا ہمدرد نہیں ہو گیا، پھر بھی اس کی ساری باتیں سمجھ میں نہیں آئی تھیں سو اس نے پوچھا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بے انصافی مل مزدوروں ہی کے ساتھ نہیں ہو رہی ہے بلکہ تم جیسے قابل جرنلسٹ کے ساتھ بھی ہو رہی ہے۔ سیٹھ صاحب کی اس بات سے تو امر کمار بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے پیشوں کے مقابلہ میں رپورٹروں کو تنخواہ ہی کیا ملتی تھی؟ لیکن ایسا لگتا تھا کہ سیٹھ صاحب نہ صرف یہ جانتے ہیں کہ اس کو تنخواہ کیا ملتی ہے بلکہ اس کی آمدنی خرچ کی ایک ایک تفصیل سے واقف ہیں۔ اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک صندوقچی سے کاغذ کا ایک پرچہ نکال کر اس کو دیکھتے ہوئے سیٹھ صاحب بولتے جارہے تھے۔

''اتنا اچھا لکھنے والے کو صرف پانچ سو روپے مہینہ۔ اس میں سے پچاس روپے تو انکم ٹیکس اور پروویڈنٹ فنڈ کے ہی کٹ جاتے ہیں۔ ڈھائی سو روپے مہینہ چھوٹی سی فلیٹ کا کرایہ دیتے ہو، وہ چار مہینے سے ادا نہیں کر سکے۔ تین مہینے سے دودھ والے کا بل نہیں دیا۔ تین سو چالیس روپے بنیے کے دینے ہیں۔''

اب تو امر کمار سے نہ رہا گیا۔ ایک دم وہ کھڑا ہو گیا۔ اور چلّا کر بولا۔ ''آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟ کیا دوسرے دھندوں کے ساتھ آپ جاسوسی بھی کرتے ہیں؟''

سیٹھ صاحب نے اپنا ملائم لہجہ نہیں بدلا۔ ''آرام سے بیٹھئے، امر کمار جی'' اور جب امر بیٹھ گیا تو کہا۔ ''سب کے بارے میں سب کچھ جاننا تمھارا کام ہے اور میرا بھی۔ بہت کم باتیں ایسی ہیں جو میں نہیں جانتا۔''

''امر کمار نے للکارنے کے انداز میں جواب دیا۔'' آپ مجھے نہیں جانتے۔'''' بہت اچھی طرح جانتا ہوں— '' جواب ملا۔ ''سات برس سے جرنلزم کر رہے ہو، بڑے جوشیلے انقلابی وچار رکھتے ہو۔ تب ہی تو تمھارے اخبار کے مالک تم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن اتنی کم تنخواہ پر تم اپنی بیوی کو سکھ نہیں دے سکتے ہو؟ تب ہی تو وہ تمھیں چھوڑ کر چلی گئی ہے!''

یہ امر کمار کی دکھتی رگ تھی۔ وہ بے تحاشہ چلاّیا— ''یہ جھوٹ ہے وہ صرف چند دنوں کے لیے میکے گئی ہے۔ اپنے پتاجی کے پاس!''

سیٹھ ڈالیریا نے پھر اپنے ہاتھ کی پرچی پر نظر ڈالی۔ ''پورے تین مہینے۔ چند دن نہیں ہوتے، امر کمار جی! لیکن مجھے مسز امر کمار سے پوری ہمدردی ہے۔ صرف روٹی اور آدرش پر گذارا نہیں ہوسکتا، زندگی میں کچھ اور بھی چاہیے۔''

''اور کیا چاہیے؟'' امر کمار نے سوال کیا۔

جواب میں سیٹھ صاحب نے مٹھی بھر سکے اپنے سامنے کی میز پر پھینک دیے ''یہ چاہیے—'' اور پھر ایک ایک سکے کی طرف اشارہ کر کے کہا— یہ ڈالر ہے، یہ پاؤنڈ ہے۔ یہ مارک ہے، یہ فرینک ہے، یہ روبل ہے، اور یہ ہمارا ہندوستانی روپیہ ہے سب گول ہیں۔ سب چکر کھاتے ہیں اور ان کے گرد دنیا چکر کھاتی ہے—''

اب معاملہ صاف ہوتا جا رہا تھا، سیٹھ صاحب روپیہ دے کر اس کا منہ— اور قلم— بند کرنا چاہتے تھے۔ امر کمار کو یہ امید نہ تھی کہ اتنے بھدّے طریقے سے اسے رشوت دینے کی کوشش کی جائے گی۔

''اور آپ سمجھتے ہیں ان سکوں سے— ان چاندی سونے کے ٹکڑوں سے آپ مجھے خرید سکتے ہیں؟''

''رام! رام! رام!'' سیٹھ ڈالیریا نے جواب میں کہا— '' تم بھی بڑے شکّی مزاج کے ہو— بیچنے خریدنے کی بات کون کر رہا ہے۔ میں نے تمھارا اپائنٹمنٹ کر دیا ہے۔ پبلک ریلیشنس آفیسر۔ ڈھائی ہزار روپے مہینہ۔ انکم ٹیکس ہم دیں گے۔ ساتھ میں فری ہاؤس۔ فری کار—''

امر کمار نے سیٹھ صاحب کی طرف دیکھا۔

سیٹھ صاحب نے امر کمار کی طرف دیکھا.....امر کمار اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس کے سر کے عین اوپر سیٹھ صاحب کا قیمتی پچیس فانوسوں والا جھاڑ جگمگا رہا تھا۔

امر کمار نے سیٹھ صاحب کی طرف قدم بڑھایا

سیٹھ صاحب نے مسکرا کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اپنے نئے ملازم سے ہاتھ ملانے کے لیے ''تو پھر سب طے ہو گیا نا؟''

سیٹھ ڈالیریا کا ہاتھ ہوا میں اٹھا کا اٹھا ہی رہ گیا۔ ان کے سامنے کھڑے ہو کر امر کمار نے جواب دیا۔ ''نہیں ڈالیریا جی! دنیا میں ایک طاقت آپ کے روپے، اور ڈالر اور پاؤنڈ سے بھی بڑھ کر ہے۔''

بڑا معصوم چہرہ بنا کر سیٹھ ڈالیریا بولا۔ ''امر کمار جی وہ کیا ہے؟''

امر کمار نے ایک ڈرامائی انداز میں اپنا قلم سیٹھ صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ ''وہ ہے میرا قلم! کیا آپ اس کی قیمت بتا سکتے ہیں؟''

اب سیٹھ صاحب مسکرائے۔ ''سولہ روپے پچاس پیسے۔ میری ہی فیکٹری کا بنا ہوا ہے۔''

امر کمار کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔

''مگر سنو امر کمار جی!'' سیٹھ صاحب بولے۔ ''تم آج فیصلہ نہیں کر سکتے تو ایک دن اور سوچ لو۔ میں تمہیں کچھ اور وقت دے سکتا ہوں۔''

امر کمار نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ مجھے کیا وقت دیں گے؟ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے، وہ دیکھیے آپ کی تمام گھڑیاں بند ہو چکی ہیں۔''

سیٹھ صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ واقعی تینوں گھڑیاں بند تھیں۔ ان کی خاموش سوئیاں الگ الگ وقت بتا رہی تھیں۔

اب امر کمار ہال کے دوسرے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سیٹھ سونا داس ڈالیریا کی آواز نے اسے وہیں جا پکڑا۔

''امر کمار جی! میں کل تک تمھارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔ اپنی شریمتی سے ضرور صلاح کر لینا۔''

امر کمار نے یہ سنا اور بغیر جواب دیے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس نے ہاں نہیں کی مگر

سیٹھ ڈالیریا نے اپنے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے سوچا۔ اس نے نا بھی نہیں کی۔'
اور اب سیٹھ کے چہرے پر دہ کر خشگی اور وہ غصہ، وہ جھلاّ ہٹ ابھر آئی جس کو اب تک وہ اپنی نقلی ملائمیت کے پردے میں چھپائے ہوئے تھا۔ دانت بھینچ کر اس نے کہا۔ ''ابھی ہمارا وقت ختم نہیں ہوا۔ امر کمار جی!'' اور ڈارٹ کا تیر اس کے ہاتھ سے اڑ کر دنیا کے نقشے پر بمبئی کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

O

رات خوب صورت ہے...

ایئر ہوسٹس ہندوستانی تھی، مگر وہ نہ صرف انگریزی انگریزوں کی طرح بولتی تھی، بلکہ ہندوستانی بھی انگریزوں کی طرح بولتی تھی۔ ''ہمارا دیمان دہلی سے بمبئی تک کا بارہ سو کیلو میٹر کا فاصلہ ایک گھنٹے پچاس منٹ میں طے کرے گا۔ یاتریوں سے بنتی کی جاتی ہے کہ اپنی اپنی کرسی کی پٹی باندھ لیں اور دھمر پان نہ کریں۔''

ہمیشہ کی طرح آج بھی ہوائی جہاز مسافروں سے بھرا ہوا تھا، ان ہی مسافروں میں ایک امر کمار بھی تھا۔ جو کسی قدر سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ سیٹھ ڈالیریا سے ملاقات کا سارا ڈراما اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ کیا اتنی بڑی نوکری کو ٹھکرا دینا عقلمندی تھی؟ آزاد صاحب کے لیے ہر چیز کو اپنے آدرش پر قربان کر دینا ٹھیک ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی آگے پیچھے مگر جس کی شادی ہو چکی ہو، جس کی بیوی امیر باپ کی بیٹی ہو اور جو قرض داروں سے تنگ آ کر اپنے میکے چلی گئی ہو۔ اس کا فرض کیا ہے؟ ''اس کا آدرش کیا ہے؟ امر کمار شاید راستہ بھر اسی خیالی ادھیڑ بُن میں لگا رہتا اگر اس کے برابر والے بوڑھے مسافر نے ایئر ہوسٹس کی پیش کی ہوئی ٹرے میں سے مٹھائی کی گولی اٹھانے کی بجائے، روئی کے دو پیکٹ نہ اٹھائے ہوتے۔ ''اس اناڑی کو بھی میرے پاس ہی بیٹھنا تھا'' امر کمار نے سوچا۔

روئی نکال کر کان میں ٹھونستے ہوئے اس بوڑھے نے ایئر ہوسٹس سے کہا۔ ''مس صاحب! میرا دل؟''

''کیا ہوا آپ کے دل کو؟'' ایئر ہوسٹس نے پوچھا۔ ''اگر چہ اس نے 'ڈل' کہا تھا۔

''دھڑکتا ہے۔'' بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔ اس ہوائی جہاز میں کوئی خطرہ تو نہیں۔؟''

ایئر ہوسٹس نے اس یقین دلایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں 'پلین' پریشرائزڈ' ہے اور وہ آگے بڑھ گئی۔ مگر جس طرح بوڑھا، گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اس کو اب بھی پورا اطمینان نہیں ہوا تھا۔

''آپ پہلی بار ہوائی جہاز سے سفر کر رہے ہیں؟'' امر کمار نے بوڑھے سے پوچھا۔'' آپ پہلے کبھی بمبئی گئے ہیں؟''

''نہیں'' بوڑھے نے جواب میں سر ہلایا۔ گنجی کھوپڑی کے اردگرد سفید بالوں کی ایک جھالر سی تھی۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ساری عمر ہو گئی، یہی سپنا دیکھتا رہا کہ مرنے سے پہلے ایک بار بمبئی ضرور جاؤں گا۔ پر اب جو جا رہا ہوں تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

امر نے اسے تسلی دلانے کے لیے کہا۔ ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں آپ کو بمبئی پسند آئے گا۔''

''بڑا شہر ہے نا!''

''بہت بڑا۔''

''سنا ہے خوب صورت شہر ہے؟'' بوڑھے کی آنکھیں ابھی سے بمبئی کے حسین نظارے دیکھ رہی تھیں۔

''بہت خوب صورت!'' امر کمار نے جواب دیا۔ اور اس کے دماغ میں بھی پہلی بار ٹرین سے بمبئی آنے کے یاد تازہ ہو گئی۔ ''سات برس ہوئے میں ایک ہفتہ کے لیے بمبئی آیا تھا۔ اور اب میں وہیں مستقل رہتا ہوں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے۔؟''

بوڑھے نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ جیسے کوئی بڑی مجبوری تھی جو اسے بمبئی لے جا رہی تھی۔ ''لگتا ہے اب ہمیشہ بمبئی میں رہنا پڑے گا۔''

ہوائی جہاز کی دواور سیٹوں پر دو مسافر باتوں میں مصروف تھے۔ ان میں ایک بیس اکیس سالہ نوجوان تھا جس کے بال گھنے اور کالے تھے۔ جو مبلیلو جیسے کپڑے پہنے تھا اور مبلیلو جیسی ہی جس کی لمبی لمبی قلمیں تھیں اور جو انگریزی ایسی بولتا تھا جیسے اسکول میں کتاب سے نہ سیکھی ہو، سنیما میں امریکن فلموں سے سیکھی ہو۔ وہ جلدی جلدی ترشے ہوئے جملے بولتا تھا۔ جیسے مشین گن چل رہی ہو، نہ صرف اس کے جوتے لمبے اور نوکیلے تھے، نہ صرف اس کی پتلون پتلی مہری کی تھی بلکہ اس کی ہر بات اور ہر چیز نوکیلی تھی۔ نوکیلی اور چاقو کی دھار کی طرح تیز— ایسا لگتا تھا اس میں ہر طرف تیز چبھنے والی نوکیں ہی نوکیں نکلی ہوئی ہوں۔

یہ نوکیلا نوجوان تاش کے پتوں کے کمال، اپنے برابر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہم سفر کو دکھا رہا تھا۔ تاش کی گڈی کی پھینٹ کر تین پتے نکالے۔ جب ان کو نکالا تو تینوں اِکّے نکلے پھر اس نے تاش کی گڈی جیب میں رکھتے ہوئے کہا— ''ٹیک مائی ٹپ مسٹر......؟''

'ٹیکم چند' برابر بیٹھے ہوئے خوش پوش چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے نوجوان نے اپنا نام بتایا— ''مگر سب ہی دوست مجھے ٹوٹو کہتے ہیں۔''

''مسٹر ٹوٹو! پلین یا ٹرین میں کسی مینیجر کے ساتھ کارڈ مت کھیلنا۔'' ''تھینکس فار دی ٹپ۔'' ٹوٹو نے جواب دیا۔'' بھئی تمھارے ساتھ سفر اچھا کٹا۔ بائی دی وے آج میرے گھر پر ایک لمنائٹ پارٹی ہے تم کو آنا ہی ہوگا یہ لو میرا کارڈ۔''

نوکیلے نوجوان نے کارڈ لے کر پتہ غور سے پڑھا اور اس کے ہونٹوں سے ایک سیٹی نکل گئی۔ برابر والا نوجوان واقعی کوئی لکھ پتی یا کروڑ پتی تھا تب ہی تو بمبئی کی سب سے بڑھیا بلڈنگ میں رہتا تھا۔ ''تھینکس ضرور آؤں گا— فورمل ڈریس—''

''ڈریس؟ ڈریس کوئی بھی پہن کر آ سکتے ہو۔'' ٹوٹو نے ہنس کر کہا— ''مگر ایک شرط ہے۔ پارٹنر ساتھ ہونی چاہیے اور وہ تمھاری بیوی نہ ہو تو بہتر ہے۔''

''میری پارٹنر تو ایک دم فرسٹ کلاس ہوگی—'' نوکیلے نوجوان نے جواب دیا— ''اور وہ میری بیوی نہیں ہوگی—'' پھر وہ اپنے مذاق پر اپنے آپ ہی ہنسا۔

ٹوٹو نے پوچھا— ''بائی دی وے تمھارا بزنس کیا ہے؟''

جواب دینے سے پہلے نوکیلے نوجوان نے سوچا۔ "کیا واقعی اپنا بزنس بتادے؟ نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ فی الحال تو ہنسی مذاق میں ٹال دینا ہی بہتر ہے۔" "ایک قسم کا امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ اسے ٹرانسپورٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اِدھر سے مال اُدھر۔ اور اُدھر سے مال اِدھر۔"

ٹوٹو کچھ نہ سمجھا۔ پھر بھی 'اچھا اچھا' کہہ کر ہنس دیا مگر نوکیلے نوجوان نے سوچا میں نے ضرورت سے زیادہ باتیں کرلی ہیں۔ اب یہاں سے ذرا کھسکنا ہی بہتر رہے گا۔"

"ایکسکیوزمی!" کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا اور سامنے کی طرف چل کھڑا ہوا۔ جہاں اخبار اور رسالے وغیرہ رکھے رہتے ہیں۔"

ہوائی جہاز کا بیچ کا راستہ بہت تنگ ہوتا ہے۔ ادھر سے ادھر جاتے ہوئے دو آدمی نہیں گزر سکتے۔ امرکمار کی ٹکر نوکیلے نوجوان سے ہو ہی گئی۔ اس نے "سوری" کہہ کر آگے جانے کی کوشش کی۔ مگر نوکیلے نوجوان کی آواز نے اس کا دامن تھام لیا۔ "یہ بٹوہ آپ کا ہے نا؟"

"اوہ تھینکس۔" امرکمار نے بٹوہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "جرنلسٹ کا پرس ہے۔ بالکل خالی۔" اور یہ غور نہیں کیا یہ بٹوہ اس بیٹل نما جوان کے ہاتھ میں کیسے آ گیا۔

امرکمار کو قریب سے گزرتے دیکھا تو ٹوٹو نے اسے پہچان کر روک لیا۔ "اے مسٹر جرنلسٹ! اِدھر آؤ بھائی!"

امرکمار برابر والی سیٹ پر بیٹھ تو گیا۔ مگر بڑی بے دلی سے 'ہیلو' کہہ کر ہاتھ ملایا۔ یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں تھی کہ وہ ٹوٹو کو پسند نہیں کرتا۔ اور شاید ٹوٹو بھی اس سے بہت محبت نہیں کرتا۔ دونوں کے دلوں میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ پھر بھی دنیاداری اور رکھ رکھاؤ بھی کوئی چیز ہے۔

ٹوٹو نے پوچھا۔ "آج رات تم کیا کررہے ہو؟"

"آفس میں رپورٹ ٹائپ کروں گا۔ امرکمار نے بڑے غیر متعلق انداز میں جواب دیا۔

"تو اس کے بعد ہمارے ہاں پارٹی میں ضرور آنا۔"

"تھینکس۔ کوشش کروں گا۔"

"اور ہاں! آشی کو بھی ساتھ لانا!"

اب وہ دل میں کھٹکنے والی بات سامنے آ گئی۔ امر کمار نے کسی قدر ترشی سے کہا۔ ''تمھارا مطلب ہے میری بیوی آشا!'' اس کو ٹوٹو کا بے تکلفی سے آشا کا نام لینا بالکل پسند نہیں تھا۔

''میرا مطلب ہے بیرسٹر رمیش چندر کی بیٹی اور میرے بچپن کی دوست آشی!''

ٹوٹو نے اپنا پرانا حق استعمال کرتے ہوئے جواب دیا مگر پھر بغیر خوشی کے زبردستی مسکرا کر۔ ''ویسے سنا ہے وہ تمھاری بیوی بھی ہے۔''

اور اس لمحے میں دونوں نے محسوس کیا کہ گفتگو مضحکہ خیز حد تک سیریس ہوتی جا رہی ہے اور دونوں ہنس دیے۔ مگر ہنسی آواز بن کر ہونٹوں سے نکلی تھی۔ دل سے نہیں۔

'نو کیلا نوجوان جہاز کے اگلے حصے میں ایک میگزین کے ورق الٹ رہا تھا مگر اس کی نگاہیں اس بوڑھے مسافر پر جمی ہوئی تھیں جو زور زور سے سانس لے رہا تھا اور اپنے بند گلے کے کوٹ کے بٹن کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کی انگلیوں میں جیسے طاقت ہی نہ رہی تھی۔ وہ دیر تک ایک ہی بٹن سے الجھا رہا۔

وہ نوجوان بوڑھے کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہی سیٹ جہاں پر اب تک امر کمار بیٹھا ہوا تھا۔ بوڑھے کے کوٹ کے بٹنوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا MAY I HELP YOU SIR بوڑھے بے چارے کو سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس نے سر ہلا دیا۔ نوجوان نے بٹن کھولنے شروع کر دیئے۔ تیسرا بٹن کھولا ہی تھا کہ اسے اندر کی جیب میں رکھے ہوئے نیلے نیلے نوٹوں کی گڈی کی ایک جھلک نظر آئی جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ جلدی سے وہ اگلا بٹن کھولنے میں مصروف ہو گیا۔

بوڑھے کو دل کا دورہ پڑ رہا تھا۔ اور بار بار اس کا ہاتھ سینے پر جاتا تھا۔ جہاں بڑے زور کا درد ہو رہا تھا۔ سانس اب رک رک آ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ جملہ پورا کر پایا۔ ''ابھی بمبئی کتنی دیر میں آئے گا؟''

اس کے جواب میں جیسے ایئر ہوسٹس کی آواز گونجی۔ ''اب ہم بمبئی پہنچنے والے ہیں۔ یاتریوں سے پرارتھنا کی جاتی ہے کہ اپنی اپنی کرسی کی پیٹی باندھ لیں اور دھمر پان نہ کریں......

ابھی ہمارا جہاز اترنے سے پہلے بمبئی کا ایک چکر لگائے گا کیبن کی روشنیاں بجھائی جا رہی ہیں تا کہ یاتری بمبئی کی روشنیاں دیکھ سکیں۔"

بوڑھا اب بالکل بے حال ہو چکا تھا۔ نوجوان نے اسے تسلی دلاتے ہوئے کہا: "بس اب آپ بومبے کی لائٹس دیکھ سکیں گے۔

بوڑھے نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں جس میں نہ صرف استعجاب تھا بلکہ بڑی مایوسی اور لاچاری تھی۔

اور اس پل میں ہوائی جہاز کی روشنیاں بجھ گئیں اور اندھیرے کے کالے سمندر میں بمبئی شہر کی روشنیاں تیرتی ہوئی چلی آئیں۔

نوجوان کی آواز آئی۔ "باہر دیکھو مسٹر! بومبے کی لائٹس دیکھو۔ کتنی بیوٹی فل نائٹ ہے۔"

'رات!' ٹوٹو نے گھومتے ہوئے شہر کی روشنیوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ رات ایک جوہری کی دوکان ہے جہاں کالے مخمل پر ہیرے بکھرے پڑے ہیں۔ نہیں یہ سب تو شاعری ہے۔ اس نے سوچا نیچے پھیلا ہوا کالا مخمل نہیں ہے اندھیرا سمندر ہے اور یہ ہیرے جواہرات نہیں ہیں۔ یہ سڑکوں، گھروں اور دوکانوں، ہوٹلوں، اور ریستورانوں، سنیما گھروں اور تھیٹروں، کلبوں اور ناچ گھروں کی روشنیاں ہیں۔ 'روشنیاں' نیون لائٹ میں لکھے ہوئے موٹروں اور بسکٹوں اور کپڑے کی ملوں، صابن کی ٹکیوں اور ناچ گانوں سے بھرپور فلموں کے لال پیلے نیلے رنگوں کے اشتہار ہیں۔ اور وہ لال رنگوں کی روشنی سے جلتا بجھتا ہوا صابن کا اشتہار ہے جو میرے گھر کی بالکنی سے دکھائی دیتا ہے۔

رات! امر کمار نے کھڑکی میں سے نیچے دیکھتے ہوئے سوچا۔ رات ایک حسین جادوگرنی ہے جس کی آنکھیں ایک ہزار ایک ہیں۔ ہر شام کو وہ شہر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتی ہے اور اس پر اپنا ستاروں ٹکا کامدانی کا دوپٹہ ڈال دیتی ہے۔ اور پھر صبح ہونے تک شہر کے سارے بھدّے خدوخال۔ شہر کے بدن پر جھولتے ہوئے میلے بدبودار چیتھڑے شہر کے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر خون اور پیپ سے رستے ہوئے ناسور اور زخم—وہ سب اس جادو کے دوپٹے سے ڈھکے رہتے ہیں۔ ہر برائی، ہر بدصورتی، ہر ظلم پر اندھیرے کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ رات کی طلسمی بانہوں میں

سمٹ کر شہر کے چہرے پر نکھار آ جاتا ہے۔ شہر حسین اور جوان اور صحت مند ہو جاتا ہے۔ روشنی کے لاکھوں دانتوں کی نمائش کرنے کے لیے شہر کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ بالکل جیسے کبھی آشا اور وہ ہنستے تھے۔ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی بات پر ہنستے تھے اب ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ اب ہم دل کھول کر کیوں نہیں ہنستے؟ ہمارے چہروں پر ہر وقت فکر، خفگی، کھسیاہٹ، جھلاہٹ، کیوں سوار رہتی ہے؟ پہلے وہ ایک دوسرے سے ایک پل کو جدا نہیں ہوتے تھے۔ اب (جیسا سیٹھ ڈالیریا نے اسے یاد دلایا تھا) آشا کو میکے گئے ہوئے تین مہینے ہو گئے ہیں اور اس کا گھر سونا پڑا ہے۔ اسے آج ہی رات کو آشا کو گھر واپس لانا چاہیے۔ مگر کیسے؟ کس وعدے پر؟ آشا کو قرضداروں سے چھٹکارہ چاہیے۔ اس نے دانت کچکچا کر سوچا — وہ امیر باپ کی بیٹی ہے نا! اسے بڑا فلیٹ چاہیے۔ موٹر چاہئے، نوکر چاہئے۔ وہ سب کیسے آئے گا —؟ اور جواب میں شہر نے گھومنا بند کر دیا۔ اور ایئر پورٹ کی روشنیوں نے اوپر اٹھنا شروع کر دیا۔ روشنیاں جواب سیٹھ ڈالیریا کی کالی چوکی پر پھیلے ہوئے سکے لگ رہی تھیں — یہ ڈالر ہے، یہ فرینک ہے، یہ پاؤنڈ ہے، یہ روپیہ ہے۔ اور ایک لمحہ کے لیے امر کمار کو ایسا لگا کہ ہوائی جہاز ان روشنیوں سے ان سکوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔ اور وہ سب سیٹھ ڈالیریا کے بلور کے پیالے کی کرچوں کی طرح ستارے بن کر آسمان میں بکھر جائیں گے۔

ایک جھٹکے کے ساتھ پہیوں نے زمین کو چھوا۔ ایئر پورٹ کی روشنیاں، تیزی سے اور پھر آہستہ آہستہ گزرتی گئیں، بریک لگے اور ہوائی جہاز ٹھہر گیا۔ تھرتھراتے ہوئے جیٹ انجن خاموش ہو گئے جیسے ہارٹ فیل ہو کر ان کا دم نکل گیا ہوا۔

جب سب مسافر اتر چکے اور امر کمار اپنا کیمرہ اور ٹائپ رائٹر لے کر باہر نکل رہا تھا تو ایک چیخ سنائی دی۔ امر الٹے پیروں بھاگا ہوا واپس پہنچا تو دیکھا ایئر ہوسٹس بوڑھے مسافر کے پاس کھڑی ہوئی ہے اور اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا ہے۔

''کیا ہوا مس؟'' امر کمار پوچھا۔

''دیکھیے تو شاید ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔''

امر کمار نے جلدی سے کیمرہ اور ٹائپ رائٹر پھینک کر بوڑھے کے دل پر ہاتھ لگا کر دیکھا

نبض دیکھی اور پھر بولا — ''بے چارہ بوڑھا کتنی حسرت تھی بمبئی دیکھنے کی۔ ایئر پورٹ کے ڈاکٹر نے سرسری سے معائنہ کرتے ہی تصدیق کی کہ بوڑھا مر چکا ہے — شاید ہارٹ فیل ہو کر۔

بوڑھے کی لاش کو نیچے اتارا گیا۔ پیچھے پیچھے امرکمار اور ایک پولس انسپکٹر تھے۔

''مسٹر امرکمار! آپ اس بے چارے کو جانتے تھے —؟''

''جی بس اتنا کہ راستے بھر یہاں پہنچنے کے لیے کتنا بے قرار تھا۔ اور اب وہ کبھی بمبئی نہ دیکھ سکے گا۔''

سانتا کروز ایئر پورٹ کی ہزاروں روشنیاں اندھیرے میں نیلی پیلی لال آنکھیں چمکا رہی تھیں۔ جیسے بمبئی آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ مگر امرکمار نے اسٹریچر کو ایمبولینس میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا کہ کمبل سے باہر بوڑھے کا ہاتھ نکلا ہوا ہے اور وہ ہاتھ خالی ہے اور اس نے سوچا کہ جس بیچارے نے عمر بھر بمبئی آنے کے خواب دیکھے تھے آج رات کی بانہوں میں ہمیشہ کے لیے سو چکا ہے۔

○

ایک ٹیکسی، دو مسافر

'ٹیکسی!' 'ٹیکسی'

'ٹیکسی!'

آوازیں دو بلند ہوئیں مگر سارے ایئرپورٹ پر ٹیکسی صرف ایک تھی۔ ''آپ کو کہاں جانا ہے؟'' سوال کرنے والا وہی نوکیلا نوجوان تھا جو ان کے ساتھ ہی ہوائی جہاز میں دہلی سے آیا تھا— اور اب ایک بھاری سوٹ کیس کو ٹیکسی کے پیچھے لدوا رہا تھا۔

''مجھے تو فلورا فاؤنٹن جانا ہے— اور آپ؟''

''جوہو ہوٹل، جل ترنگ کے پاس۔ وہاں سے یہ ٹیکسی آپ لے لیجیے۔ او۔ کے۔ اور امرکمار نے بھی اپنا سوٹ کیس ٹیکسی میں رکھ دیا۔'' ٹیکسی ایئرپورٹ سے نکل کر جوہو کی سڑک پر آئی تو امرکمار نے اپنے ساتھ والے نوجوان سے پوچھا— ''بھائی تم نے اس بے چارے بوڑھے کے بارے میں سنا جو تمھارے برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا؟''

نوجوان نے کسی قدر رگڑ کر جواب دیا— ''مسٹر! وہ تمھاری سیٹ تھی۔ میں تو ایسے ہی دومنٹ کے لیے بیٹھ گیا تھا۔''

''وہ بے چارا ہارٹ فیل ہو کر مر گیا۔'' امرکمار نے اس کو اطلاع دی—!

"آئی نو۔۔ پور فیلو! سنا پولیس تمھیں لے گئی تھی میں سمجھا تھا تمھیں دھر لیا!"

"پولیس والے سب مجھے جانتے ہیں۔" امر کمار نے اسے یقین دلایا۔

"REALLY! کیا تم بھی اندر ہو کر آئے ہو؟"

اور اس 'بھی' میں اس نوجوان نے سب کچھ کہہ دیا۔

"نہیں بھئی! میں تو رپورٹر ہوں!" امر کمار نے ہنس کر جواب دیا۔ "پولیس والوں کا ہم لوگوں سے ایسا ہی واسطہ پڑتا ہے رہتا ہے جیسے چور اچکوں سے،، نو کیلے نوجوان نے بات بدلنا ہی مناسب سمجھا۔۔ "کیوں مسٹر ڈرائیور بہت برسات گراتا؟"

'ہاں صاحب! بہت برسات گرا!'

'برسات کی رات' اور یہاں دفتر میں جا کر کام کرنا ہے۔' امر کمار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر اسے آزاد صاحب کا کہنا یاد آیا کہ اخبار کے کام میں صرف 'آج' ہوتی ہے۔ 'کل' نہیں ہوتی۔ کیونکہ صرف آج کی خبر ہوتی ہے۔ اگلے دن وہ مر جاتی ہے، سڑ جاتی ہے اور سڑی ہوئی مچھلی کی طرح بازار میں اس کا کوئی گاہک نہیں ہوتا۔ اپنے ساتھی کی طرف مخاطب ہو کر وہ بولا تم تو گھر جا کر ڈنر کھاؤ گے اور مزے سے کمبل اوڑھ کر سو جاؤ گے!"

"اوہ! نو مائی فرینڈ" نوکیلا نوجوان چلایا۔۔ "میں تو کپڑے چینج کر کے ہوٹل جل ترنگ جاؤں گا۔ لِلّی کا ڈانس دیکھنے اور اس کے بعد اس کو ساتھ لے کر ٹوٹو کی پارٹی میں!"

"اوہ! ۔ٹوٹو؟ لگتا ہے اس نے بلیین میں سب کو بلاوا دیدیا ہے؟" امر کمار نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔

"کیا تم بھی پارٹی میں جارہے ہو؟"

"مشکل ہی ہے۔ ٹوٹو کی شرط ہے کہ پارٹنر ساتھ ہونی چاہیے۔"

"تمھاری شادی ہوگئی ہے؟"

"ہاں۔۔" امر کمار نے جواب دیا۔۔ "اور نہیں!"

ابھی نوکیلا نوجوان اس ہاں اور نہیں کا معمہ نہیں حل کر پایا تھا کہ ٹیکسی جل ترنگ ہوٹل کے پاس سے گزر کر ایک کچی سڑک پر ہوئی اور ایک کاٹیج کے سامنے جا کر رک گئی۔

ڈرائیور نے کار کا ٹرنک کھولا۔ سوٹ کیس اٹھایا۔ بڑا بھاری تھا۔

''ارے صاحب! کیا اس میں پتھر بھرا ہوا ہے؟''

''ہاں۔ پتھر ہی سمجھو۔'' نوجوان ٹیکسی سے باہر آتے ہوئے بولا۔'' مگر سنبھال کے۔ یہ لو۔''

یہ کہہ کر نوجوان نے دس روپے کا نوٹ ٹیکسی ڈرائیور کو دے دیا اور بڑی شان سے کہا۔ ''KEEP THE CHANGE'' جیسے اس نے کسی بہت امیر گینگیسٹر کو ایک فلم میں ٹیکسی ڈرائیور کو سو ڈالر کا نوٹ دے کر کہتے ہوئے سنا تھا۔

ڈرائیور ٹیکسی کا میٹر گرانے گیا تو نوجوان نے امر کمار کی طرف ہاتھ بڑھایا، جو ٹیکسی کی کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔ ''تھینک یو مسٹر......''

'امر کمار۔ اور آپ کا نام؟

نوجوان نے جواب دینے سے پہلے کسی قدر سوچا۔ پھر بولا۔ ''جوزف۔ گڈ نائٹ۔ بائی بائی۔''

ٹیکسی الٹے' پیروں' پیچھے ہٹ رہی تھی کہ کاٹیج کے اندر سے ایک دبلی سی سانولی سی بڑی بڑی آنکھوں والی سولہ سترہ برس کی لڑکی چلاتی ہوئی آئی۔ ''ڈیڈی! جانی آ گیا۔ جانی آ گیا۔'' جانی۔ نے 'ہیلو روزی!' کہہ کر لڑکی کے گال کو ایسے تھپتھپایا جیسے وہ چھ سات برس کی بچی ہو۔

اور جب ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی لوٹا کر گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''صاحب یہ جوزف بڑا دل والا ہے۔ پورا دس روپیہ دے دیا۔'' تو امر کمار نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کا نام جوزف نہیں ہے' اس کا نام ہے جانی!''

اور اب جھونپڑے کے ایک کمرے میں وہی جانی اپنے ساتھ لایا ہوا سوٹ کیس کھول رہا تھا اور اوپر ایک میلا تولیہ تھا۔ اس کے نیچے اخبار کے کاغذ تھے ان کے نیچے بہترین شراب کی بوتلیں تھیں، وہسکی، برانڈی، جن، شامپین۔

بوتلوں کا معائنہ ایک ادھیڑ عمر کا لنگڑا آدمی کر رہا تھا جو پتلون پر واسکٹ پہنے تھا۔ جس کی کھچڑی داڑھی تھی اور جس کی کرسی کے پاس بیساکھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کی کھچڑی مونچھیں سگار کے دھوئیں سے پیلی پڑ چکی تھیں اور وہ اب بھی ایک چھوٹا سا سستا چروٹ پی رہا تھا اور اس

کے گہرے سانولے چہرے پر جھریوں کے ساتھ ایک عجیب گہری مایوسی چھائی ہوئی تھی مگر ان بوتلوں کو دیکھتے ہی اس کی بٹن جیسی چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھوں میں چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور اس کی جھرّیاں مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئیں۔

اس نے ایک بوتل کو اٹھا کر روشنی میں دیکھا اور خوشی سے اس کا چہرا چمک اٹھا— ''ڈمپل اسکاچ! گڈ، گڈ۔ ویری گڈ۔ اب کے بہت اچھا مال لے کر آیا ہے۔''

''تھینک یو انکل!'' جانی نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''اچھا۔ دِلّی کا ہمارا دوست لوگ کیسا ہے؟''

''فرسٹ کلاس!''

''ائیر پورٹ پر کوئی گڑ بڑ؟''

تھوڑی گڑ بڑ تو ہوئی تھی، جب ایک حوالدار نے جانی کا گٹار کیس کھلوا کر دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ اس کو اس طرح اٹھا کر چل رہا تھا جیسے اس میں پتھر بھرے ہوں۔ مگر جب اس میں سے واقعی گٹار نکلا تو حوالدار نے کھسیا کر کہہ دیا تھا— 'جاؤ صاحب! جاؤ' حالانکہ جانی نے سوٹ کیس کو بھی معائنہ کے لیے پیش کر دیا تھا۔ پر اتنی سی بات کا کیا بتنگڑ بنانا جانی نے جواب دیا۔ 'بہت معمولی!'

'بہت اچھا بہت اچھا!' انکل نے جیب سے تین نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''دیٹس، فاریو، مائی بوائے۔''

''بس تیس روپے!'' جانی نے نوٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے ان کو ایسی حقارت سے دیکھا جیسے وہ تیس روپے نہ ہوں تیس نئے پیسے ہوں۔''

''بس تیس روپے! تو کیا تیس ہزار مانگتا ہے؟''

''دینے والے تیس ہزار کیا تیس لاکھ بھی دیتے ہیں انکل!'' اور یہ کہہ کر اس نے تیس روپیوں کو وہیں شراب کی بوتلوں پر پھینک دیا۔ اور اپنے کوٹ کو 'زِپ' کراتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

انکل کے چہرے سے حیرت اور فکر کے آثار نمایاں تھے۔ ''آج جانی بوائے کیا بات بولتا ہے؟''

ٹیکسی کا دوسرا مسافر امرکمار اپنے ایڈیٹر کے کمرے میں کھڑا تھا۔ آزاد صاحب کے پیچھے

میز پر جواہر لال نہرو کی ایک تصویر تھی۔ چاندی کی وہ طشتری تھی جو اخبار کی پچیسویں سالگرہ پر سارے اسٹاف نے اپنے دستخط کندہ کرا کے ان کو تحفے میں دی تھی۔ اور دنیا کے ان مختلف لوگوں کی تصویریں تھیں جن کو آزاد صاحب نے انٹرویو کیا تھا۔

''تو کیا کہنا چاہتے ہیں سیٹھ ڈالیریا جی؟'' آزاد صاحب نے اپنے رپورٹر سے پوچھا!

''کہنا کچھ نہیں چاہتے' صرف مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔''

ایڈیٹر نے نگاہیں اٹھا کر امر کمار کو دیکھا پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا'' میں تو اسے کافی سمجھدار سمجھتا تھا۔''

''جی؟'' امر کمار آزاد صاحب کی بات سمجھا نہیں تھا۔'' مگر آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں بکنا چاہتا ہوں یا نہیں؟''

کوئی ضرورت نہیں۔'' ایڈیٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے کرسی پر جھولتے ہوئے جواب دیا۔'' میں جانتا ہوں کہ تم نہیں بک سکتے۔ بکنا چاہو، تب بھی نہیں بک سکتے۔''

اور امر کمار نے دل میں کہا— '' آزاد صاحب! کسی پر اتنا بھروسہ اچھا نہیں۔ دنیا میں بکنے والے تو چند ٹکوں کے لیے بک جاتے ہیں۔ وہ جو کرسچین چھوکرا تھا ٹیکسی میں میرے ساتھ......''

وہ کرسچین چھوکرا' ٹیکسی کا دوسرا مسافر۔ قمیص اور بنیان اتار کر گلے میں ایک ' کراس' ڈالے' ایک ' واش بیسن' میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ اسی پانی کے چھپکے منہ پر مارتا تھا۔ پانی کی کلّیاں بھی اسی پانی میں کر رہا تھا۔ ساتھ میں ایک انگریزی گانا بھی گاتا جا رہا تھا۔

اور روزی، سانولی، دبلی پتلی، معصوم صورت، روزی جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جانی کے لیے پیار ہی پیار بھرا ہوا تھا۔ ایک والہانہ انداز میں بولے جا رہی تھی جیسے اس نے اگر بولنا بند کر دیا تو اس کے جانی کو کوئی اس سے چھین کر لے جائے گا— '' جانی! جانی! جب تم ایروپلین میں بیٹھ کر دلّی کو جاتا ہے نا تو اپن کو بہت ڈر لگتا ہے۔ سارا ٹائم ام پرے کرتا رہتا ہے۔ اب کے مونٹ میری چرچ میں اپن دو کینڈلس جلائے گا!''

جانی نے منہ ہاتھ دھو کر ادھر ادھر تولیے کو ڈھونڈھا۔ روزی نے جلدی سے تولیہ پیش کر دیا۔ جانی اپنے بدن کو خشک کرتے ہوئے بولا—

"ابھی تم کو گھبرانے کی کوئی بات نہیں روزی! یہ دھندا خلاص— اے نیو لائف فاری!"
روزی سمجھی، اس نئی زندگی میں بس وہ ہوگی اور اس کا جانی ہوگا۔
'سچ!' کہہ کر خوشی سے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ جب آنکھیں کھولیں تو جانی پردے کے پیچھے جاچکا تھا اور وہاں کپڑے بدل رہا تھا۔
روزی نے پردے کے ادھر ہی سے آواز دی۔ "جانی!"
کسی قدر بددلی سے (جیسے وہ ابھی سے اس چھوکری کی باتوں سے بور ہو گیا ہو) جانی بولا۔ "کیا ہے؟"
"ڈیڈی تم کو کہیں بھیجے گا۔ تم کدھر بھی نمیں جانے کا!"
پردے کے پیچھے جانی نوٹوں کی گڈیاں اپنی جیبوں میں ٹھونس رہا تھا۔ "آج نہیں، کل نہیں، کبھی نہیں۔ یہ دھندا خلاص!"
"خلاص!" روزی کی خوشی کی انتہا نہ رہی— "بہت اچھا۔ اپن دونوں باہر چلیں گے۔
جانی نے کالر میں بوٹائی باندھتے ہوئے اس کے الفاظ بڑے تعجب سے دوہرائے "باہر چلیں گے!"
روزی جو ایک رومانی خواب دیکھ رہی تھی بولی— "بیچ BEACH پر— سمندر کے کنارے!"
"بیچ پر سمندر کے کنارے۔" اب تو جانی اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ "وہاں کیا کریں گے؟"
اس کے الفاظ میں حقارت کا جو انداز تھا۔ معصوم روزی نے اسے سمجھا ہی نہیں۔ وہ تو اپنے ہی خیال میں مگن تھی۔ بچّوں کی سی معصومیت کے ساتھ بولی۔ "ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر چلیں گے۔ سمندر کی لہریں گنیں گے۔"
جانی نے پردے سے باہر منہ نکالا۔ اور منہ چڑا کر کہا— "ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر چلیں گے سمندر کی لہر گنیں گے۔ ہونہہ۔ کیا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ پردے کے اندر کرلیا اور بے چاری روزی سوچتی رہ گئی کہ آج کی رات اس کے جانی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ شاید اس کو اس کا یہ پھٹا پرانا میلا کچیلا فراک نہیں پسند۔ اسے ساتھ لے جاتے ہوئے جانی کو شرم آئے گی۔ اگر یہ بات ہے تو روزی کے پاس اس کا بھی علاج تھا۔ محبت کی خاطر وہ کچھ بھی کرسکتی تھی۔!

ٹائپ رائٹر پر امرکمار کی انگلیاں ایسے چل رہی تھیں جیسے ناچ رہی ہوں۔

امرکمار نے ٹائپ رائٹر پر رپورٹ مکمل کی۔ کاغذ کو دراز سے سٹراپ سے کھینچ کر نکالا۔ گھنٹی بجائی۔ آفس بوائے آیا۔

''یہ صاحب کو دو!''

آفس بوائے نے کہا۔ ''اچھا امر بھیا!''

کاغذ لے کر وہ چلا گیا۔ مگر راستہ بھر سوچتا گیا کہ آج امر بھیا بڑے خوش اور گھبرائے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں۔ لگتا آج پھر وہ وہیں ٹیلیفون کرنے والے ہیں۔

امرکمار نے ادھر ادھر دیکھا۔ سارا دفتر خالی تھا۔ سب جا چکے تھے۔ صرف ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں روشنی تھی۔ مگر اس کمرے کا دروازہ بند تھا۔ چاروں طرف سے اطمینان کر کے امرکمار نے ٹیلی فون اٹھایا۔ کچھ سوچا پھر بظاہر بڑے اطمینان سے مگر دراصل دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نمبر ملایا ''تھری، فائیو، سیون، فور، ٹو، سکس''

O

سلگتا ہوا سوال

کارمائیکل روڈ پر کارمائیکل ہاؤس ایک سات منزلہ بلڈنگ ہے۔ جس میں صرف چودہ فلیٹ ہیں۔ یعنی ہر ایک منزل پر صرف دو فلیٹ۔ کرایہ تین ہزار روپے ماہوار۔ جنھوں نے اپنے لیے فلیٹ بنوائی ہے ان کو دو لاکھ میں خالی فلیٹ ملی۔ تین بڑے بڑے بیڈروم۔ ایک بہت بڑا ہال۔ جس میں اگر سینما دکھایا جائے تو تین چار سو آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ کارمائیکل ہاؤس میں صرف بہت بڑے وکیل، بیرسٹر، یا ڈاکٹر یا بیوپاری رہ سکتے ہیں۔ مگر بیرسٹر رمیش چندر اپنی پتنی کے سورگباش ہونے کے بعد اتنی بڑی جگہ میں اکیلے رہتے تھے۔ چوبیس آدمیوں کی ڈائننگ ٹیبل پر اکیلے کھانا کھاتے تھے۔ تب ہی تو وہ خوش تھے کہ ان کی اکلوتی بیٹی آشا اپنے شوہر کے گھر سے ان کے پاس آئی ہوئی تھی۔ گھر میں رونق ہوگئی تھی۔ رمیش چندر اکثر کہا کرتے۔ ”آج کل ہمارے گھر میں بہت بھیڑ ہے۔ آبادی دُگنی ہوگئی ہے۔ پھر ہنس کر کہتے۔ ”ایک میں، ایک آشا۔“ لیکن اب آشا کو آئے تین مہینے ہو چکے تھے اور بیرسٹر رمیش چندر کو فکر ہو چلی تھی کہ آشا اور اس کے شوہر کے تعلقات کہیں ہمیشہ کے لیے تو خراب نہیں ہو گئے۔ اگرچہ اس شبہ کا اظہار وہ اپنی بیٹی سے کبھی نہیں کرتے تھے۔

کھانا کھا کر بیرسٹر رمیش چندر (جن کی چندیا اتنی صاف تھی کہ کلب میں ان کے دوست کہتے تھے کہ اس میں لوگ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں) کافی پی رہے تھے کہ پاس رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔“

ٹیلی فون کا چونگا اٹھا کر کان سے لگایا اور کہا— ''ہیلو—یس......ٹھیک ہے۔کون چاہیے آپ کو؟—اوہ' آشا!''

خوب صورت آشا جو چست پاجامہ، قمیض اور اوڑھنی پہنے ایک اسکول جانے والی بچی لگتی تھی۔کافی کا پیالہ لیے کچھ سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔اچانک اپنا نام سن کر چونکی۔

''جی ڈیڈی!''

''تمھارا فون''

آشا کو معلوم تھا کہ اتنی رات گئے کہاں سے فون آسکتا ہے۔مگر اپنے باپ سے وہ بھی ایک کھیل کھیلتی تھی۔

''کون ہے ڈیڈی؟''

''تمھارا پرانا بوائے فرینڈ۔'' بیرسٹر صاحب نے کہا۔

میں نہیں بات کرنا چاہتی— '' آشا نے ناک سکوڑ کر کہا— ''کہہ دیجیے میں گھر پر نہیں ہوں۔''

بیرسٹر صاحب نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹیلی فون سے مخاطب ہو کر کہا— 'سوری امر! آشا کہتی ہے میں گھر پر نہیں ہوں۔'

دوسری طرف' آزاد قلم' کے دفتر میں امر نے ٹیلی فون پر جواب دیا— تو پھر اس سے بھی کہہ دیجیے کہ میں نے بھی فون نہیں کیا۔''

بیرسٹر صاحب نے شرارت بھری نظروں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور کہا— وہ کہتا ہے کہہ دیجیے میں نے بھی فون نہیں کیا۔''

آشا لا جواب ہوگئی۔'اوہ ڈیڈی!' اس نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا۔مگر ٹیلیفون لے لیا۔

ٹیلی فون کا تار بہت لمبا تھا۔آشا کمرے کے دوسرے حصہ میں گئی اور دیوان پر بیٹھ کر اپنے شوہر سے بات شروع کی۔

''ہیلو امر'' آواز جان بوجھ کر بے جان بے رنگ بنائی گئی تھی۔

''کہو آشی کیسی ہو؟''

''زندہ ہوں۔کہیے کیسے یاد کیا—؟'' اس انداز میں اتنے دن تک فون نہ کرنے کی شکایت

تھی اور نہ ملنے کا گلہ بھی تھا۔ "آشی! میں دہلی گیا ہوا تھا۔ شام کے پلین سے آیا ہوں۔" یہ تو اطلاع تھی مگر پھر کسی قدر جوش کے ساتھ ــ "آشی! میں ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

آشا کی سب بناوٹی خفگی دھری کی دھری رہ گئی۔ بے اختیار بولی۔

"تو پھر آیئے نا۔ میں انتظار کر رہی ہوں ــ"

مگر بیرسٹر صاحب نے جو ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے، یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ ایک لمبی 'ہوں' سے اس کو چوکنا کر دیا۔ میاں بیوی کی لڑائی میں صلح کے لیے کبھی پہل نہ کرنی چاہیے ورنہ آگے چل کر پوزیشن کمزور ہو جاتی ہے۔

آشا نے بددلی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ــ "اوہ سوری! امر آج تو مجھے ٹوٹو کی پارٹی میں جانا ہے۔"

"وہاں تو میں بھی جاؤں گا شاید۔ مگر بعد میں' پہلے مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ کام ختم کرتے ہی میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔ ڈیڈی کو نمستے کہنا ــ" اور امر نے جلدی سے فون بند کر دیا کہ کہیں آشا اسے روکنے کا کوئی اور بہانہ نہ ڈھونڈ لے۔

ٹیلی فون واپس رکھتے ہوئے آشا نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو، اب ٹہلتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا ــ "ڈیڈی! وہ آپ کو نمستے کہہ رہے ہیں ــ"

"ڈیڈی! وہ آپ کو نمستے کہہ رہے ہیں۔" بیرسٹر صاحب نے منہ چڑا کر اس کے الفاظ دوہرائے۔ "کیا لگتا ہے' وہ تمھارا؟"

آشا کالج کی پڑھی تھی۔ نئے زمانے کی لڑکی تھی۔ پھر بھی اس میں ایک ہندوستانی بیوی کا رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ اس نے نگاہیں جھکا کر جواب دیا۔

'وہ میرے' وہ لگتے ہیں۔

بیرسٹر صاحب ڈریسنگ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے شرارت بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں اسے چھیڑنے میں بڑا مزا آتا تھا ــ

"ہونہہ! عورت' تیرا نام کمزوری ہے۔ اس ایڈیٹ کی آواز سنی اور ہو گئی گھی شکر۔ میں تو سمجھتا تھا تو اس کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہے ــ اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

آشا نے صرف 'اوہ ڈیڈی' ۔ کہا۔ مگر ان دو لفظوں میں وہ سب کچھ تھا جو ایک ہندوستانی لڑکی باپ سے کہتے شرماتی تھی۔

''اری بے وقوف! تیرا ڈیڈی بمبئی کا سب سے بڑا بیرسٹر ہے—'' ان کا لہجہ بظاہر بڑا سنجیدہ تھا— ''تجھے تین دن میں طلاق دلوا سکتا ہے۔''

''لیکن مجھے طلاق نہیں چاہیے ڈیڈی!''

بیرسٹر صاحب نے گرج کر پوچھا۔ اگرچہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی— ''پھر کیا چاہیے؟''

''مجھے وہ چاہیے۔''

اس کا 'وہ' بڑی جلدی میں تھا۔ جلدی جلدی میں رپورٹ ختم کی۔ گھنٹی بجائی کوٹ پہننا شروع کیا کہ اتنی دیر میں آفس بوائے آ گیا۔

''امر بھیا! کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں''

امر نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ کہ باہر وہ لوگ سن نہ لیں— بھئی مجھے تو فوراً کہیں جانا ہے کسی سے ملنے۔ تو ان سے جا کے کہہ دے کہ میں دلّی سے ابھی واپس ہی نہیں آیا!''

''بے چارے بڑی دور سے آئے ہیں۔ شاید کوئی ضروری رپورٹ ہو۔''

امر پرانے رپورٹر کی حیثیت سے خوب جانتا تھا کہ رات کو کیسی ضروری رپورٹ آتی ہے۔ فلاں کلب میں ڈانس ہے وہاں آیئے اور اپنے فوٹوگرافر کو بھی ساتھ لایئے۔ میرے چاچا کے ماما کے بھتیجے کی شادی ہے۔ دولہا دلہن کا فوٹو چھاپ دیجیے— آفس بوائے سے اس نے کہا— ''تو ایسا کرو ان کو ایڈیٹر صاحب کے پاس لے جاؤ۔''

مگر امر بھیا! وہ صرف آپ سے ملنا چاہتے ہیں' وہ کہتے ہیں' تم صرف اتنا کہہ دو کہ ہم ڈالیر یا واڑی سے آئے ہیں۔''

''ڈالیر یا واڑی سے؟'' امر کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈالیر یا واڑی! کیچڑ اور دلدل۔ جس میں آدمی پھسل جاتے ہیں یا پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

ڈالیر یا واڑی! ڈالیر یا انڈسٹریز! ڈالیر یا کی سلطنت! ڈالیر کی کروڑوں کی دولت۔ دولت

اور طاقت۔

آفس بوائے سے اس نے کہا۔ ''اچھا تو بلاؤ!''

داخل ہونے والے وہی چار آدمی تھے جو اسے بستی میں ملے تھے لیکن اس وقت وہ پہچانے نہیں جاتے تھے، کپڑے پھٹے ہوئے یا جلے ہوئے، منہ پر راکھ اور کالک۔

ان کو بٹھا کر، ان کے چہروں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

''کہیے کیا حال ہے ڈالیریا واڑی کا؟''

ایک نے کہا۔ ''ڈالیریا واڑی ختم ہوگئی۔''

دوسرے نے کہا۔ ''جل کر راکھ ہوگئی۔''

امر نے پوچھا ''لیکن آگ کیسے لگی؟ کب لگی؟

''یہ آگ لگی نہیں لگائی گئی ہے۔''

اب یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کس نے لگائی ہے۔ اس کا جواب ان چاروں کی آنکھوں میں تھا اور امر کے دماغ میں سیٹھ ڈالیریا کی آواز گونج رہی تھی۔ ''تب ہی تو سوچتا ہوں کہ اپنی بستیوں کی گندی اندھیری جھونپڑیوں کو تڑوا دوں۔ اور اس زمین پر اونچی اونچی بلڈنگیں بنواؤں۔'' اگر اس نے وہ مضمون نہ لکھا ہوتا۔ وہ تصویریں نہ چھاپی ہوتیں تو آج ان غریبوں کی جھونپڑیاں جل کر راکھ نہ ہوگئی ہوتیں۔

اس وقت بھی سیٹھ ڈالیریا کے آدمی زمین کے چاروں طرف کانٹوں والی تار کی دیوار بنا رہے ہیں'' — ان چاروں میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ جس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور آواز میں تلخی —

''کل ہی وہاں ایک بہت بڑی بلڈنگ بننی شروع ہو جائے گی'' — اور ایک ایک فلیٹ — ''

''......ایک ایک لاکھ روپے میں بکے گا۔'' امر نے فقرہ پورا کر دیا۔ کیونکہ پہلے سنا ہوا تھا —

''تو پھر آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟''

''کل سویرے آپ آجایئے۔'' ایک نے کہا۔

''لیکن میرے آنے سے کیا ہوگا —؟''

''کل سویرے سیٹھ ڈالیریا کے آدمی ہم کو زبردستی وہاں سے نکالنے آئیں گے۔ اس وقت

آپ کا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔''

اور وہ سب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ''اچھا نمستے!''

اور دوسرے نے جس کے کپڑے آگ میں جل گئے تھے۔ امر کا گریباں پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا— ''امر بھیا! بس اب تمہارا ہی بھروسہ ہے۔''

اور وہ چلے گئے۔ ان کے قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ مگر امر کے دل و دماغ میں وہ ایک جلتا ہوا، سُلگتا ہوا سوال چھوڑ گئے— ''کیا کوئی کسی پر بھروسہ کر سکتا ہے؟'' وہ اسے کل بلانا چاہتے ہیں۔ مگر کل سویرے تک تو دنیا بدل سکتی ہے۔ انسان بدل سکتے ہیں۔ ان کے آدرش بدل سکتے ہیں۔ کل صبح ممکن ہے وہ سیٹھ ڈالیریا کا پی۔ آر۔ او، ہو اور اس کا سب سے پہلا کام ڈالیریا واڑی کی بستی کے رہنے والوں کو اس جگہ سے زبردستی ہٹوانا ہو!

''دوست بھروسہ کسی پر نہ کرنا۔ اپنے امر بھیا پر بھی نہیں— '' یہ اس نے کس سے کہا؟ وہ لوگ تو جا چکے تھے۔ شاید اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ اس سلگتے ہوئے سوال کے جواب میں۔

'امر!' ایڈیٹر صاحب کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس کی رپورٹ ہاتھ میں لیے آرہے تھے۔ ''یہ رپورٹ تم نے کافی دلچسپ لکھی ہے۔ وہ بے چارہ جو ہارٹ فیل ہو کر مر گیا، کیا وہ بمبئی دیکھنے کے لیے اتنا بے چین تھا— یہ تم نے من گھڑنت تو نہیں لکھ دیا؟''

''جی نہیں اس نے خود بتایا تھا۔ وہ میرے برابر والی سیٹ ہی پر تو بیٹھا تھا۔''

ایڈیٹر صاحب کو اس رپورٹ کو سجانے کی، اس کو اہمیت دینے کی فکر تھی— ''اس کا فوٹو مل جاتا تھا تو بڑا اچھا تھا— دیکھنے میں کیسا لگتا تھا— ؟''

ریڈیو فوٹو کی مشین پر ایک چہرا ابھر رہا تھا۔ یہ تصویر کسی فوٹو گروپ میں سے ان لارج کی گئی تھی کھچڑی مونچھیں، تھکی ہوئی بجھی ہوئی سی آنکھیں، جن میں لالچ ایک چور کی طرح باہر جھانک رہا تھا۔

پولیس کے ایک ہیڈ کانسٹبل نے انسپکٹر کی میز پر ایک لفافہ رکھتے ہوئے کہا— ''سر! دلّی سے یہ ریڈیو فوٹو آیا ہے۔''

سب انسپکٹر نے لفافہ میں سے فوٹو نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ صورت سے تو نہیں لگتا کہ اس نے بینک سے چار لاکھ روپے اڑائے ہوں۔!''

اس کے افسر نے کہا۔ ''کسی کے ماتھے پر لکھا تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ کس کے کرتوت کیا ہیں؟'' اور پھر اس بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے جس پر عادی مجرموں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ''یہ دیکھیے نا اپنی آرٹ گیلری۔''

سب انسپکٹر غور سے ریڈیو فوٹو کو دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے تو لگتا ہے' یہ وہی آدمی ہے جو آج دلّی والے ہوائی جہاز میں مردہ پایا گیا۔ اس وقت ائیر پورٹ پر ڈیوٹی پر میں ہی تھا۔''

انسپکٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آؤ۔''

لاش گھر!

زندگی کی بند کتابوں کی لائبریری

جو عمر بھر گرمی اور لو میں جھلستے رہے۔ ان کو موت کے بعد ایر کنڈیشنڈ ٹھنڈا کمرہ نصیب ہوا تھا۔

ٹھنڈی پتھر کی سلیں، ان پر ٹھنڈی لاشیں، ان پر سفید چادریں ڈھکی ہوئیں۔ جس سماج میں زندگی کی کوئی قدر نہیں ہوتی، وہاں موت کا کتنا اہتمام ہوتا ہے۔

پتھر کی سِل پر سے چادر ہٹائی گئی۔ انسپکٹر نے چہرے سے فوٹو کو ملایا دونوں وہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ ایک تصویر تھی مگر زندہ تھا۔ دوسرا اصل تھا' مگر مردہ تھا۔ کسی نے بے چارے کی آنکھوں کو بند کرنے کی بھی تکلیف نہ کی تھی۔ اس وقت بھی وہ بے نور آنکھیں ٹکٹکی باندھے اپنے ماضی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

دلّی میں ایک بینک تھا۔

بینک کے کتنے ہی کاؤنٹر تھے۔

ایک کاؤنٹر پر ایک کیشیئر تھا، سیوک رام جو ہزاروں لاکھوں روپے وصول کرتا تھا ہزاروں لاکھوں روپے کے چیک بھُنا تا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں روپے آتے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں

سے روپے جاتے تھے۔ اس کی انگلیوں نے کچھ نہیں تو کروڑوں روپے گنے ہوں گے۔ وہ ان نوٹوں کی گڈیوں کو ایسے چھوتا تھا' جیسے کوئی عیاش آدمی، اپنی معشوقہ کے بدن کو ہاتھ لگاتا ہے۔ روپیہ۔ روپیہ۔ وہ ہر وقت روپیوں سے گھرا رہتا تھا۔ مگر مہینے کے ختم پر اس کو صرف چار سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ صرف سو سو روپے کے چار نوٹ اور بس۔ اور وہ باقی لاکھوں کے نوٹ جو اس کے ہاتھوں میں آتے تھے وہ کہاں جاتے تھے؟ وہ کھاتوں سے نکل کر جیبوں میں جاتے تھے۔

وہ جیبوں سے نکل کر عیاشیوں میں خرچ کیے جاتے تھے۔

وہ رشوتوں میں جاتے تھے۔

وہ کالے بازار کے کالے دھندوں میں جاتے تھے۔

ان سے بڑی بڑی موٹریں خریدی جاتی تھیں۔

ان سے بڑے بڑے مکان بنائے جاتے تھے۔

ان سے بڑھیا سوٹ، ریشمی ساڑیاں خریدی جاتی تھیں۔

اور اس کو صرف وہی چار سو روپے ملتے تھے—

سو سو روپے کے چار نوٹ۔ یا دس دس روپے کے چالیس نوٹ یا ایک ایک روپے کے چار سو نوٹ۔

ایک دن سیوک رام کو اپنے کھاتے میں جمع کرنے کے لیے کسی سیٹھ نے چار لاکھ روپے کے نوٹوں کی گڈیاں دیں۔

ان گڈیوں کو گنتے گنتے سیوک رام کی آنکھوں میں لالچ جو چور کی طرح بیٹھا تھا' باہر نکل آیا۔ چور نے کہا۔ کب تک دوسروں کی دولت گنتے رہو گے؟ ساٹھ برس کے ہو گئے ہو۔ دس برس میں مر جاؤ گے۔ زندگی تو تم نے دیکھی ہی نہیں۔ اس دولت سے تمھاری عمر بھی بڑھ سکتی ہے' دنیا کا ہر عیش و آرام اس سے خرید سکتے ہو۔ دان دھرم کے کام بھی کر سکتے ہو۔ کیا سوچتے ہو؟ میز پر نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہیں۔ میز کے نیچے تمھاری وہ ٹوکری رکھی ہے جس میں تم اپنا کھانا لاتے ہو۔ کہنی کی ایک جنبش سے یہ نوٹوں کی گڈیاں میز سے اس ٹوکری میں منتقل ہو سکتی ہیں۔ اوپر سے تم اپنا تولیہ ڈال سکتے ہو۔ ساڑھے چار بجے بینک بند ہوتا ہے۔ چھ بجے بمبئی کے لیے ہوائی

جہاز روانہ ہوتا ہے...... بمبئی جیسے پچاس لاکھ کی آبادی کے شہر میں تم بڑی آسانی سے غائب ہو سکتے ہو۔"

سیوک رام نے اپنی کہنی کو جنبش تو دی۔ مگر اتنی سی محنت سے اس کے چہرے سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ کہیں یہ پسینہ اس کے جرم کا اعلان نہ کر دے۔ تولیے سے پسینہ پونچھا تو تولیہ جو پل بھر پہلے بالکل صاف اور چٹا تھا۔ اس پر کالے کالے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر جو پسینہ نکلا تھا وہ کالا تھا یا اس کے من کی کالک تھی جو چہرا پونچھنے سے تولیے پر منتقل ہو گئی تھی؟

اور اب وہ چہرا تصویر کی شکل میں پولیس کے دفتر میں میز پر پڑا تھا۔

انسپکٹر نے سب انسپکٹر سے کہا۔ "تو یہ ہے وہ آپ کا بھولا بھالا بوڑھا جس نے لاکھوں کا غبن کیا ہے۔"

"مگر جب میں نے اس کی تلاشی لی تھی تو اس کے جیب سے صرف ساڑھے تیرہ روپے نکلے تھے۔ پھر وہ سارا روپیہ گیا کہاں۔؟"

انسپکٹر نے جواب دیا۔ "یہ سوال میں اس مینیجر سے کرنا چاہتا ہوں جس کی سیٹ ہوائی جہاز میں اس بوڑھے کے برابر تھی۔"

اور یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون کا ایک نمبر گھمایا......

انڈین ایئر لائنز کے انکوائری آفس میں صرف ایک کلرک کاؤنٹر پر کام کر رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس نے رسیور اٹھایا۔

"آئی۔ اے۔ سی انکوائری۔ فلائٹ نمبر ۱۸۴ جو دہلی سے آئی ہے؟ مینیجر سیوک رام کے برابر والی سیٹ پر......" پھر اس نے مسافروں کی فہرست پر اوپر سے نیچے تک نظر ڈالی اور کہا۔ "ایک مسٹر امر کمار بیٹھے تھے۔"

وہ مسٹر کمار اس وقت بیرسٹر رمیش چندر کی شاندار فلیٹ کے دروازے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔

آشا نے نوکر کو روک کر بے تحاشہ بھاگ کر خود دروازہ کھولا۔ایک منٹ کے لیے سب گلے شکوے بھلا دیے گئے۔اس وقت اس کا شوہر—اس کا امر—جس سے وہ محبت کرتی تھی۔اس کے سامنے تھا اور وہ اس کی بانہوں میں۔اتنی مدت کے بعد آج آشا سے مل کر امر کو بھی محسوس ہوا کہ بیوی کے بغیر اس کی زندگی میں کتنا بڑا خلا تھا۔ایک منٹ تک وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں کھو گئے—گھل گئے—پھر آشا کو یاد آیا کہ میں تو اس شوہر سے روٹھی ہوئی ہوں۔"

اپنے آپ کو امر کی آغوش سے رہا کرتے ہوئے آشا نے وہ کہا، جو روٹھی ہوئی بیویاں عام طور سے اس موقع پر کہا کرتی ہیں—"میں نہیں بولتی—"

"تمھیں بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے—'امر نے جواب دیا—"آج میں تم سے بہت کچھ کہنے آیا ہوں—"

بیرسٹر رمیش چندر کی آواز ان دنوں کے تخلیے میں مخل ہوئی۔

"آشا—!"

"جی ڈیڈی!" آشا نے وہیں سے جواب دیا۔

"کون آیا ہے؟"

جواب میں آشا نے آواز نہیں دی' امر کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی اور اپنے باپ کے سامنے کھڑا کر کے جو اخبار پڑھ رہا تھا۔

"ڈیڈی! انہیں پہچانا آپ نے؟"

بیرسٹر صاحب نے اخبار نیچے رکھتے ہوئے غور سے دیکھ کر اپنے داماد سے کہا—"یاد پڑتا ہے، کہیں دیکھا تو ہے کوئی نیا مقدمہ لائے ہو۔؟"

امر اپنے سسر کے مذاق کی عادت سے بخوبی واقف تھا۔اس نے بھی مذاق کا انداز جاری رکھا اور آشا کی طرف دیکھ کر کہا—"جی نہیں۔مقدمہ تو وہی پرانا ہے۔"

"اوہ تو پھر مجھے وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں—" بیرسٹر صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا—وہ بیٹی اور داماد کو اکیلا چھوڑنا چاہتے تھے۔—"میں آفس میں جا کر مقدموں کے کاغذات دیکھتا ہوں—"

جب دونوں اکیلے رہ گئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے تو آشا نے کہا۔ بہت دبلے ہو گئے ہیں آپ — نہ جانے کچھ کھاتے پیتے بھی ہیں یا نہیں۔"

امر ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس لے کر کہا — "کھانا کھلانے والی ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے......"

"تو کھانا لگواؤں؟"

"نہیں آشی! میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ چلو گھر چلیں۔ کم سے کم آج رات کے لیے —"

اور یہ کہتے ہوئے امر اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کے پاس جا کر بولا — آج مجھے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا ہے —"

"میری کیا ضرورت ہے؟" آشا نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا — اور شوہر کے قریب آکر شکایت بھرے لہجہ میں بولی — "اب تک تو اپنی زندگی کے فیصلے آپ خود کرتے آئے ہیں۔"

"مگر آشی! یہ فیصلہ میں تمھارے بغیر نہیں کر سکتا۔ اس کا تعلق ہم دونوں کی زندگی سے ہے —" سگریٹ جلایا تو اسے وہ سلگتا ہوا سوال یاد آیا — جوڑالیر یا واڑی والے اس کے من میں بھڑکا گئے تھے۔ اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے نرم کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے، امر نے بہت سنجیدہ اور فیصلہ کن انداز میں کہا — 'آج کی رات ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کو پانا ہوگا یا ہمیشہ کے لیے کھو دینا ہوگا —'

اب آشا کو اندازہ ہوا کہ یہ وقت گلے شکوے کرنے یا روٹھنے منانے کا نہیں ہے — "مجھے تو اس فیصلے کے خیال سے ہی ڈر لگتا ہے۔ آپ بیٹھیے میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔"

آشا اندر چلی گئی تو امر نے ایک بار پھر کھڑکیوں کے شیشوں میں سے دیکھا۔ بہت دور سڑک پر موٹروں کی ایک لمبی قطار اپنی روشنیاں چمکاتی چلی جا رہی تھی۔ اگر وہ چاہے تو کل اس کے پاس بھی اپنی موٹر ہو سکتی ہے۔ آشا کون سی موٹر پسند کرے گی؟ ہندوستان اسٹینڈرڈ، یا فی ایٹ، یا اسٹینڈرڈ ہیرالڈ......؟

"امر —!"

بیرسٹر رمیش چندر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ مڑ کر دیکھا تو بڑے میاں اپنی ڈریسنگ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''ہیلو! امر مائی بوائے۔ بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے نا؟''

''بارش! جی بارش!'' اور پھر امر کو یاد آیا کہ وہ اب تک برساتی پہنے ہوئے ہے۔ آشا سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ میں اس کو اتارنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔

''اوہ' یہ رین کوٹ۔ جی میں ذرا جلدی میں تھا۔ اس لیے......''

''کوئی بات نہیں۔'' بیرسٹر صاحب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تم جرنلسٹوں کی یونی فارم ہے جیسے ہم بیرسٹروں کو کورٹ میں کالا گاؤن پہننا پڑتا ہے۔'' اور پھر جیسے کوئی بہت ضروری بات یاد آ گئی ہو۔ ''تم اپنے مقدمے میں مجھے کیوں نہیں وکیل کر لیتے؟''

''جی!'' مقدمے کا نام سن کر امر بھی کچھ گھبرا سا گیا۔

''چٹکی بجانے میں تمھیں طلاق دلوا سکتا ہوں۔ اتنا اچھا اور سستا وکیل تمھیں سارے بمبئی میں نہیں ملے گا۔'' بیرسٹر صاحب اپنے مذاق پر خود ہی مزا لے رہے تھے۔ قانونی مشورہ بالکل مفت!''

اب تو امر بھی اس مذاق کے انداز سے واقف ہو گیا تھا۔

''تو پھر بتایئے اپنی بیوی کو بھگا کر لے جانے کی کیا سزا ہے؟''

''عمر قید با مشقت۔'' بیرسٹر صاحب نے 'عمر' پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

آشا نے آتے ہوئے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ ''ان بیرسٹر صاحب کی بات مت سنیے اگر ان کا بس چلے تو ساری دنیا کے میاں بیوی کو طلاق دلوا دیں۔'' اور پھر اپنے باپ سے مخاطب ہو کر۔ ''اچھا ڈیڈی! میں چلتی ہوں۔ اجازت ہے نا؟''

بیرسٹر صاحب نے ڈانٹ کر جواب دیا۔ ''پہلے گھر چھوڑ کر گئی تھی تو کون سی اجازت لی تھی۔'' اور پھر آواز بدل کر۔ ''جاؤ، جاؤ!''

اور جب وہ دونوں سلام کر کے رخصت ہو گئے تب بیرسٹر صاحب کے چہرے پر ایک میٹھی محبت بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''ایڈیٹ! اتنے دنوں انتظار کیوں کیا؟ اپنی بیوی کو پہلے ہی کیوں نہیں بھگا کر لے گیا۔؟''

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو بیرسٹر صاحب اس کی طرف مخاطب ہوئے۔

''ہیلو — جی ہاں — میں بول رہا ہوں — آپ کون صاحب ہیں؟''

دوسری طرف سے انسپکٹر پولس بول رہا تھا — ''بیرسٹر صاحب! سنا ہے رپورٹر امرکمار آپ کے ہاں آیا ہے؟''

''اوہ! رپورٹر امرکمار؟''

''جی ہاں، پولیس کو اس سے کچھ پوچھ تاچھ کرنی ہے۔''

''لیکن ٹیلی فون کرنے میں آپ نے ذرا دیر کی انسپکٹر صاحب!'' اور اب بیرسٹر صاحب کے چہرے پر ایک شرارت چمک رہی تھی۔ ''امرکمار ابھی ابھی ایک اور جرم کر کے بھاگ گیا ہے؟''

''بھاگ گیا ہے؟'' انسپکٹر کو اب یقین ہو گیا کہ یہ رپورٹر واقعی مجرم ہے۔''

''جی ہاں! دو عورتوں کو بھگا کر لے گیا ہے —'' بیرسٹر صاحب حسب معمول اپنے مذاق کا مزا خود لے رہے تھے۔

مگر دوسری طرف انسپکٹر کی حیرت کی انتہا نہ تھی — ''دو عورتوں کو بھگا کر لے گیا —؟''

اب بیرسٹر رمیش چندر کے چہرے پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ نظر آئی۔

''جی ہاں میری بیٹی کو اور اپنی بیوی کو —''

اور یہ کہہ کہ انھوں نے ٹیلیفون نیچے رکھ دیا۔

کہیں دور ایک اور ٹیلی فون اٹھایا گیا۔

یہ بوڑھا داڑھی والا لنگڑا انکل تھا۔ جو اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ٹیلیفون پر اپنی شراب کی بوتلوں کا دھندا کرتا تھا۔

دوسری طرف سے کسی گاہک کی آواز سنتے ہی اس کے بولنے کا انداز ایک دم خوشامدانہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں روپے ملنے کے لالچ سے چمکنے لگیں۔ اس کی آواز میں ایک نیا جوش آ گیا — ''جی صاحب......ضرور صاحب!......'' آپ فکر نہ کیجیے صاحب! — سال ٹائم پر پہنچ جائے گا۔ تھینک یو سر۔ تھینک یو —

اور پھر فون رکھ کر وہ چلّایا— ''جانی! جانی بوائے!''

جانی جو کپڑے پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہی تھا، کسی قدر چڑ کر دروازے سے لوٹا— ''کیا ہے؟''

انکل نے دیکھا کہ آج تو جانی بڑے بڑھیا کپڑے پہنے ہے، بوٹائی لگائی ہے، سینٹ کی خوشبو آرہی ہے۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے پوچھا— ہم باہر جاتا ہے۔'' جانی نے کہا۔

''گڈ— راستے میں جاتے ہوئے گارڈن روڈ نمبر چھ پر چھ باٹلی دیتے جاؤ'' انکل نے اسے حکم دیا۔ پھر جانی کے انداز میں حکم عدولی اور سرکشی کے آثار پا کر اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے۔ ''اور یہ لو پچیس روپے دس روپے، ٹیکسی بھاڑا— پندرہ روپے تمھاری محنت کا—''

جانی نے بڑی بے پرواہی سے جواب دیا— ''پندرہ روپیہ ہم کو نہیں مانگتا۔'' اب انکل نے لالچ دلانے کی کوشش کی— ''جانی بوائے تم کو کیا ہو گیا ہے—؟ تیس روپے تم نے پھینک دیے۔ پندرہ روپیہ تم نہیں مانگتا۔ پندرہ روپیہ کتی نہیں ہوتا، سُنی۔ کارخانے میں دن بھر مزدوری کرو تو تین روپے ملتے ہیں۔ اپنے دھندے میں سب سے جیاستی پیسہ ملتا ہے۔''

مگر جانی اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہوا— ''سوری انکل مجھے تمھارا پیسہ نہیں مانگتا!''

اب انکل نے خوشامد کا انداز اختیار کیا— ''اپنے انکل کے لیے یہ چھوٹا سا کام نہیں کرے گا؟۔ یہ میرا بانکل نیا گاہک ہے۔ کسی پرانے گاہک نے میرا نام بتایا ہے اس کو۔ آج اس کے ہاں بہت بڑا پارٹی ہے۔''

''میں خود پارٹی میں جا رہا ہوں۔'' جانی نے اپنے کوٹ کا کالر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔'' مجھے باٹلی پہنچانے کا ٹائم نہیں ہے۔''

''تو پھر کون لے کر جائے گا—؟'' اب بوڑھے کو واقعی فکر ہو رہی تھی— نیا گاہک ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں لنگڑا ہوں— جا نہیں سکتا۔ روزی چھوکری ہے۔ بیٹی کو ایسے دھندے پر نہیں بھیج سکتا—''

جانی نے دانت بھینچ کر جواب دیا— اور اس کے انداز میں عمر بھر کی تلخی ہی تلخی تھی— ''بیٹی کو نہیں بھیج سکتے۔ لیکن مجھے' اپنے بھائی کے بیٹے کو تم ہمیشہ ایسے دھندے پر بھیجتے رہے ہو۔ مگر اب

میں نہیں جاؤں گا۔"

"نمک حرام—!" انکل زور سے چلایا— "بیس برس تجھے پالا، بڑا کیا اور آج تیری یہ ہمت کہ تو مجھے جواب دیتا ہے تو پھر سُن ......"

اور جانی کو ایسا لگا کہ اس کی زندگی جو کہ بال سے زیادہ باریک تار سے جہنم کی آگ کے اوپر لٹکی ہوئی تھی— اس ایک لہجہ میں وہ تار ٹوٹ گیا۔ اس کے کانوں نے انکل کو کہتے ہوئے سنا—

"تو میرے بھائی کا بیٹا نہیں ہے— میرا تو کوئی بھائی تھا ہی نہیں۔"

جانی کو ایسا لگا، جیسے اس کے سوچنے، محسوس کرنے، بات کرنے کی طاقت ایک دم ختم ہو گئی ہے۔ مشکل سے وہ کہہ پایا۔ مگر یہ سوال— یہ سلگتا ہوا سوال جو اس کے من کے اندر آگ بن کر بھڑک رہا تھا، اس نے انکل سے نہیں کیا، آپ سے نہیں کیا۔ اس طاقت سے کیا۔ جسے لوگ خدا کہتے ہیں، گاڈ کہتے ہیں، بھگوان کہتے ہیں، قسمت کہتے ہیں۔ "اگر میں تمھارے بھائی کا بیٹا نہیں ہوں تو میں پھر کس کا بیٹا ہوں؟"

اور جیسے اس سوال کے جواب میں اس کو دور بہت دور سے ایک نئے پیدا ہوئے بچّے کے رونے کی آواز آئی۔

دور کہیں ماضی کے کھنڈروں میں ایک کچرے کی ٹوکری کے پاس چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بچّہ رو رہا تھا۔ بلک رہا تھا— ایک بے فکر نوجوان مزدور جو بازار سے تھیلے میں بھاجی، ترکاری لیے ہوئے لوٹ رہا تھا، بچّے کی آواز سن کر ادھر آیا۔ اس نوجوان کی دونوں ٹانگیں سلامت تھیں لیکن اس کی شکل انکل سے ملتی ہوئی تھی۔ جیسے وہ انکل کا بیٹا ہو۔ یا بیس برس پہلے کا انکل ہو جب اس کی دونوں ٹانگیں تھیں۔

نوجوان نے بچّے کو گود میں اٹھا لیا۔ ادھر ادھر دیکھا کہ شاید اس کی ماں اس کو چھوڑ کر کسی کام پر گئی ہو مگر دور دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ سو نوجوان مزدور نے بچّے کو اپنے سینے سے چمٹا لیا......

اور اب جانی ایک بدلی ہوئی دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا مگر اس آواز میں عمر بھر کی محرومیوں کی

کڑواہٹ تھی۔

''اور اسی لیے تم نے مجھے اسکول نہیں بھیجا۔ کبھی کوئی اچھی بات نہیں سکھائی......؟''

انکل اب اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا کہ کیوں میں نے جانی بے چارے کو یتیم و بے آسرا کر دیا مگر یہ جھوٹ تھا کہ اس نے جانی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اس نے جانی سے سوال کیا۔

''مگر تمھیں پالا پوسا کس نے؟ اتنا بڑا کیا کس نے؟'' اور خود ہی جواب دیا۔ ''میں نے!''

اب جانی کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی اور اس میں زہر بھرتا جا رہا تھا۔ ''تم کہتے ہو تم نے مجھے پالا ہے۔ میں کہتا ہوں میں نے تمھیں پالا ہے۔ ٹیکسیوں کے پیچھے دوڑ کر۔ دارو کی باٹلیاں ادھر سے ادھر پہنچا کر، جیب کاٹ کر۔ چوری کر کے ایک جنم کے لنگڑے کو پال رہا ہوں۔''

''جانی۔!'' انکل چلّایا۔ اور اپنی بیساکھیوں کے سہارے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں جنم سے لنگڑا نہیں تھا۔''

پھر اس کی نگاہیں ان تصویروں پر گئیں جو دیوار پر لگی تھیں، پرانی ہاکی ٹیم کی یادگاریں۔ ٹورنامنٹ میں جیتے ہوئے چاندی کے کپ۔

اب اس کی آواز میں ماضی کی یاد گونج رہی تھی اور زندگی کا پچھتاوا۔ ''کیا ہونا تھا اور کیا ہو گیا'' میں اپنی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا۔ لوگ کہتے تھے اس کی ٹانگوں میں بجلی ہے۔ کارخانے میں کام کرتا تھا تو سب لوگ کہتے تھے مشین اس کے اشارہ پر ناچتی ہے اور پھر ان ہی مشینوں نے ایک دن میری ٹانگ کی بلی لے لی......''

پھر اس کی آنکھوں اور آواز میں ایک عجیب غصے اور نفرت کی جھلک ابھر آئی۔ ''اور مل مالک نے ایک ٹانگ کی قیمت دی سو روپے۔!'' پھر اس نے جانی کی طرف دیکھ کر کہا۔ جیسے اپنی زندگی کا گہرا راز بتا رہا ہو۔ ''مجھے اس دنیا سے بدلہ لینا تھا، بدلہ۔''

مگر جانی کی آنکھوں میں اس کے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ''اور تم نے بدلہ لیا مجھ سے۔ ایک بچہ سے۔!''

اور جانی نے جیسے اپنے من کے اندر سے ایک لڑکے کی آواز قریب آتی ہوئی سنی۔ ''ٹیکسی! ٹیکسی!''

دور سے — جیسے وقت کا فاصلہ طے کر رہا ہو۔ سڑک پر ایک آٹھ نو برس کا لڑکا پھٹی قمیض اور نیکر پہنے ایک ٹیکسی کے پیچھے دوڑتا ہوا آرہا تھا — "ٹیکسی ٹیکسی" چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ سڑک پر چاروں طرف موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ لوگ آجا رہے تھے مگر کوئی ایسا نہیں تھا جس کو اس بچے کی فکر ہو —

اور اب یہی لڑکا بھاگا چلا جا رہا تھا — وقت کے ساتھ بھاگتا بھاگتا ایک بستی میں گھس آیا۔ جہاں جوان، مگر ایک ٹانگ کا انکل بیساکھیوں کے سہارے اس کا انتظار کر رہا تھا — لڑکے نے آگے قمیض کے نیچے سے ایک شراب کی بوتل نکالی کر دی۔ انکل نے اسے کچھ پیسے دیے اور پیٹھ تھپکی۔ لڑکے نے بڑے اطمینان سے پیسے جیب میں ڈالے اور اسی جیب سے کنگھا نکال کر بالوں میں کرنے لگا......

اور اب وہی لڑکا جو بڑا ہو کر جانی ہو گیا ہے۔ اسی طرح اپنے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا اور بڑی نفرت اور حقارت سے اس بوڑھے اور لنگڑے کو دیکھ رہا تھا۔ جس کو آج تک اس نے اپنا چچا سمجھا تھا" آئی ایم سوری جانی! مجھے بہت افسوس ہے۔" انکل دھیمی آواز میں سر جھکا کر کہہ رہا تھا۔

جانی نے کچھ جواب نہ دیا۔ کنگھے میں الجھے ہوئے بال صاف کیے اور ان کا گچھا بنا کر پھینک دیا جیسے وہ ان پرانے تمام رشتوں کو رد کر رہا تھا جو سر سے جھڑے ہوئے بالوں کی طرح جھوٹے ثابت ہوئے تھے پھر بغیر کچھ کہے سنے وہ مڑا اور باہر کی طرف چل پڑا۔

'جانی! جانی' انکل نے بے تحاشہ چلایا — جیسے ایک کارندہ ہی نہیں، اس کی لنگڑی زندگی کا سہارا جا رہا ہو — "کہاں جا رہے ہو؟"

جانی مڑا — اس کی آنکھوں میں برف جیسی ٹھنڈی نفرت تھی' وہیں واپس جا رہا ہوں جہاں سے تم نے مجھے اٹھایا تھا۔ گندی نالی میں اور سچ پوچھو، انکل، تو تمھارے ساتھ رہ کر میں گندی نالی سے کبھی باہر نکلا ہی نہیں۔"

انکل "جانی! جانی!" چلاتا رہا۔ مگر جانی نہ رکا۔

باہر کے کمرے میں گزرتے ہوئے اس نے کھونٹی سے اپنی کالی ہیٹ سنبھالی اور دروازے سے باہر نکل کر جانے ہی والا تھا کہ روزی کی آواز آئی۔ "جانی!"

پیچھے مڑ کر دیکھا تو روزی ایک کارٹون بنی کھڑی تھی۔ میلے ملگجے چھینٹ کے فراک کی بجائے اب اس نے ایک چست کالی ساٹن کا فراک پہن لیا تھا۔ بالوں کو اوندھی سیدھی طرح "بوفان کی" نقل میں بنایا گیا تھا اور اس میں اتنے بہت سے پھول لگے تھے کہ لگتا تھا کہ سر پر گلدستہ رکھ لیا ہے۔ اونچی ایڑی کا جوتا۔ گالوں پر ضرورت سے زیادہ پاؤڈر سرخی کو تھوپ لیا گیا۔ اس کی آنکھیں اگر اتنی معصوم نہ ہوتیں تو ایسا لگتا کوئی گھٹیا قسم کی ویشیا کھڑی ہے۔

غصے کے باوجود جانی مسکرا پڑا۔ "یہ سب کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تمھیں ایسا اچھا لگتا ہے نا؟" وہ بولی اور اچھی طرح اپنی نمائش کرنے کے لیے چاروں طرف گھوم گئی۔ "میں نے یہ سب تیار کرا کے رکھا تھا کہ جس دن تم مجھے اپنے ساتھ باہر لے جاؤ گے اس دن پہنوں گی۔"

"میں تمھیں اپنے ساتھ باہر لے جاؤں گا؟" جانی کو روزی کی غلط فہمی پر ہنسی آ رہا تھا اور رحم بھی۔ "ابھی اچھی لڑکی بنو' یہ فینسی ڈریس اتارو۔ اور جا کر سو جاؤ۔"

یہ کہا اور جانی اپنے سر پر ہیٹ رکھتا ہوا کھٹ کھٹ کرتا دروازے کے باہر چلا گیا۔

روزی اس کو روکنے کے لیے دروازے تک دوڑی مگر جانی جا چکا تھا۔ باہر صرف سناٹا تھا اور اندھیرا اور سمندر کی لہروں کا شور جو ایک بے درد ساحل پر اپنا سر پٹک رہی تھیں۔

○

پیار کی پیالی

بمبئی کا ساحل جوہو سے قلابہ تک پھیلا ہوا تھا۔ جولہریں جوہو کے ساحل پر روزی کے لیے سر پٹخ رہی تھیں وہی میرین ڈرائیو پر امر اور آشا کے لیے جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

تین مہینے کے بعد ملاقات ہوئی ہو تو ٹیکسی لینے کی کس کو جلدی ہوتی ہے۔ محبت کرنے والے تو ایک دوسرے کا ساتھ چاہتے ہیں۔ چاہے رات بھر چلنا پڑے اور منزل دور ہوتی چلی جائے۔"

"یہ سڑک ہم نے کئی بار پیدل طے کی ہے!" امر نے آشا کو یاد دلایا۔" آپ کے اصول بھی تو نرالے ہیں!" آشا نے امر کی نقل اتاری "اگر میرے پاس ٹیکسی کے پیسے نہیں ہوں گے تو پیدل چلیں گے اور جب میرے پاس چائے کے پیسے نہیں ہوں گے تو ہم چائے نہیں پئیں گے......"

"چائے کے نام پر امر کو کچھ یاد آیا۔یاد ہے وہ چائے دانی جس کی بدولت ہم پہلی بار ملے تھے۔؟"

اس دن آشا کے پرس میں اور امر کی جیب میں مالا بار ہل کے اوپر بنے ہوئے کیفے ناز میں چائے پینے کے لیے پیسے تھے۔ مگر وہ دونوں اس وقت ایک دوسرے کو جانتے نہ تھے۔

امر نے ایک جھلک دیکھی تھی ایک خوب صورت آنکھوں والی لڑکی کی جو اپنی سہیلی کے

ساتھ باتیں کرنے میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ چائے بھی سامنے رکھی رکھی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ مگر کالج کی لڑکیوں کی باتیں تو کبھی ختم ہونے ہی میں نہیں آتیں — ہائے وہ لڑکا سوئٹ ہے؟ — میں تو پروفیسر بوس کی کلاس میں بور ہو جاتی ہوں — اور سنا تم نے ٹینس ٹورنامنٹ میں سوشیلا اور وہ لمبا سا لڑکا۔ کیا نام ہے اس کا؟ — ہاں — ورما — مکسڈ ڈبلز میں کھیل رہے ہیں — لیلا کی ساڑی بھی دیکھی — کتنے جچتے ہوئے رنگوں کی ہے؟ — ارے یہ لپ اسٹک بازار میں کہاں ملتی ہے۔ یہ تو میرے لیے ڈیڈی نے ایک اسمگلر سے بلیک مارکیٹ کے داموں مول لی ہے۔ لڑکیاں امر کی ٹیبل کے برابر والی میز پر ہی بیٹھی تھیں۔ وہ سننا نہ چاہتا ان کی باتیں تب بھی سننا پڑتیں۔ اس نے بظاہر اس دن کا اخبار اپنے اور ان کے درمیان کر لیا تھا۔ مگر کاغذ کی دیوار کے بھی تو کان ہوتے ہیں۔ اور بہت لمبے — امر لڑکیوں کو دیکھ تو نہ سکتا تھا مگر سن سکتا تھا۔

دوسری طرف ایک اور میز تھی اور اسی پر ایک ذات شریف بیٹھے تھے۔ کالی رنگت، جیٹ ایروپلین جیسی مونچھیں۔ ایک گھٹیا سے سوٹ پر ایک پھٹیچر فیلٹ ہیٹ پہنے یہ نوجوان صاحب بیٹھے تھے۔ ان کو وہم یہ تھا کہ ان کی خوب صورت مسکراہٹ پر لڑکیاں جان دیتی ہیں۔ اسی لیے وہ بار بار مسکرا مسکرا کر اپنے دانتوں کی نمائش کر رہے تھے اور ہر بار جب آشا یا اس کی سہیلی ان کی طرف نظر کرتی تھی تو وہ حضرت ہیٹ اٹھا کر سلام کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ادا آج کل کی چھوکریوں کو بہت پسند آتی ہے۔

آشا نے ایک بار اس کی طرف دیکھا، دوبارہ دیکھا تین بار دیکھا۔ ہر دفعہ اسی طرح دانتوں کی نمائش ہوئی اور اسی طرح ہیٹ ہوا میں اٹھا، چوتھی بار بے اختیار آشا کی نظر ادھر گئی تو نہ صرف ہیٹ اٹھایا گیا، نہ صرف مسکرا کر دانت نکالے گئے بلکہ نوجوان نے ہمت کر کے ایک آنکھ بھی ماردی اور بقول شخصے یہ سمجھا کہ یہ دونوں لڑکیاں تو اب ریجھ ہی گئی ہیں مجھ پر۔ اب کوئی دم میں بلاتی ہیں مجھے اپنی میز پر......

آشا اس بدتمیز کی حرکتوں سے اتنی تنگ آ چکی تھی کہ اس نے ادھر دیکھا کہ ہوٹل کا مینیجر یا کوئی بیرا ہی نظر آ جائے تو اس سے شکایت کرے مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ مگر اس وقت امر نے اپنے چہرے سے اخبار ہٹایا۔ آشا نے دیکھا کہ ایک تگڑا سا، مگر شریف صورت نوجوان ہے جو اس کی

طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

آپ ہی کچھ کیجیے نا، اس کمبخت کا۔'' آشا کی خاموش نگاہوں نے کہا۔

''کون تنگ کر رہا ہے آپ کو؟'' امر نے خاموش اشارے سے پوچھا۔

آشا نے پھر اس بدتمیز نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھا میری حرکتوں کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر ہیٹ اٹھا کر آنکھ ماری۔

اخبار نیچے رکھ کر امر اپنی میز سے اٹھا۔ ہیٹ والے نوجوان کی میز تک آیا، سامنے چائے دانی رکھی تھی۔ آؤ دیکھا، نہ تاؤ، چائے دانی ہی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ سر پر ہیٹ تھا چائے دانی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور وہ نوجوان اتنا ہکا بکا رہ گیا کہ اپنے چہرے سے وہ مسکراہٹ بھی دور نہ کر سکا جو لڑکیوں کو لبھانے کے لیے تھی۔

اور امر نے دیکھا کہ آشا اور اس کی سہیلی اس حرکت پر کھل کھلا کر ہنس رہی ہیں۔ پھر اس کی نظر صرف آشا پر رک گئی اور اس نے سوچا یہ لڑکی ہنستی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہے اور ایسے ان کی پہلی ملاقات ہوئی اور پھر وہ روز روز ملنے لگے۔

دو جوان دلوں کے ساتھ دو جوان دماغ بھی جب مل جائیں تو دوستی سے محبت تک کا فاصلہ بہت جلد طے ہو جاتا ہے۔

محبت کرنے والوں کے لیے تاج محل اور شالیمار باغ اور اجنتا اور کونارک کے مندروں کا پس منظر ضروری نہیں ہوتا۔ ان کی محبت تو کہیں بھی پروان چڑھ سکتی ہے۔

چوپاٹی کے ریت پر جہاں کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ دانہ چگتے ہیں اور پھر تخیل کی طرح اونچے اڑ جاتے ہیں۔

اپالو بندر جہاں پھل بیچنے والے لناس کی قاشیں بیچتے ہیں اور محبت کرنے والوں کو ان کی کھٹاس میں بھی مٹھاس ملتی ہے۔ گھوڑا گاڑی میں جو بڑی سست رفتاری سے چلتی ہے مگر جو سب سے زیادہ رومانٹک سواری ہے اور محبت کرنے والے دو دلوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا پورا موقع دیتی ہے۔

اور اتوار کے دن سارا کاروباری علاقہ ہی محبت کرنے والوں کے لیے ایک پارک بن جاتا

ہے جس میں وہ میلوں ٹہلتے ہوئے جاسکتے ہیں اور مشکل سے کوئی اِکا دُکا آدمی ان کو ملتا ہے۔

ایسے ہی ایک اتوار کی شام کو امر اور آشا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ٹہل رہے تھے کہ امر نے کہا۔ ''جی چاہتا ہے آج تمھیں چائے پلانے کے لیے تاج محل ہوٹل میں لے چلوں۔''

''پھر کیوں نہیں چلتے؟'' آشا نے کہا۔

امر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپیہ اور کچھ پیسے نکالے۔ ''کیونکہ آج میری جیب میں بس اتنے ہی پیسے ہیں۔''

''تو کیا ہوا؟'' آشا نے اپنا بٹوہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس جو ہیں وہ بھی تو آپ ہی کے ہیں۔''

اس پر امر نے سنجید ہو کر کہا— ''میں جانتا ہوں آشا، تم ایک امیر باپ کی بیٹی ہو لیکن ایک بات یاد رکھنا، جب میری جیب میں ٹیکسی بھاڑا نہیں ہوگا۔ تو ہم بس میں جائیں گے۔ جب بس کے پیسے نہیں ہو گے تو پیدل چلیں گے اور جب چائے کے پیسے نہیں ہوں گے ہم چائے نہیں پئیں گے۔''

آشا نے جلدی سے حامی بھری، سمجھ گئی، تو آج ہم پیدل چلیں گے اور چائے نہیں پئیں گے—''

اتنے میں ٹاؤن ہال کی سیڑھیوں کی طرف سے ایک آواز آئی ''چائے ہی میں تو چاہ ہوتی ہے۔ آؤ برخوردار چائے پیو۔''

انھوں نے ادھر دیکھا کہ ایک داڑھی والے بڑے میاں چائے کا ساوار اور بالٹی لیے بیٹھے ہیں اور لوگ ان سے چائے لے لے کر پی رہے ہیں۔

امر اور آشا بھی ان کے قریب ہی ایک سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ ''کیوں بڑے میاں چائے کی پیالی کتنے کی ہے؟''—امر نے آرڈر کرنے سے پہلے پوچھا۔

بڑے میاں نے جواب دیا— ''دس پیسے کی پیار کی پیالی'' اور یہ کہہ کر دو پیالیوں میں چائے بھر کر ان کو پیش کر دی۔''

اتنی میٹھی اور مزیدار چائے آشا نے بڑے بڑے ہوٹلوں میں نہیں پی تھی۔ اس میں ان کی محبت اور بڑے میاں کے خلوص دونوں کا مزا اور مٹھاس تھی۔ امر نے آشا کی طرف پیار بھری

نظروں سے دیکھا۔ آشا نے امر کی طرف اور چائے پیتے رہے۔
یہ سچ مچ ''پیار کی پیالی'' تھی؟

اور پھر ایک دن آشا دبے پاؤں گھر سے باہر جا رہی تھی تو اس کے باپ یعنی بیرسٹر صاحب کی آواز نے اسے پکڑ لیا۔
''آشا!''
''جی ڈیڈی!''
بیرسٹر صاحب بالکنی میں بیٹھے ہوئے صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔ ''ادھر آؤ۔!'' انھوں نے حکم دیا۔ اور جب بیٹی قریب آئی تو پوچھا۔ ''کہاں جا رہی ہو؟''
''جی ذرا جوہو تک جا رہی تھی سیر کرنے۔''
''جوہو؟ بڑی رومانٹک جگہ ہے نا؟''
''جی ہاں۔'' آشا نے گڑبڑا کر جلدی سے کہا۔ ''جی نہیں۔''
''جی ہاں۔ جی نہیں'' یہ کیا جواب ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتی کہ اس اخبار چی امر کمار سے ملنے جا رہی ہو۔'' بیرسٹر صاحب نے چور پکڑ لیا تھا۔
اب تو آشا کے سامنے اقبال جرم کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔ بیرسٹر صاحب نے جرح شروع کر دی۔ بالکل جس طرح وہ عدالت میں کیا کرتے تھے'' کیا اس نے تمھیں شادی کرنے کو کہا ہے؟''
''جی نہیں۔'' آشا نے شرما کر، سر جھکا کر جواب دیا۔ ''ابھی تک تو نہیں کہا۔''
''تو آگے چل کر کہے گا۔ جانتی ہو اس کو کیا تنخواہ ملتی ہے؟''
''جی ہاں جانتی ہوں۔ پانچ سو روپے مہینہ۔''
''پانچ سو روپے مہینے کی تو تمھاری ساڑیوں اور سینڈلس کی خریداری ہوتی ہے۔''
''ہوتی تھی ڈیڈی۔ مگر اب میں نے ان تمام چیزوں پر خرچ کرنا بند کر دیا ہے۔''
اب بیرسٹر صاحب نے اپنی جرح کو دوسرا رخ دیا۔ ''وہ اس خیال میں نہ رہے کہ گھر داماد

بن کر وہ یہاں رہے گا۔''

آشا نے جواب دیا۔ ''ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے ان کا' وہ تو مجھے چائے کے پیسے بھی نہیں دینے دیتے۔ چائے کے ذکر پر اس کو 'پیار کی پیالی' یاد آ گئی اور وہ مسکرا دی۔

بیرسٹر صاحب نے ایک اور زبانی حملہ کیا۔ ''میری جائیداد پر نگاہ ہے اس کی تو اس سے کہہ دینا کہ ابھی پچپن برس اور زندہ رہوں گا میں۔''

''بھگوان کرے آپ سو برس جئیں۔'' آشا نے جلدی سے کہا۔ اور پھر۔ ''میں جاؤں ڈیڈی!''

''جاؤ۔!'' بیرسٹر صاحب نے کہا۔ لیکن بیٹی نے مڑ کر چلنا شروع ہی کیا تھا۔ کہ دوسرا حکم صادر ہوا۔ ''ٹھہرو۔'' آشا ٹھہر گئی۔ باپ کی طرف مڑی۔

بیرسٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے بولتے بولتے آہستہ آہستہ بیٹی کی طرف آئے۔ ''یاد رکھو! اگر تم نے اس اخبارچی سے شادی کی تو وہ اپنے ساتھ تمھیں بھی بھوکا مارے گا۔ کسی گندی چال میں رکھے گا۔ تمھیں چلا چلا کر ہلکان کر دے گا تمھیں مصالحہ بھی پیسنا ہوگا، آٹا بھی گوندھنا ہوگا، روٹی بھی پکانی پڑے گی۔''

آشا ان الفاظ کا مطلب سمجھ گئی۔ اس کے ڈیڈی امر سے شادی کرنے کی مخالفت نہیں کر رہے تھے بلکہ امر کے ساتھ کس قسم کی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ اس کو ایک کٹھن جیون کے لیے تیار کر رہے تھے۔

قریب آ کر انھوں نے بیٹی سے بڑے پیار سے کہا۔ آشا بیٹی! آج تمھاری ماں زندہ نہیں ہے۔ ورنہ مجھے یہ باتیں نہ کرنا پڑتیں۔'' اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر۔ ''زندگی ایک رومانٹک ناول یا فلم نہیں ہے۔ سوچ سمجھ کر ہاں یا نا کرنا۔''

آشا اپنے فیصلے کی اہمیت سے واقف تھی۔ اس نے کہا۔ ''بہت اچھا' ڈیڈی!'' اور وہاں سے چلی آئی۔

بیرسٹر صاحب نے بیٹی کو جاتے دیکھا اور جب دروازہ بند ہو گیا تو ان کا چہرہ ایک عجیب مسکراہٹ سے روشن ہو گیا۔ جیسے اس طرح وہ بیٹی کو آشیرواد دے رہے ہوں۔

جوہو کے ساحل پر امر کی طرح سمندر کی لہریں بھی آشا کا انتظار کر رہی تھیں۔

ایک چٹان پر چائے والے بڑے میاں اپنی دوکان لگائے بیٹھے تھے۔ امر کو ایک پیالی دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "لو صاحبزادے چائے پیو۔ چائے پیو گے تو سوال کرنے کی ہمت آئے گی۔"

امر نے ایک بجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ "اچھا تو بتاؤ سوال کیا ہے؟"

"سوال یہ ہے کہ کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ ایک پیالی میں چائے پیو گی۔؟"

امر نے خالی پیالی واپس رکھتے ہوئے کہا۔ "اور جواب ہے نہیں۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ تاج محل ہوٹل میں چائے پینے کی عادی ہے۔ آج میں اس سے یہی کہنے آیا ہوں....." مگر اس نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا اور پیسے دے کر کوٹ کندھے پر ڈالے سمندر کی لہروں کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں آشا آئی اور اس نے سوال کیا۔ "سلام بڑے میاں! کوئی آیا تو نہیں؟"

"کوئی آیا بھی اور چلا بھی گیا" چائے والے نے جواب دیا۔ سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے آشا نے پوچھا۔ 'کہاں؟' مگر پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ دور سمندر میں نکلی ہوئی ایک چٹان پر ایک جانی بوجھی پرچھائیں نظر آ رہی تھی!

امر اکیلا بیٹھا ہوا اپنے اور آشا کے تعلقات پر غور کر رہا تھا اور اس کا ضمیر آج جذبات کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ آشا کو چاہنے لگا ہے۔ مگر کیا آشا بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ کیا وہ اس سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے گی؟ خود اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ عقل کہتی تھی کہ یہ بیکار باتیں بھول جاؤ۔ وہ امیر باپ کی بیٹی ہے۔ عیش و آرام کی زندگی گزارنے کی عادی ہے۔ تم ایک یتیم بے سہارا جسے صرف پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ ایسی حالت میں آشا سے محبت اور شادی کے خواب دیکھنا۔ بس خواب ہی دیکھنا ہے۔ مگر دل کہتا تھا کہ محبت کو روپے پیسے کی ترازو میں نہیں تولا جاتا۔ آشا دوسری امیر لڑکیوں کی طرح نہیں ہے۔ وہ مجھ سے سچ مچ محبت کرتی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ تو رہ سکتا ہوں مگر خوش نہیں رہ سکتا اور اس کے اندرونی جذبات ان شعروں میں جھلک رہے تھے جن کو وہ اکیلا بیٹھا گنگنا رہا تھا۔

دل جو دنیا کے غم و درد سے گھبرایا ہے
تیری زلفوں کے تلے آ کے سکوں پایا ہے

یہ آشا ہی تھی جو اس کی دوست تھی۔ جو اس کی ساتھی تھی۔ اس کی محبت کا مرکز تھی— آشا جو اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ میں امر کے سب شکوں اور شبہوں کا جواب تھا۔ وہ مسکراہٹ خاموشی کی زبان سے کہہ رہی تھی— ''مجھے دوسروں کی طرح مت سمجھ، میں دنیا کی ہر مشکل راہ پر تمھارا ساتھ دوں گی۔ میں تمھاری ہوں— تمھاری ہوں— تمھاری—......''
اور پھر وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں آ گئے تھے اور سمندر کی لہروں اور ناریل کے پیڑوں کی موجودگی میں ان کی محبت پر ایک بوسے کی مہر لگ گئی تھی...

ماضی کی ان یادوں کو لیے اب امر اور آشا ایک بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ بلڈنگ بہت اونچی تھی، ایک منزل کے بعد دوسری منزل تیسری منزل...... ہر سیڑھی پر ان کو اس زمانے کی باتیں یاد آ رہی تھیں، جب امر آشا کو بیاہ کر اس بلڈنگ میں لایا تھا۔

''آشی!'' امر نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا— ''تم تو اس بلڈنگ کو بھول گئی ہوگی۔ پوری پانچ منزلیں ہیں اور لفٹ نہیں—''

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی—؟ یہ لیجیے—'' اور یہ کہہ کر آشا تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی— ''آپ کا گھر اگر ساتویں آسمان پر بھی ہو تو میں وہاں بھی پہنچ سکتی ہوں— مگر آپ گھر میں رہتے ہی کب تھے؟ مجھے دن بھر آپ کے قرض داروں کے درشن ہوتے تھے۔ کرایے والا۔ دودھ والا۔ بھاجی والا......''

''اور رات کو یہ کمبخت پیپر والا—'' امر نے ہنستے ہوئے کہا۔

اب وہ تیسری منزل سے یا چوتھی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ امر نے یاد دلایا—

''پوری بہتر سیڑھیاں ہیں۔ ہر رات کو جب میں گھر لوٹتا تھا، تو انہیں گنا کرتا تھا۔''

''اور میں آپ کے قدموں کی آواز ہی سے سیڑھیاں گنتی رہتی تھی۔''

''اور پھر میرے اوپر پہنچنے سے پہلے ہی تم دروازہ کھول دیتی تھیں۔''

پانچویں منزل پر ان کی چھوٹی سی فلیٹ تھی اور اب آخری سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ آشا نے کہا۔ ''آپ آتے تھے اور پھر ہم کچن

میں جاکر آگ جلاتے تھے......''

''اور انڈے فرائی کر کے کھاتے تھے۔'' امر نے جملہ پورا کیا۔ اور پھر آشا کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ کر ــــ ''آشی! آج میں بہت بھوکا ہوں۔''

''سچ ــ؟'' آشا نے جذبات سے بھرپور آواز میں پوچھا ــ وہ خود بھی تو امر کی محبت کی بھوکی تھی۔

اور اب وہ اپنے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ دروازے پر ایک وکیل کا قانونی نوٹس چپکا ہوا تھا جو مالک مکان کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ برابر میں دیوار پر بنیا کوئلے سے لکھ گیا تھا ــ ''ادھار چکاؤ۔ نہیں تو راشن بند، چاہے جتنی دیر سے آؤ۔ رات کو آؤں گا۔''

اپنے گھر واپس آنے پر آشا کا بڑا عجیب سوا گت ہو رہا تھا۔ مگر امر کو ایسی دھمکیوں کی عادت تھی۔ اس نے مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی ــ ''کرائے دار کو نکالنا اتنا آسان تو نہیں ہے۔''

آشا نے دیوار کے نچلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں دو خالی دودھ کی بوتلیں رکھی تھیں اور بھیا بھی 'دودھ بند' کا اعلان لکھ گیا تھا۔

اوہ! کوئی بات نہیں بنا دودھ کی چائے پی لیں گے۔ آؤ!'' یہ کہہ کر اس نے کنجی لگائی اور دروازہ کھولا ــ اندر گیلری میں داخل ہو کر روشنی جلائی۔ پوسٹ مین ڈاک ڈال گیا تھا۔ وہ اٹھائی۔ پھر اسی تنگ جگہ میں آشا کو گلے لگاتے ہوئے کہا ــ 'ویلکم ہوم' مسز امر کمار! وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔''

آشا نے اس کو حقیقت یاد دلائی ــ ''لیکن یہ گھر کب تک ہمارا رہے گا ــ ابھی مالک مکان آئے گا اور شاید پولیس کو بھی ساتھ لائے۔''

امر نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر بجلی کی روشنی جلاتے ہوئے کہا ــ ''آج کی رات ہماری ہے۔ صرف ہماری ہے ــ آج ہم یہ دروازہ کسی کے لیے بھی نہیں کھولیں گے چاہے دودھ والا آئے، چاہے مکان والا۔ چاہے پولیس والا ــ''

آشا نے کمرے کی حالت پر نظر ڈالی اور ہر چیز کو بے ترتیب طریقے سے بکھرا ہوا پایا۔ پلنگ پر لانڈری سے آئے کپڑوں کے بنڈل رکھے تھے۔ کتابیں اوندھی سیدھی پڑی تھیں۔ کتابوں

کی الماریوں پر کپڑے ٹنگے تھے۔ لکھنے کی میز پر چائے کی پیالیاں اور جوٹھے برتن، کیمرہ، ٹائپ رائٹر، قلم، پنسلیں، کتابیں، کاغذ، اخبار، رسالے، خط، گڈمڈ پڑے تھے۔ صرف ایک چیز اپنی جگہ پر قاعدے سے رکھی تھی اور وہ تھی ان دونوں کی فریم کی ہوئی وہ تصویر، جو شادی کے دن لی گئی تھی اور جس میں وہ دونوں بہت خوش نظر آتے تھے۔ اگرچہ آشا آنے والی زندگی کے خیال سے کسی قدر سہمی ہوئی تھیں۔

''آپ لوگ بھی تو بس باتوں کے شیر ہیں۔'' آشا نے پلنگ پر سے کپڑے ہٹا کر اپنے بیٹھنے کی جگہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی عورت آپ کی دیکھ بھال کو نہ ہوتی تو نہ جانے آپ مَردوں کا کیا حال ہوتا۔''

امر نے ڈاک سے آئے خطوں اور رسالوں کا بنڈل میز پر پٹختے ہوئے اور کمرے کی اکلوتی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔ ''حال کیا ہوتا۔ وحشیوں کی طرح مزے سے گپھاؤں میں رہتے، گھاس چرتے اور جنگلی جانوروں کا کچا گوشت چباتے۔ آج وہ بے حد خوش تھا۔ آج وہ پھر آشا کو گھر واپس لے آیا تھا۔ آج سے وہ دونوں پھر اپنی مشترکہ زندگی شروع کریں گے۔ آج تو اس کا جی چاہتا تھا۔ گائے، ناچے، اودھم مچائے..... مگر سب سے پہلے اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کچھ کھائے اور کھلائے۔ پلین میں اس نے سینڈوچ بھی نہیں کھائی تھی۔ صرف چائے کی پیالی پی تھی۔ ''مجھے تو بہت زور کی بھوک لگی ہے۔'' دفعتاً کھڑے ہو کر کہا۔ ''میں کچن میں جا کر دیکھتا ہوں۔ کچھ انڈے وِنڈے ہیں یا نہیں؟''

اپنے شوہر کی ہر قسم کی بھوک کی بیتابی پر آشا کو ہمیشہ سے بڑا پیار آتا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ گیس جلائیے۔ جب تک میں یہ کاٹ کباڑ ٹھیک کرتی ہوں۔''

''جو حکم'' امر نے مذاق سے سر جھکا کر کہا۔ اور گنگناتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

اب آشا نے کمرے پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی، ایک دفعہ تو اتنی بے ترتیبی اور بے ڈھنگا پن دیکھ کر وہ کانپ اٹھی۔ مگر کہتے ہیں سگھڑ عورت کے نازک ہاتھوں میں جادو ہوتا ہے۔ جو دنیا کی افراتفری کو ترتیب میں تبدیل کر دیتا ہے۔ آشا کے سلیقے سے امر کے کمرے کی بھی کایا پلٹ ہو گئی۔ اب کتابیں الماریوں میں رکھی تھیں۔ پلنگ پر بستر لگا کر پلنگ پوش ڈال دیا گیا تھا۔ دھوبی

کے کپڑے الماری میں رکھ دیے گئے تھے اور میلے کپڑے باتھ روم کی میلے کپڑوں کی ٹوکری میں۔ میز پر ہر چیز ترتیب سے رکھ دی گئی تھی۔ قلم، دوات، پنسلیں، فائل، ڈاک سے آئے ہوئے خطوں کو پلندہ...... آشا نے اطمینان سے بیٹھ کر ڈاک کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جب وہ یہاں ہوتی تھی تو امر اصرار کرتا تھا کہ ڈاک وہی کھولے۔ کوئی ضروری خط ہو تو اس کو جواب دینے کے لیے دے دے۔ مگر آج اس کو خط کھول کر دیکھنے میں تھوڑی اور دلچسپی بھی تھی۔ جس کا اقرار وہ چپکے سے دل میں بھی کرنے سے گھبراتی تھی۔ کہیں کسی اور لڑکی کا خط تو نہیں آیا۔ جرنلسٹوں اور ادیبوں کے پاس تو رومانٹک خط آتے ہی رہتے ہیں ..... مگر آج کی ڈاک تو بہت ہی غیر رومانی تھی۔ آرٹ گیلری میں کوئی نمائش تھی، اس کا دعوت نامہ — جرنلسٹ یونین میں کسی کا بھاشن تھا، اس کی اطلاع۔ ٹیلی فون کمپنی کا بل، جو چھ مہینے سے ادا نہیں ہوا تھا اس کا آخری نوٹس — ہوٹل جل ترنگ میں نیا کیبرے آج شروع ہو رہا تھا۔ اس کا دعوت نامہ۔ راج محل ہوٹل میں بہار ریلیف فنڈ کے لیے کوئی فیشن شو تھا۔ وغیرہ وغیرہ..... مگر یہ کیا، ایک لمبے لفافہ میں جو ڈاک سے نہیں آیا تھا، کوئی آ کر ڈال گیا تھا — ایک بھاری سا پیکیٹ — آشا نے سوچا کسی سوسائٹی یا کلب کی چھپی ہوئی رپورٹ ہوگی مگر کھول کر دیکھا تو اندر سے دو ہوائی جہاز کے ٹکٹ نکلے — مسٹر امر کمار کے لیے۔ مسز امر کمار کے لیے — فرسٹ کلاس — پیرس، لندن، نیویارک کے لیے — یہ کیا مذاق ہے؟ امر نے چپکے چپکے یہ سب انتظام کر لیا اور اس کو بتایا بھی نہیں۔" آشا نے سوچا — "کیسا ڈرامہ کیا — مجھے اپنی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ کرنا ہے۔ آج کی رات ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کو پانا ہوگا یا ہمیشہ کے لیے کھو دینا ہوگا۔" مجھے تو ڈرا ہی دیا تھا امر نے!

"مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ!" گنگناتے ہوئے امر کچن کی حالت کو ٹھیک کرنے کے لیے میز کو صاف کر رہا تھا۔ وہاں دو صاف پلیٹیں رکھ رہا تھا کہ آشا داخل ہوئی۔

"بھئی دو انڈے تو مل گئے۔ ڈبل روٹی بھی ہے۔ بس ابھی انڈے فرائی کرتا ہوں۔"

یہ تو بیویوں کا تکیہ کلام ہوتا ہے — "کیوں کیا ہوا؟" امر نے پوچھا "آپ نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ ہم ہوائی جہاز سے ولایت جا رہے ہیں۔ آشا نے شکایت کی۔ مگر اس شکایت میں شکریہ بھی تھا۔

''امر نے تعجب سے پوچھا۔ ''ہم ولایت جا رہے ہیں۔''؟

''ہوں۔'' آشا نے ٹکٹوں کو پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔

''ارے کہیں سپنے تو نہیں دیکھ رہی ہو۔''

''دیکھیے اب اور بے وقوف نہ بنائیے۔'' لفافہ آگے کرتے ہوئے'' یہ رہے وہ ٹکٹ جو آپ نے منگائے ہیں!''

''ٹکٹ؟ میں نے منگوائے ہیں!'' امر نے لفافہ ہاتھ میں لے کر اس پر بھیجنے والے کے چھپے ہوئے پتے کو پڑھا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی مگر اس کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا اور بے فکری کی جگہ ایک گہری سوچ نے لے لی۔ ''ہاں آشی! ہم ولایت جا سکتے ہیں لیکن ان ٹکٹوں کے لیے ہمیں بڑی قیمت دینی ہوگی۔''

''جی!'' آشا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امر کیا کہہ رہا ہے۔ ''یہی وہ بات ہے جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا (جو یقینی ہونے والی تھی) بات کو ملتوی کرتے ہوئے کہا۔'' لیکن بات کرنے کو تو ساری رات پڑی ہے۔ پہلے انڈے فرائی کر کے کھالیں۔ کہتے ہیں کہ خالی پیٹ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔'' اور اب اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم وہاں بیٹھو۔''

''مگر۔'' آشا نے گیس کے چولھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے انڈے تو فرائی کرنے دیجیے۔''

امر نے آشا کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے اس کو کرسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو بیٹھو۔ ارے پلیز! بیٹھو نا!'' اور پھر چولھے کی طرف جاتے ہوئے۔ '' آپ آج کی رات ہماری مہمان ہیں۔''

سیٹھ ڈالیریا کی نوکری کی تجویز کے بارے میں آشا سے بات کرنے سے پہلے امر اپنے آپ کو اس بحث کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔ آشا کو بھی اس کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا، مگر سیٹھ ڈالیریا نے ٹکٹ بھیج کر اس کا پروگرام درہم برہم کر دیا تھا۔ آدھا راز تو آشا کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا، اب وہ اس تجویز کو کیسے پیش کرے۔ امر یہ سوچ رہا تھا اور گیس کے چولھے پر فرائنگ پین رکھ رہا تھا۔ اس میں بناسپتی گھی ڈال رہا تھا۔

''آشا!'' اس نے کچھ سوچ کر کہا— ''یہ معمولی فرائنگ پین نہیں ہے یہ ہے دنیا اور یہ ہنا سپتی گھی نہیں ہے۔ یہ ہے ہماری زندگی، یہ زندگی کتنی تیز آنچ پر پگھل رہی ہے، یہ تب معلوم ہو گا، جب ہم خود اس زندگی میں کود پڑیں گے—'' گھی اب تیز آگ پر فرائی چین میں کڑکڑا رہا تھا۔ امر نے ایک انڈا توڑ کر اس میں ڈالتے ہوئے کہا— ''تو یہ چلا امر کمار'' اور پھر دوسرا انڈا توڑا۔'' اور یہ اس کا ساتھ دینے کو آئی آشا!''— انڈے گرم گھی میں چھن مُن کر رہے تھے، تلے جا رہے تھے۔ آشا اپنے شوہر کی شاعرانہ باتوں پر مسکرا رہی تھی۔ ''دونوں زندگی کی اس آگ میں جل رہے ہیں، جھلس رہے ہیں۔'' ایک چمچہ فرائی پین میں ڈالتے ہوئے امر نے کہا— ''کیوں کر دوں ان کو الگ الگ؟''

''نہیں نہیں ایسا نہ کیجئے گا!'' آشا بے قرار ہو کر کرسی سے اٹھی اور امر کے قریب جا کر دل سے نکلی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ دونوں اکٹھے ہی رہیں گے۔''

''ہمیشہ۔'' امر نے پوچھا۔ وہ نازک بحث کرنے سے پہلے یہ اقرار کرا لینا چاہتا تھا کہ جو بھی صورت حال پیش آئی، وہ دونوں ہمیشہ اکٹھے رہیں گے مگر آشا نے گفتگو کو ایک نیا رخ دے دیا۔

''ہمیشہ اور ہر جگہ—''

اس نے کہا—

'ہر جگہ' اس فقرے کا مطلب امر نہیں سمجھا تھا۔

اور اب وہ دونوں کرسیوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے اور آشا بہت خوش ہو کر کہہ رہی تھی۔ ''ہاں بمبئی ہو، لندن ہو، پیرس ہو، یا نیویارک لیکن مجھے تو پیرس پسند ہے۔ میں وہاں اپنی فرنچ کی پریکٹس کروں گی۔'' اور پھر اپنی فرنچ زبان جاننے کا رعب جمانے کے لیے کہا— ''یادوزیم!'' میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

امر کو بھی تھوڑی سی فرنچ آتی تھی۔ وہ بولا ماؤت زی' یعنی میں بھی (محبت کرتا ہوں) مگر پھر ایک سنجیدہ لہجے میں جو بات پہلے کہی تھی، وہی دوہرائی— ''آشی! ہم لندن، پیرس یا نیویارک کہیں بھی جا سکتے ہیں مگر اس کے لیے ہمیں بہت بڑی قیمت دینی پڑے گی۔''

''قیمت! قیمت! قیمت!'' آشا نے سوچا— یہ کئی بار قیمت کا ذکر کیوں کر چکے ہیں— اور

کہا— ''کیا قیمت دینی ہوگی؟''

امر نے آخر کار وہ بات کہہ ہی دی— جس کی تمہید اتنی دیر سے باندھی جا رہی تھی۔ ''مجھے سیٹھ ڈالیریا کے ہاں نوکری کرنی ہوگی!''

مگر آشا کو اس میں کوئی خطرناک بات نہ نظر آئی۔ ''تو اس میں کیا ہوا؟ کہیں نہ کہیں تو نوکری کرنی ہی ہے۔ اب بھی تو آپ اپنے اخبار کے مالک کی نوکری کرتے ہیں۔''

''آشی! مجھے جرنلزم چھوڑ کر ڈالیریا اینڈ کمپنی کی پبلیسیٹی کرنی ہوگی، سیٹھ ڈالیریا کے نام کا دنیا بھر میں ڈھول پیٹنا ہوگا۔ تمھیں ان دونوکریوں میں کوئی بھی فرق نہیں معلوم ہوتا۔''

''فرق بہت بڑا ہے۔ آشا نے طنز بھرے لہجہ میں جواب دیا— ''وہ لوگ پانچ سو روپیہ مہینہ دے کر اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے آپ سے کام لیتے ہیں۔ ڈالیریا اینڈ کمپنی میں کم سے کم ہزار روپیہ مہینہ تو ہوگا۔''

''اب تو امر کو ساری بات بتا نا ہی پڑی— '' ہزار روپیہ مہینہ نہیں۔ ڈھائی ہزار روپے مہینہ۔ اور پھر فری ہاؤس اور فری کار۔''

''اور آپ اب تک اس بارے میں سوچ رہے ہیں۔''

''آشی! میں انکار کر آیا ہوں۔''

''آپ انکار کر آئے ہیں؟''

آشا نے حیرت سے سوال کیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دنیا میں کوئی آدمی ایسی بے وقوفی بھی کر سکتا ہے۔

امر نے اس 'بے وقوفی' کی وجہ بتانے کی کوشش کی۔ 'یہ نوکری مجھے صرف اس لیے دی جارہی ہے کہ میں اپنے اخبار میں سیٹھ ڈالیریا کے کالے کرتوتوں کا بھانڈا نہ پھوڑوں، جو آرٹیکل میں ان کے خلاف لکھ رہا ہوں وہ بند ہو جائیں'

غصے میں آشا کرسی چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔ ''یہ لیکھ نہیں چھپیں گے تو کون سا آسمان پھٹ پڑے گا؟ آپ ہمیشہ کسی نہ کسی کے خلاف لکھتے آئے ہیں۔ کبھی سرکار کے خلاف، کبھی پیسے والوں کے خلاف، کبھی کالا بازار والوں کے خلاف۔ مجھے بتایئے کہ آپ کے لیکھ سے کسی کو فائدہ بھی پہنچا

ہے —؟ ملک کی جو حالت پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔ صرف ہماری حالت اتنی خراب ہو گئی ہے کہ ہم کل بنئے کی دوکان سے راشن تک نہیں لا سکتے۔'' آشا کا غصہ جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑا۔ ان ہی باتوں سے تنگ آ کر وہ اپنے باپ کے گھر واپس آ گئی تھی۔

امر نے بھی غصے سے گرم ہو کر کہا — ''تم کیا چاہتی ہو میں اپنا قلم بیچ دوں؟'' وہ سمجھتا تھا کہ اس دلیل کے سامنے تو آشا بھی لاجواب ہو جائے گی۔'' مگر آشا عورت تھی اور عورت منطق سے نہیں جذبات سے کام لیتی ہے۔ مرد چاند ستاروں کی بات سوچتا ہے عورت زمین کی بات سوچتی ہے۔ دال، چاول، آٹے کی فکر کرتی ہے — ''میں چاہتی ہوں کہ آپ دنیا کی چنتا چھوڑ کر اپنی فکر کریں۔ میرے بارے میں بھی سوچیں۔ کب تک ہم بنجاروں کا سا جیون بتاتے رہیں گے۔ ایک کمرے کے فلیٹ میں ہم رہتے ہیں۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ گھر میں مہمان بھی آ سکتے ہیں؟''

''مہمان!'' امر نے تعجب سے یہ لفظ دوہرایا — ''کیا ہمارے ہاں کوئی مہمان آنے والا ہے؟''

''ابھی تو مہمان نہیں آنے والے ہیں لیکن آ سکتے ہیں۔'' آشا نے نظریں جھکا کر جواب دیا اور پھر دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز میں ہلکے سے — ''ننھا امر — ننھی آشا!''

'ننھا امر، ننھی آشا!' امر نے ان خوب صورت الفاظ کو نرمی سے دوہرایا۔ اور آشا کا مطلب سمجھ کر اس کا چہرا ایک نئی روشنی سے چمک اٹھا — اپنے بچوں کی خواہش اس کے من میں بھی چوروں کی طرح چھپی بیٹھی تھی — ''ہمیں ان کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا۔ تب ہی اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے —'' آشا کبھی اب آگے بحث غیر ضروری ہے۔ فیصلہ ہو گیا — ''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ ڈھائی ہزار روپے۔ فری ہاؤس۔ فری کار — اور کیا چاہیے؟''

مگر امر کو ابھی سوچنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔ ننھے امر اور ننھی آشا کے بارے میں بھی تو سوچنا ہوگا۔ جس دنیا میں ڈالیریا جیسوں کی حکومت ہوگی، اس میں ننھے امر اور ننھی آشا کا کیا مستقبل ہوگا؟ سو بات بدلتے ہوئے اس نے کہا۔''اور کچھ نہیں چاہیے، ان فرائی انڈوں کے ساتھ پینے کے لیے ایک گرم گرم چائے کا پیالہ بھی نہیں چاہیے —''

''آشا نے کہا — وہ تو آج ضرور چاہیے۔ یاد ہے بڑے میاں کیا کہا کرتے تھے؟''

''ہاں یاد ہے!'' امر نے چائے کی کیتلی میں پانی بھرتے ہوئے کہا اور پھر بڑے میاں کی بھاری آواز بنا کر ''چائے ہی میں تو چاہ ہوتی ہے دس پیسے میں پیار کی پیالی۔''

''آشا ہنس پڑی۔ اور عین اُس وقت ان کے دروازے کی گھنٹی نہایت کرخت لہجہ میں بجی۔

آشا نے سہم کر آہستہ سے پوچھا۔''اتنی رات گئے کون آیا ہے؟''

'دنیا' امر نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ''مکان والا — دودھ والا اور شاید پولیس والا۔''

گھنٹی بار بار بجتی رہی لیکن امر نے دروازہ نہ کھولا۔ اپنا کوٹ کرسی سے اٹھاتے ہوئے اس نے آشا کا ہاتھ پکڑا — اور کہا۔ '' آج یہ دروازہ ہم کسی کے لیے نہیں کھولیں گے۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے آشا کو پچھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور دونوں اُدھر سے نکل کر لوہے کے چکر دار زینے سے اتر گئے۔

دروازے پر پہلے گھنٹی بجتی رہی۔ پھر دھڑ دھڑ شروع ہوئی۔ پھر دروازہ توڑ دیا گیا اور وہی پولیس انسپکٹر جس نے ٹیلی فون پر بیرسٹر صاحب سے بات کی تھی داخل ہوا۔ ساتھ میں چار کانسٹبل۔ دو نے بیڈروم کی تلاشی لی۔ ایک نے باتھ روم میں جھانکا۔ انسپکٹر نے خود کچن میں اوپر نیچے سب جگہ دیکھا۔

ایک کانسٹبل نے بیڈروم سے آکر رپورٹ کی — ''صاحب اس کمرے میں تو کوئی بھی نہیں ہے —''

''کوئی بھی نہیں!'' انسپکٹر نے کہا — ''تو پھر باتیں کون کر رہا تھا؟'' پھر اس نے گیس کے چولھے کی طرف دیکھا۔ ''اوہ! انڈے بھی فرائی ہو رہے ہیں۔ یہاں ضرور کوئی تھا —'' اتنے میں ایک اور کانسٹبل نے باہر بالکنی میں سے آکر کہا — ''صاحب! پیچھے سیڑھیاں ہیں۔''

''ہوں — '' تو ادھر سے نکل گئے ہوں گے'' اور سب چکر دار زینے سے اترنے لگے۔

اس وقت امر اور آشا سڑک پر نکل آئے تھے اور ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔

امر نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا — ''جلدی سیدھے چلو!'' مگر ہم جائیں گے کہاں؟'' آشا نے پوچھا۔ وہ کسی قدر گھبرائی ہوئی تھی۔

امر نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آشی آج ہم ان سب جگہوں پر جائیں گے۔ جہاں تم ہمیشہ جانا چاہتی ہو مگر ہم جا نہیں سکتے۔" "کبھی پیسہ نہیں ہوتا۔ کبھی وقت نہیں ہوتا۔"

"میں نے کبھی شکایت کی ہے۔"؟

"نہیں۔۔ مگر نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے ہم کو ذرا اس سوسائٹی کی جھلک دیکھ لینی چاہیے، جہاں شاید ہمیں اب اپنا زیادہ وقت گزارنا ہوگا۔" امر طنز نہیں کر رہا تھا، بڑی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ "آج ہمیں کئی INVITATIONS ہیں۔ راج محل ہوٹل میں فیشن شو ہے، ٹوٹو کے ہاں مڈنائٹ پارٹی ہے لیکن سب سے پہلے ہم جائیں گے، ہوٹل جل ترنگ وہاں تم ایک بہت دلچسپ نوجوان سے ملو گی۔"

"کون ہے وہ؟"

"وہ اپنا نام جوزف بتاتا ہے مگر اس کا نام ہے' جانی'۔ مجھے لگتا ہے کہ اس جانی سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ شاید اس فیصلے میں بھی اس سے مدد ملے جو آج کی رات ختم ہونے سے پہلے ہمیں کرنا ہے!"

آشا کچھ نہ سمجھی امر کیا کہہ رہا ہے، کیا کہنا چاہتا ہے۔ مگر اسے اس بات کی خوشی تھی کہ آج مجھے کتنے مہینوں کے بعد امر کی قربت حاصل ہے۔ وہ اپنے شوہر کے اتنے قریب ہو کر بیٹھ گئی کہ اس کی گرم گرم سانس کو اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی تھی۔ خوشی کے احساس سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کی ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس رات کا سینہ چیرتی ہوئی جوہو کی طرف بڑھتی گئی۔ جہاں مشہور کیبرے آرٹسٹ للی آج اپنا نیا ڈانس پیش کرنے والی تھی۔

○

اندھیرے میں روشنی

رات کے سمندر میں ہوٹل جل ترنگ ایک جگمگاتا ہوا جزیرہ تھا۔

ایک کے بعد ایک سمندر کی لہریں ہوٹل کی سنگین دیوار سے سر ٹکراتی تھیں اور اندر داخل ہونے کی اجازت نہ پا کر لوٹ جاتی تھیں مگر ڈانس بینڈ کی دھن ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی باہر آ رہی تھی۔ اور چاندنی میں سمندر کی لہریں ناچ رہی تھیں۔ ان غریب مگر شوقین مزاج لوگوں کی طرح جو ہوٹل کے باہر ہی کھڑے بینڈ کی دھن پر تھرک لیتے ہیں۔

للی اپنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ میں اپنے آپ کا معائنہ کر رہی تھی۔ آج کیبرے کا نیا پروگرام تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سنگھار میں کوئی کمی رہ جائے۔ بھورے رنگ کے ریشمی بال ہیئر ڈریسر بنا گئی تھی۔ للی نے صرف ایک پھول بالوں میں لگا لیا۔ بھویں پتلی اور خمدار تھیں EYE BROW پنسل سے انھیں اور ابھارا گیا تھا۔ پلکیں 'مسکرا' سے کالی اور لمبی کی گئی تھیں۔ لیکن ان کے اندر آنکھیں واقعی بہت خوب صورت اور حیرت ناک حد تک معصوم اور کالی تھیں۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک ہونٹوں کی کمان کو نمایاں کر رہی تھی۔ گورے گالوں پر ٹھوری کے اوپر دائیں طرف ایک تل تھا جو پاؤڈر اور روژ میں چھپ گیا تھا۔ اس کو کالی پنسل سے اجاگر کیا گیا تھا۔ للی نے ابھی تک ڈانس کا ڈریس نہیں پہنا تھا۔ صرف کالی لیس' کا شمیز' پہنے آئینہ کے سامنے بیٹھی تھی جس میں سے

اس کے سینے کا قدرتی ابھار جھلک رہا تھا۔ جس میں صرف جوانی کا خمیر تھا۔ کسی 'بریسیز' کی بیرونی امداد نہیں لی گئی تھی۔ باہر ڈائننگ روم میں بیٹھے ہوئے کتنے ہی تھے جو اس حالت میں للّی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ہزار روپے بھی خرچ کر دیتے لیکن للّی کے ڈریسنگ روم میں کسی کو آنے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔

اس کو غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ جب اس کی آیا نے وزیٹنگ کارڈ لا کر دیا، للّی نے پڑھا تو اس کے غصے کا پارہ اور بھی اونچا ہو گیا۔ لکھا تھا۔''فرام جانی وِدلَو'' FROM JOHNY WITH LOVE جانی کی طرف سے محبت کے ساتھ۔

''کیا بھیجا ہے؟'' اس نے آیا سے پوچھا۔

اس کے سوال کے جواب میں ہوٹل کے دو بیرے پھولوں کی ایک لمبی چوڑی ٹوکری، بلکہ ٹوکرا لیے داخل ہوئے اور 'سلام میم صاحب' کہہ کے پھولوں کا انبار میز پر رکھ کر رخصت ہو گئے۔

''یہ پھول بھیجے ہیں۔'' آیا نے ٹوکری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''آیا! اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔'' للّی غصے سے چلائی۔

''پھر دو بیروں کو بلانا پڑے گا۔ میم صاحب!'' آیا نے جواب دیا۔ ''ٹوکری کا سائز تو دیکھیے کم سے کم سو روپے کے پھول ہوں گے۔''

''اچھا رہنے دو۔ یہ جانی تو پاگل آدمی ہے۔'' اور للّی کو معلوم تھا کہ وہ اس قسم کی پاگل پن کی حرکتیں کرتا ہی رہتا ہے۔ للّی نے اسے کبھی منہ نہیں لگایا تھا۔ مگر سو روپے کے پھول! اتنا بہت روپیہ جانی کے پاس کہاں سے آیا۔ اس نے سوچا۔ اور پھر اونچی آواز میں آیا سے کہا۔ ''سنو! مہاراج کمار صاحب آئے ہیں؟''

'جی میم صاحب!' آیا جلدی سے اور بڑے جوش سے بولی۔ کیوں کہ یہ پیغام پہنچانے کے لیے روز مہاراج کمار صاحب سے اسے ایک دس روپے کا نوٹ ملتا تھا۔ ''پرمٹ روم میں ہیں۔ وہ بولے۔ کیبرے کے بعد آپ کو راج محل ہوٹل لے جائیں گے۔''

پرمٹ روم! اجازت کا کمرہ۔ یعنی جہاں جن لوگوں کو شراب پینے کی سرکاری اجازت ہو

ان کو شراب مل سکتی ہے۔

ہر ہوٹل میں ایک پرمٹ روم ہوتا ہے، ہر ایک کا نام بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ کسی کا پرمٹ روم 'میکدہ' کہلاتا ہے کسی کا 'عمر خیام روم' کسی کا 'آب حیات' کسی کا 'اجنتا' تو کسی کا تاج محل۔ ہوٹل جل ترنگ کے پرمٹ روم کا نام 'مدھوشالہ' تھا۔ یہ مدھوشالہ بھی کسی 'دھرم شالہ یا پاٹھ شالہ سے کم مقبول نہیں تھا، جیسے ہی دروازہ کھلنے کا وقت ہوتا تھا، نوجوان اور بوڑھے۔ عورتیں اور مرد اپنی اپنی کتابیں یعنی پرمٹ لیے ہوئے بیتابی سے اندر گھستے تھے اور آتے ہی اپنی اپنی شراب کا آرڈر دیتے تھے۔ چونکہ پرمٹ روم صرف چند گھنٹوں کے لیے کھلتا تھا۔ اس لیے یہاں کا اصول تھا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ شراب پی جائے۔ اس کی بھی کوشش ہوتی تھی کہ 'پرمٹ' پر یونٹ کم لکھی جائیں اور شراب زیادہ پی جائے۔

جانی پرمٹ روم کے سب قاعدے قانون سے اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے بھی واقف تھا۔ وہاں کے ویٹر بھی اسے جانتے تھے۔ مینیجر بھی پہچانتا تھا۔ آخر جانی خود اس دھندے میں تھا، گو وہ خود بغیر پرمٹ کے شراب سپلائی کرتا تھا۔ سونے کے بٹن لگی شیروانی پہنے، نشیلی آنکھوں میں پہلے ہی خمار لیے مہاراج کمار نے ایک انجانے نوجوان کو اپنی میز پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو تعجب ہوا، کچھ برا بھی لگا مگر جب جانی نے ڈمپل اسکاچ کی بڑھیا وہسکی کا آرڈر دیا تو مہاراج کمار کو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان اچھی وہسکی کی پہچان رکھتا ہے۔ مہاراج کمار نے خود سستی اور دیسی بلیک نائٹ وہسکی کا آرڈر دیا تھا۔ ویٹر دونوں کی پرمٹوں کو لے گیا اور وہسکی کے پیگ اور سوڈے کی بوتلیں سامنے رکھ گیا۔

جب مہاراج کمار نے ایک پیگ پی لیا اور دوسرا اس کے سامنے آ گیا تب جانی نے زبان کھولی۔

''مہاراج کمار صاحب! مجھے آپ کی کار چاہیے۔ دام بولیے۔''

''کیا کہا— کار چاہیے؟ مہاراج کمار نے اس اچانک اور گستاخانہ سوال پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کو میری کار سے کیا تعلق ہے؟''

''سب کچھ مہاراج کمار صاحب!'' جانی نے جواب دیا— کیونکہ میں اسے خریدنا چاہتا ہوں۔''

مہاراج کمار صاحب سمجھے یہ کوئی مذاق ہے' یا یہ نوجوان ابھی سے پی کر بہک گیا ہے—
''تم کچھ پاگل ہو۔ معلوم ہے میں نے ابھی پچھلے سال تیس ہزار میں خریدا تھا۔''
انھوں نے کار صرف بائیس ہزار میں خریدی تھی لیکن تھوڑی رقم بڑھانے میں کیا نقصان تھا۔ اتنی بڑی قیمت سن کر اس نوجوان کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا لیکن اس کے جواب نے ان کو حیرت میں ڈال دیا۔ ''میں آپ کو اکتیس ہزار روپے دینے کو تیار ہوں۔ آپ نے جب یہ کار خریدی تھی جب بھی سکینڈ ہینڈ تھی۔''
''تم مجھے اتنی رقم دے سکتے ہو؟'' مہاراج کمار نے سوال کیا۔ حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ یہ معمولی کپڑے کا سوتی کوٹ پہنے ہوئے نوجوان کہاں سے اتنے روپے لائے گا؟
مگر اتنی ہی دیر میں ویٹر ان کے بل لایا اور ساتھ میں ان کی پرمٹیں بھی ٹرے میں رکھ کر۔ جانی نے جلدی سے دونوں بل اٹھائے۔ مہاراج کمار کی پرمٹ ان کو دی، اپنی پرمٹ جیب میں ڈالی اور بغیر بلوں کو دیکھے ہوئے جیب سے ایک ہزار کا نوٹ ٹرے میں ڈال دیا۔ اس ایک ہزار کا نوٹ نکالنے کے لیے اس نے بڑی لاپرواہی سے جیب میں سے ہزار کے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا۔ جس کو دیکھ کر مہاراج کمار کے منہ میں پانی آ گیا۔ انھوں نے تو کئی مہینے سے ہزار روپے کے نوٹ کی شکل نہیں دیکھی تھی۔
اس انجانے نوجوان کی دولت سے مرعوب ہو کر مہاراج کمار نے پوچھا ''کیا نام ہے تمھارا؟''
'جانی!'
'جانی!' مہاراج کمار نے نام کو دوہرایا۔ زبان پر اچھا لگتا تھا۔— ''جانی! کافی سیریس معلوم ہوتے ہو۔ اچھی بات ہے کل تم ہمارے سکریٹری سے مل لو اور سب کچھ اس سے طے کر کے کار اپنے نام ٹرانسفر کرا سکتے ہو؟'' اس طرح ان کا سکریٹری جو کئی بار استعفیٰ دینے کی دھمکی دے چکا تھا۔ اپنی چھ مہینے کی تنخواہ بھی وصول کر سکے گا جو اس کی بقایا تھی۔
مگر جانی کا موڈ کچھ اور ہی تھا۔ اس نے کہا— ''مہاراج کمار صاحب! میں کل تک انتظار نہیں کر سکتا۔ میں جلدی میں ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے سو سو کے نوٹوں کی تین گڈیاں جیب سے نکالیں اور میز پر رکھ دیں۔ ان پر ہزار روپیہ کا ایک نوٹ رکھ دیا دس بیس تیس۔ اکتیس ہزار روپے

لیجیےاور کار کی چابیاں مجھے دیجیے۔ باقی FORMALITIES کل طے ہو جائیں گی۔''

مہاراج کمار کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ مگر ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ کار کی چابیاں جانی کو دیں اور اکتیس ہزار روپے اپنی جیب میں ڈالیں۔

جانی نے چابیوں کے گچھے پر اس طرح قبضہ کیا، جیسے وہ ایک کار کی چابیاں نہ ہوں، بلکہ وہ طلسمی چابیاں ہوں، جن کی مدد سے وہ دنیا کا ہر خزانہ کھول سکتا ہے۔

ڈائننگ ہال میں ڈنر ختم ہو چکا تھا۔ اور اب سب لوگ بیتابی سے للّی کے کیبرے ڈانس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں امر کمار اور آشا بھی تھے، جن کو پریس کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے سب سے آگے کی میز دی گئی تھی۔ امر آشا سے کہہ رہا تھا— ''ابھی شاید کیبرے شروع ہونے والا ہے —''

کہ جانی آتا نظر آیا۔ وہ دور ہی سے بہت خوش نظر آتا تھا۔ چابیاں ہوا میں اچھالتا چلا آ رہا تھا۔

''اوہ! ہیلو مسٹر کمار!'' اس نے تپاک سے امر کمار سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا— ''اچھا ہوا تم آ گئے!'' اور پھر آشا کی طرف اشارہ کر کے۔''یہ مسز امر کمار ہیں نا؟'' اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ چلّایا۔

''ویٹر! اے ویٹر—!''

''یہ صاحب اور میم صاحب کا بل ہمارے بل پر کر دو—''

''بہت اچھا صاحب!'' ویٹر نے سلام کیا اور چلا گیا۔

اب امر کمار کو کچھ کہنے کا موقع ملا— ''بڑے خوش نظر آ رہے ہو مسٹر جوزف!'' امر کمار نے 'جوزف' پر ہلکا سا زور دیا تھا۔

جانی انگریزی میں بولا جیسے اس نے کسی امریکن فلم کے ویلین کو کہتے سنا تھا— '' JUST CALL ME JOHNNY اور پھر خوشی سے چلّایا— ''جوزف مر گیا۔ سو میں خوش کیوں نہ ہوں، یہ دیکھو چابیاں، ابھی ابھی میں نے پورا بمبئی شہر خرید لیا ہے۔''

اتنے میں ہال کی روشنیاں دھیمی ہونی شروع ہوئیں— اب کیبرے شروع ہونے میں دیر نہیں تھی۔ جانی ''ایکس کیوزمی'' کہہ کر اپنی جگہ لینے کے لیے بھاگا—

امر نے آشا کی طرف دیکھا۔ اور آشا نے امر کی طرف جیسے کہہ رہی ہو، آپ کا دوست بھی کتنا عجیب ہے۔"

اور پھر اس ہال میں بھی جو فیشن ایبل کپڑے اور بھڑکدار ساڑیاں اور ڈریسز پہنے ہوئے عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا، جہاں ایک ایک ٹیبل پر کھانے کا بل سوسو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے آیا تھا۔ جہاں ابھی ابھی سینکڑوں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا چھا گیا۔ پھر ہر میز پر ٹمٹماتی ہوئی موم بتی جلائی گئی۔ جس کی پیلی مدھم روشنی میں ہر چہرا ایسا لگتا تھا جیسے کالے اندھیرے خلا میں، بغیر جسم کی روحیں بھٹک رہی ہوں۔

اور ان ہی میں دو چہرے امر اور آشا کے تھے جو اس اندھیرے میں اپنے لیے زندگی کے لیے روشنی تلاش کر رہے تھے اور ایک چہرا جانی کا تھا، جو انتظار کر رہا تھا کہ کب اسٹیج کا اندھیر دور ہو اور للی کا شمع کی طرح روشن چہرا نظر آئے۔

اندھیرے کی کوکھ سے ایک کرن پھوٹی اور روشنی کا ایک دائرہ ایک نقارے پر پڑا۔ نقارے پر چوٹ پڑی، ایک، دو، تین، چار دھماکوں سے ایک لے پیدا ہوئی۔

لے اٹھائی کولی مچھیروں کے ڈھولکوں نے۔ وہ بمبئی کے سب سے پرانے باشندے تھے۔ ان کی لے میں سمندر کا شور تھا۔ اور لہروں پر ڈولتی ہوئی کشتیوں میں چپو چلاتے ہوئے مچھیروں کا 'ہیا، ہو!' تھا۔ جو ساری دنیا کے ناؤ کھینے والے مانجھیوں کی ایک ہی لے ہے۔ چاہے وہ مہاراشٹر کے کولی ہوں، بنگال کے بھٹیالی والے مانجھی ہوں، افریقہ کے یا امریکہ کے نیگرو ہوں یا جنوبی امریکہ مسی سپی اور امیزون دریاؤں میں ناؤ کھینے والے ہوں۔

اور اب ایک نئی لے سنائی دی۔ جو نئی بھی تھی اور پرانی بھی۔ لے وہی تھی، صرف ٹھیکہ نیا تھا۔ ساز جدا تھے۔ ہندوستانی ڈھولک کی بجائے یہ لے 'بونگو' اور 'کونگا' نام کے جنوبی امریکن ڈھولوں پر بجائی جا رہی تھی۔ لے تیز ہوتی گئی۔

مردنگ' ڈرم' ڈھولک' کونگا' طبلہ' بونگو' باری باری سے لے ان مختلف سازوں پر بجتی رہی۔ ایسا لگتا تھا' ان سازوں میں زبردست مقابلہ ہو رہا ہے۔ اور پھر لے ایک لفظ بن گئی۔ ایک لفظ

کے دوروپ بن گئے:

بمبئی بمبئی۔ بمبئی۔ بمبئی
بمبئی بمبئی۔ بمبئی۔ بمبئی

ان ہم معنی لفظوں کی تکرار — ایسی ہی جوشیلی، ایسی بیکار اور لایعنی جیسے زبان کے مسئلے پر ملک میں ہنگامے۔ جیسے ہزاروں لوگ لَے میں نعرے لگا رہے ہوں۔

ہندی/ہندی/ہندی/ہندی
تامل/تامل/تامل/تامل
اردو/اردو/اردو/اردو
بنگالی/بنگالی/بنگالی/بنگالی
مراٹھی/مراٹھی/مراٹھی/مراٹھی

اور پھر یکلخت لَے بند ہوگئی۔ لفظوں کی تکرار بند ہوگئی اور ایک تان ہوا میں بلند ہوئی۔ بمبئی کی اونچی اونچی عمارتوں کا پس منظر بڑھتی ہوئی روشنی میں ابھر آیا اور بمبئی کی رنگینیوں کی دلفریب نشانی بھورے بالوں، گلابی ہونٹوں، سڈول جسم اور نشیلی آنکھوں والی للّی ناچتی ہوئی اسٹیج پر آ گئی۔

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ سب سے زیادہ زور شور سے تالیاں جانی نے بجائیں۔

للّی نے گانا شروع کیا۔ گانے کا مکھڑا تھا۔ 'بمبئی رات کی بانہوں میں'۔ جس بمبئی کا وہ گیت گا رہی تھی وہ اس ہوٹل میں آنے والوں کی بمبئی تھی۔ کاروں میں گھومنے والوں کی بمبئی تھی۔ جگمگاتی ہوئی میرین ڈرائیو کی بمبئی تھی۔

مگر گانے کے بیچ بیچ میں جو ٹیبلے پیش کیے گئے تھے، وہ دوسری بمبئی کی یاد دلاتے تھے۔ کولی مچھیروں کی بمبئی۔ فٹ پاتھ پر سونے والوں کی بمبئی لیکن ہر بار حقیقت کی ایک جھلک کے بعد للّی ایک نئے لباس میں، نئے سنگھار میں ناچتی ہوئی، گاتی ہوئی، آتی تھی اور لوگوں کو دعوت دیتی تھی، ساری حقیقتوں کو، ساری تکلیفوں کو بھلانے کی۔

'بمبئی رات کی بانہوں میں
کہے نگاہوں نگاہوں میں'

کیوں کھویا ہے تو آہوں میں
آجا پیار کی راہوں میں'

للی صرف زبان سے نہیں، بلکہ اپنے کسے ہوئے، گھٹے ہوئے جسم کے ہر دلفریب اور دلکش عضو سے گاتی تھی۔ گورے گورے ہاتھوں کے اشاروں سے آنکھوں کی جنبش سے سینے کے اتار چڑھاؤ سے کولہوں کے مٹکاؤ سے۔

''کھا پی اور مزے اڑا۔ کیوں سب کی فکروں میں گھلتا ہے
گا، جھوم مستیاں لٹا' کیوں غم کے شعلوں میں جلتا ہے۔
کل کی چنتا کیوں کرتا ہے۔ تو کیوں ڈرتا ہے۔ ناحق مرتا ہے......''

یہ گانا نہیں تھا۔ ایک اشارہ تھا، ایک دعوت تھی، ایک وعدہ تھا۔

اور جس ادا سے وہ اسے گاتی تھی۔ سننے والوں اور دیکھنے والوں میں سے ہر ایک کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ گانا اسی کو مخاطب کر کے گایا جارہا ہے۔ کامیاب کیبرے آرٹسٹ کا یہی کمال ہے مگر جانی کو تو سچ مچ یقین تھا کہ یہ گانا جس کا فلسفہ خود اس کا فلسفۂ زندگی تھا— ''کھاؤ پیو۔ مزے اڑاؤ کسی دوسرے کی پرواہ نہ کرو۔'' اس کے لیے، صرف اس کے لیے گایا جارہا تھا۔

مگر خود غرضی اور عیاشی کا یہ ترانہ کبھی کبھی تو امر کو ایسا لگتا تھا جیسے اس کے مسئلے کا حل پیش کر رہا ہے۔

اس کو للکار رہا ہے، اس کو پکار رہا ہے......
بھول جگ کے اندھیاروں کو' اپنے دیپ جلا
آگے بڑھتا جا......''

اور خصوصاً جب للی نے عین اس کی طرف دیکھ کر گایا۔

رات مسکراتی ہے، جینے کا راز بتاتی ہے
جب چاہے تو تھوڑا جھک جا دام ملیں تو تو بھی بک جا

تو امر چوکنا ہو کر اٹھ بیٹھا۔ للی کو کیسے معلوم ہوا کہ میرے سامنے بکنے یا نہ بکنے کا مسئلہ پیش ہے؟

ڈانس ختم ہو رہا تھا۔ للّی اب ایک ہسپانوی لباس میں ٹیپ ڈانسنگ کر رہی تھی۔ اس وقت جانی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک دم آرکسٹرا میں گٹار بجانے والے کا گٹار چھین کر اسٹیج پر پہنچ گیا اور گٹار کی ایک جھنکار کے ساتھ للّی کو اس کی نئے پر ڈانس کرنے کے لیے چیلنج کیا۔

للّی کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس کو ڈانسر کی حیثیت سے للکارا گیا تھا۔ اس نے گٹار کی لے پر ٹیپ ڈانس شروع کر دیا۔

جانی نے للّی کو تنگ کرنے کے لیے گٹار کی لے اور تیز کر دی۔

للّی نے بھی ٹیپ ڈانسنگ کی لے کو تیز کر کے اس کا جواب دیا۔

جانی نے لے کو اور تیز کر دیا۔

للّی نے اس کا بھی جواب دیا۔

اور پھر گٹار اور ٹیپ ڈانسنگ کی لے بڑھتی گئی، تیز ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جانی کے گٹار کا تار ٹوٹ گیا اور اسی وقت للّی کے اونچی ایڑی کے جوتے کی ایڑی نکل گئی۔

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ بھی کیبرے کا ہی ایک دلچسپ حصہ تھا۔

روشنیاں پھر ابھر آئیں۔

واپس جاتے ہوئے ایک بار پھر جانی امر کی ٹیبل کے قریب سے گزرا۔ ''ویل مسٹر امر کمار! آپ کو میرا گٹار سولو کیسے لگا؟'' اس نے پوچھا— اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر— ''میں نے بڑی تیز لے بجائی نا؟''

''خطرناک حد تک تیز—'' امر نے جواب دیا۔ مگر طنز کا تیر جانی کی بے حسی پر کہاں اثر کرتا تھا۔ سو امر کمار نے کہا— تیز رفتار لے تھی تب ہی تو تمھارا تار ٹوٹ گیا۔؟''

''تو کیا ہوا؟ جانی نے اپنا فلسفہ بتاتے ہوئے کہا۔'' تار تو ٹوٹنا ہی ہے ایک دن۔ مگر مزا کتنا آیا؟''

اور یہ کہہ کر وہ چلتا بنا۔ سیٹی بجاتا ہوا، موٹر کی چابیوں کو اچھالتا ہوا۔'' آشا نے کہا— ''مجھے پسند نہیں آیا آپ کا یہ دوست۔ یا تو پاگل ہے یا مجرم—''

''اور امر نے کچھ سوچ کر کہا'' میرے خیال میں وہ پاگل بھی ہے— اور مجرم بھی!''

○

میں کون ہوں؟

ایک لڑکی — ایک خوب صورت لڑکی۔ مختلف تصویروں کے فریموں سے جھانک کر اپنی ہم شکل لڑکی کو گھور رہی تھی۔ جو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے اپنے چہرے کے میک اپ کو اُتار رہی تھی۔ یہ دونوں لڑکیاں ایک تھیں — مگر کتنی مختلف۔

تصویروں میں وہ کیمرے آرٹسٹ تھی، اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھی۔ کسی میں سوئٹر اور سلیکس پہنے اپنے سینے کا اُبھار دکھا رہی تھی، کہیں صرف چولی اور پیٹی کوٹ پہنے تھی۔ کہیں کسی ڈانس کا پوز تھا۔ ہر تصویر میں وہ نہ صرف حسین نظر آتی تھی بلکہ اس کا حسن لوگوں کے خیالات کو پریشان اور ان کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والا تھا۔ دنیا اسے للّی کے نام سے جانتی تھی۔

جو لڑکی آئینے کے سامنے بیٹھی تھی، وہ وہی تھی جو تصویروں میں تھی۔ اس کے ملائم بھورے بال وہی تھے، خوب صورت آنکھیں وہی تھیں، لمبے ڈریسنگ ٹیبل میں اس کا سڈول جسم وہی تھا۔ لیکن پھر بھی وہ تصویروں والی لڑکی سے بالکل مختلف تھی، جیسے وہ دونوں جڑواں بہنیں ہوں، جن کی صورت ایک ہو مگر جن کا مزاج، جن کا کیریکٹر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو۔ جو صورت آئینے میں سے جھانک رہی تھی، وہ اپنے بھورے بالوں کے ہیئر اسٹائل کے باجود بڑی بھولی تھی اور اس کی آنکھوں میں بڑی معصومیت تھی اور اس وقت ان آنکھوں میں غصہ بھی تھا کیونکہ کوئی باہر

کھڑا ایک انگریزی گانا گا رہا تھا۔ شاید اسے ہی چڑانے کے لیے۔

''آیا—!'' جو چلائی وہ تصویروں والی للّی تھی۔ جو میم صاحب کی طرح بولتی تھی۔

''جی میم صاحب!'' آیا دوڑ کر آئی۔

''یہ کون گاتا ہے؟''

''وہی جانی میم صاحب! میں نے بہت روکا مگر وہ مانتا ہی نہیں' میم صاحب چڑ کر بولی— ''اوہ! اس لوفر سے میری جان چھڑواؤ۔ اور سنو! مہاراج کمار صاحب کو بولو۔ ہم راج محل ہوٹل جانے کو تیار ہوتے ہیں۔''

''اچھا میم صاحب!'' کہہ کر آیا جو موٹی' تازی اور کالی تھی باہر کی طرف چلی۔ مگر سامنے کے دروازے سے کیا دیکھتی ہے کہ جانی گاتا ہوا جھومتا جھامتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے ضرورت سے زیادہ پی رکھی تھی۔

جانی دور ہی سے بولا— '' مہاراج کمار کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ آج تمھیں کار میں لفٹ نہیں دے سکیں گے کیونکہ وہ کار اب ان کی نہیں میری ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کار کی چابیاں نکال کر للّی کو دکھائیں اور پھر آیا کی طرف دیکھ کر جو اسے دھکّے دے کر باہر نکالنے والی تھی' جانی نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا۔ اور اس کو آیا کی آنکھوں کے سامنے نچایا اور پھر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا— ''یہ لو تمھاری چھٹی۔''

آیا خوشی سے مسکرائی، جھک کے سلام کیا— ''سلام صاحب!'' اور پھر للّی کو سلام کیا— سلام میم صاحب!'' اور پھر وہ ناچتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اور اس کی میم صاحب چلاّتی ہی رہی— ''آیا۔ آیا۔''

اب للّی نے اس بن بلائے مہمان بلکہ بلائے جان کو غور سے دیکھا— چھوٹا قد۔ بینڈ بجانے والوں جیسے کپڑے۔ نوکیلے جوتے، لمبی لمبی قلمیں، جیسے اٹالین گینگسٹرس کی ہوتی ہیں مگر صورت بری نہیں تھی۔ پیے ہوئے تھا، مگر لڑکھڑا نہیں رہا تھا— ''اب اس کو کیسے یہاں سے نکالوں؟'' للّی نے سوچا— اگر کسی کو بلاتی ہوں تو ہوٹل میں اسکینڈل ہوگا۔''

اس کی نظر جانی کے کالے ہیٹ پر پڑی۔ جو اب تک اس کے سر پر رکھا تھا— ''ایک لیڈی سے ملنے آئے ہو تو ہیٹ تو اتار دو!'' اور وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

جانی نے چاروں طرف دیکھا، جیسے کسی لیڈی کو تلاش کر رہا ہو — ''لیڈی! کہاں ہے لیڈی؟'' اور پھر دیوار پر کیبرے ڈانسر کی تصویروں کی طرف اشارہ کر کے 'اسے تم لیڈی کہتی ہو!''

للّی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ابھی تک وہ میم صاحب ہی بنی ہوئی تھی'' HOW DARE YOU INSULT ME LIKE THAT? ''تم کو کیا مانگتا؟''

اگر وہ میم صاحب تھی، تو جانی بھی کسی صاحب سے کم نہیں تھا۔ کم سے کم صاحب لوگوں کی طرح بول سکتا تھا۔'' کچھ نہیں مانگتا، تمھیں اپنی موٹر میں تمھارے گھر کو لے جانے کو مانگتا۔''

''میں گھر نہیں جا رہی ہوں۔'' للّی بولی — مگر اس کے غصہ کا انداز کچھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ''فیشن شو کے لیے راج محل ہوٹل جا رہی ہوں۔''

''او۔کے! میں تم کو وہاں بھی لے جاؤں گا۔ اسی موٹر میں جس سے تم روز گھر جاتی تھیں۔''

''مہاراج کمار کی موٹر تمھارے پاس کیسے آئی؟'' للّی کو شبہ تھا کہ اگر موٹر واقعی ہے اس کے پاس، تو اس نے کہیں سے چرائی ہے۔ ''ضرور کچھ گول مال ہے—

''مال تو گول ہوتا ہی ہے للّی! تب ہی تو پیسے کی مانک چکر کھاتا رہتا ہے۔ کل اس کی پاکٹ میں۔ آج میری پاکٹ میں۔ پر موٹر میں نے مہاراج کمار کو کیش روپیہ دے کر خریدی ہے۔'' پھر اس نے للّی کی آنکھوں میں یقین کی کمی دیکھی — ''یقین نہیں آتا تو یہ دیکھو۔''

اور یہ کہہ کر اس نے ایک ہزار کا نوٹ جیب سے نکالا اور اسے فرش پر گرا دیا۔ للّی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا مگر وہ ایک لفظ بھی بولی نہیں۔

''اٹھاؤ۔ اٹھاؤ!'' جانی نے کہا— ''للّی اسے لے لو۔ یہ نوٹ تمہارا ہے—!''

''اب للّی جھکی۔ دو زانو ہو کر نوٹ کو اٹھایا۔ جانی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ مگر للّی کی نگاہوں میں غصہ ہی غصہ تھا۔ نفرت ہی نفرت۔

وہ آہستہ آہستہ نیچے سے اٹھی۔ اب وہ جانی کے عین سامنے تھی۔ اس نے اس نوٹ کو ایسے اوپر اٹھایا جیسے کسی گندی اور ناپاک چیز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے پھر سڑاپ سے اسے جانی کے منہ پر مار کر پھینک دیا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ ایک سے دو ہو گئیں۔ اب وہ کسی سے

نہیں ڈرتی۔ ''تم للّی کو نہیں خرید سکتے ۔۔'' اس نے ایک ایک لفظ کو زور دے کر ادا کیا۔۔ '' میں بکاؤ نہیں ہوں۔''

جانی جس کا نشہ کافی حد تک ہرن ہو چکا تھا اور جو اپنے گال کو سہلا رہا تھا، حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو آئینے میں اسے غصہ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''تم نے مجھے غلط سمجھا للّی! میں تمھیں خریدنا نہیں چاہتا، میں تو تم سے LOVE کرتا ہوں۔''

آئینے میں سے لڑکی نے جواب دیا۔'' LOVE کی بات مت کرو۔ جانی! تم نے تو مجھے دیکھا نہیں۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔''

اب ایک ہلکی سی' کڑوی سی مسکراہٹ جانی کے ہونٹوں پر ابھری۔۔ '' للّی میں تو یہ بھی نہیں جانتا میں خود کون ہوں۔'' اس کو تو اپنے باپ کا' اپنی ماں کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ آج کی رات تو انکل نے اسے یتیم اور بے سہارا ہی نہیں بے نام کر دیا تھا مگر یہ وقت وہ سب سوچنے کا نہیں تھا۔ اس وقت للّی اس کے قریب تھی کب سے اس کی یہ آرزو تھی کہ للّی کو پاس سے دیکھے' اس سے اپنے دل کی حالت کہے۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر معلوم نہیں، ایسا کوئی موقع آئے، یا نہ آئے سو جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ جانی نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا۔ YOU ARE MY DREAM GIRL جسے میں روز سپنوں میں دیکھتا ہوں۔ للّی کے پھول کے مانند گوری SOFT SILK جیسے سنہرے بال۔ دار وپے کی آنکھیں۔''

للّی نے آئینے میں جانی کو دیکھ کر کہا اور ایک نئے انداز میں۔ اب وہ میم صاحب کی طرح نہیں ایک سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ تم میرے سنہری بالوں سے پریم کرتے ہو نا تو یہ لو'' اور یہ کہہ کر اس نے بھورے بالوں کی وگ اتار دی۔ اور نیچے سے لہراتے ہوئے کالے بال نکل آئے۔

''پانچ سو روپے میں یہ وگ ملتی ہے۔''

جانی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ حیرت سے للّی کو چولا بدلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور اب للّی اپنی آنکھوں سے نقلی پلکیں اتار رہی تھی اور یہ رہیں میری نشیلی آنکھیں۔''

جانی اب بھی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

للّی نے اب منہ پھیر کر جانی کی طرف دیکھا اور وہ سب کہہ ڈالا جو آج تک اس کی زندگی کا

سب سے بڑا راز تھا۔ ''دیکھا تم نے جس للّی سے تم پیار کرتے ہو' وہ اس ہوٹل کی ملکیت ہے۔ جو شام کو پیدا ہوتی ہے اور رات کو مر جاتی ہے۔ جو یہاں سے ہر رات کو واپس جاتی ہے، وہ للّی نہیں، ایک سیدھی سادھی لیلا ہے، جو اپنے ماں باپ اور بھائی بہن کا پیٹ بھرنے کے لیے روز رات کو للّی بن جاتی ہے۔''

جانی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ لڑکی بھی پسند تھی۔ وہ للّی تو آسمان میں اڑنے والی پری تھی جس کو دور ہی دور سے دیکھ کر وہ سپنے دیکھا کرتا تھا۔ مگر یہ لیلا تو زمین پر چلنے والی ایک لڑکی تھی حسین اور خوب صورت۔ جس سے جانی جیسا آدمی سچ مچ محبت کر سکتا تھا۔ سو جب للّی نے پوچھا۔ ''کہو اب بھی تم مجھے کار میں لے جانا چاہتے ہو تو جانی کو ہنسی آ گئی۔ ''ہاں 'للّی' یا لیلا یا لیلیٰ یا جو بھی تمھارا نام ہے۔ اب ایک دم جلدی سے تیار ہو جاؤ اور چلو۔''

اور اس پر للّی بھی ہنس پڑی اور اس کو ہنستا دیکھ کر جانی اور بھی زیادہ ہنس پڑا۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر امر کھڑا فون پر اپنے ایڈیٹر صاحب سے بات کر رہا تھا انھیں معلوم تھا کہ ہوٹل جل ترنگ سے دعوت نامہ آیا ہے اور فون کرتے کرتے انھوں نے اسے یہاں ڈھونڈھ نکالا تھا۔

امر کی آواز سنتے ہی وہ بولے۔ ''ارے بھئی تم کہاں ہو؟''

امر تو آج بہت خوش تھا۔ آشا جو ساتھ تھی۔ ''پوچھیے نہیں، بمبئی رات کی بانہوں میں ہے اور میں بمبئی کی بانہوں میں ہوں۔''

''یہ وقت مذاق کا نہیں ہے امر!'' آزاد صاحب کی آواز نہ صرف سنجیدگی لیے تھی، بلکہ پریشانی بھی۔ ''پولیس تمھیں تلاش کر رہی ہے۔ وہ تمھارے گھر بھی گئے تھے۔ تم وہاں سے کیوں بھاگے؟''

''مجھے وہاں سے کسی کو بھگا کر لانا تھا اس لیے مجھے بھاگنا پڑا!!''

امر کو اب بھی پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس نے دو چار مہینے کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ اس جرم کے لیے پولیس اس کو پھانسی تھوڑا ہی دے سکتی ہے؟

آزاد صاحب دوسری طرف سے بولے— ''وہ میں نہیں جانتا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ وہ بے چارا بڈھا، جو پلین میں تمھارے برابر بیٹھا تھا اس کی جیب میں کئی لاکھ کے نوٹ تھے جو وہ کسی بینک سے چرا کر بھاگا تھا۔ وہ سارا روپیہ غائب ہے''

اب امر کو سنجیدگی سے بات کرنی پڑی۔ ''تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ روپیہ میں نے چرایا ہے؟''

''نہیں بھئی میں ایسا نہیں سمجھتا مگر پولیس والے شبہ کر رہے ہیں۔ کیا تم جانتے ہو، یہ خون کون کر سکتا تھا؟''

''جانتا ہوں— '' امر نے فون کو بند کرتے ہوئے کہا— اور پھر ہوٹل کے اسسٹنٹ مینیجر سے پوچھا— ''مس للی کا ڈریسنگ روم بتا سکتے ہیں، ان سے ملنے میرا ایک فرینڈ گیا ہوا ہے۔''

اس نے جواب دیا: ''مس للی ابھی ابھی ایک سفید کار میں بیٹھ کر گئی ہیں۔ شاید آپ کے دوست کے ساتھ ہی۔''

اسی وقت ایک بیرے نے ایک ہزار روپے کا ایک نوٹ لا کر اسسٹنٹ مینیجر کو دیا۔ اسسٹنٹ مینیجر نے روشنی میں اس کا نمبر پڑھا۔ پھر مینیجر کے پاس لے گیا۔

پولیس انسپکٹر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''کون— ؟ مینیجر ہوٹل جل ترنگ؟''

دوسری طرف مینیجر، ہزار روپے کا نوٹ ہاتھ میں لے کر فون کر رہا تھا— انسپکٹر صاحب، ایک ہزار روپے کا نوٹ آیا ہے نمبر y22780 ہے۔ انسپکٹر کے سامنے چوری کے نوٹوں کے نمبروں کی پوری لسٹ موجود تھی۔ اس کو اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے اس نے کہا— ''ہاں یہ نوٹ چوری کا ہے۔ مگر چلایا کس نے؟''

مینیجر نے اب ایک پرچے پر نام پڑھتے ہوئے کہا— ''ایک نوجوان نے شراب کا بل PAY کیا ہے۔ پرمٹ پر نام لکھا ہے۔ جانی!''

جانی نام سن کر انسپکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا لگتا تھا یہ نام اس نے پہلے کہیں سنا ہے۔ پولیس افسروں کے دماغ میں تو مجرموں کے ناموں اور چہروں کا پورا رکارڈ ہوتا ہے— جانی، جانی!

دفعتاً انسپکٹر کو کچھ یاد آیا اور وہ لپک کر دیوار پر لگے ہوئے اس بورڈ کے پاس گیا۔ جہاں

بہت سے مجرموں کے فوٹو لگے ہوئے تھے۔ بیچ میں ایک نوجوان مجرم کے دو پولیس فوٹو تھے ایک سامنے سے، ایک سائڈ پوز جس میں لمبی قلمیں نظر آرہی تھیں۔ فوٹو کے نیچے نام لکھا تھا — جوزف یا جانی!''

وہ جو کبھی اپنا نام جوزف بتاتا تھا مگر جس کا نام جانی تھا یا شاید جانی بھی نہیں تھا۔ اس وقت ساتویں آسمان پر تھا۔

سواری کے لیے بڑھیا، طاقتور ریسنگ موٹر ہو، بغل میں دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو، اور جیبوں میں لاکھوں کے نوٹ بھرے ہوئے ہوں اور دنیا میں چاہیے بھی کیا؟

جانی موٹر کو خواہ مخواہ دوڑا رہا تھا۔ چالیس میل فی گھنٹہ۔ پچاس میل۔ ساٹھ میل صرف اس لیے کہ للی کے چہرے پر ہوا سے اڑتے ہوئے بال اس کو اچھے لگتے تھے۔ اس کو للی کا ڈرنا بھی اچھا لگتا تھا۔ جب وہ اس کو پکڑ کر کہتی تھی — ''جانی' پلیز! اتنا تیز نہیں۔''

سواری کے لیے بڑھیا طاقتور ریسنگ موٹر ہو — بغل میں دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو، جیبوں میں لاکھوں کے نوٹ بھرے ہوئے ہوں۔ اور دنیا میں چاہیے کیا؟

اور دنیا میں چاہیے بھی کیا؟

ایک گھر چاہیے۔ اور آج وہ بے گھر تھا، بے ٹھکانہ!

ایک گھر والی چاہیے۔ کیا یہ خوب صورت لڑکی جو اس کے برابر بیٹھی تھی، اس کی گھر والی بننے کے لیے راضی ہو جائے گی۔

اولاد چاہیے۔ فیملی پلاننگ کے پوسٹر تو اعلان کرتے تھے کہ ''دو، یا تین بچے بس!'' مگر جانی کا تو جی چاہتا تھا کہ ایک دو نہیں، پورے ایک درجن بچے ہوں۔ کام چاہیے۔ کوئی اچھا، دلچسپ کام۔ جو کرتے کرتے انسان تھکے نہیں، بور نہیں ہو۔ ایسا کوئی کام جسے انسان محبت سے کرے۔ شراب کی بوتلیں ادھر سے ادھر پہنچانے کا کام نہ ہو، دلّی سے ہوائی جہاز میں بوتلیں لانے کا کام نہ ہو، پٹرول پمپ پر پٹرول بھرنے، ہوا بھرنے، موٹریں دھونے، موٹروں کی صفائی کرنے کا کام نہ ہو۔

''ارے وہی پٹرول پمپ تو ہے یہ؟''

دفعتاً کار کو بریک لگا اور کار پٹرول پمپ کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی۔ ایک نوجوان

بھاگا ہوا آیا اور جانی کو پہچان کر بے تکلفی سے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"ارے سالا جانی! آج کل کیا مہاراج کمار نے تجھے ڈرائیور رکھ لیا ہے۔؟"

جانی نے کندھے پر سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے جواب دیا— "یہ گاڑی مہاراج کمار کی نہیں ہے، میری ہے۔ سو جانی خلاص، مسٹر جانی بولنا مانگتا۔"

پٹرول بھرنے والے نوجوان نے سوچا۔ لڑکی ساتھ ہے شاید۔ اسی لیے اس پر رعب جما رہا ہے— "یس مسٹر جانی! کیا حکم ہے صاحب؟"

"FILL HER UP" پھر وہی ہالی ووڈ کے فلموں کے غنڈوں کی سی گفتگو!

"اکھا ٹینک بھر دو۔ آج بہت ڈرائیونگ کرنی ہے، بہت دور جانا ہے۔" اور جس طرح سے اس نے 'دور' کہا' شاید اس کا مطلب سڑک کے لمبے فاصلے سے نہیں تھا۔ وہ زندگی میں 'دور' تک جانا چاہتا تھا— خوشی اور اطمینان کی تلاش میں جتنا دور بھی جانا پڑے۔

"بہت دور جانا ہے—" اس نے عجیب انداز میں دوہرایا۔ اور پھر للّی کو طرف دیکھ کر— "کیوں للّی! ٹھیک ہے نا؟"

للّی جو اس بات کا مطلب ہی نہیں سمجھی تھی مگر جس کو اندازہ تھا کہ جانی کوئی خطرناک بات سوچ رہا ہے۔ بولی— "مجھے تمھاری باتوں سے ڈر لگتا ہے۔" "ڈرنے کی کوئی بات نہیں ڈارلنگ!" اس نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا— "مجھے پرانا زمانہ یاد آ گیا تھا— بات یہ ہے للّی! کہ یہ پٹرول پمپ میری لائف میں بہت امپورٹینٹ ہے۔ میں نے تمھیں سب سے پہلے یہیں دیکھا تھا۔"

"تم پہلے ادھر کام کرتے تھے؟"

"میں چھوٹا چھوکرا تھا تو اسی پمپ کے آزو باز و ٹیکسی پکڑتا تھا۔ بڑا ہوا تو یہ گھنشیام ہے نا، اس کے مالک گاڑی میں پٹرول بھرا کرتا تھا اور سوچتا تھا، کسی دن میرے پاس بھی اپنی گاڑی ہوگی......"

میٹر کی گھنٹی جو ہر لیٹر کے بعد بجتی ہے، بجی تو جانی نے مڑ کر ادھر دیکھا مگر اتنی دیر میں میٹر بدل چکا تھا۔ وقت بدل چکا تھا۔ زمانہ بدل چکا تھا—

اب دن نکلا ہوا تھا اور وہی سفید موٹر اسی پٹرول پمپ کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ اب بھی لتی بھڑکدار ساڑی پہنے ہوئے موٹر میں بیٹھی تھی۔ مگر اب اس کے بال سنہری تھے، ڈرائیونگ سیٹ میں جانی کی جگہ راج کمار بیٹھا ہوا تھا۔

کار آکر رکی ہی تھی کہ دولڑکے پٹرول پمپ کی یونیفارم پہنے ہوئے بھاگ کر آئے اور دونوں نے ایک ساتھ ملٹری سیلوٹ مار کر کہا۔ ''لیس سر! کیا حکم ہے صاحب!'' ان میں سے ایک وہی گھنشیام تھا جس نے جانی سے بے تکلفی کا اظہار کیا تھا اور دوسرا۔ خود جانی تھا۔

مہاراج کمار نے آرڈر دیا۔ ''بیس لیٹر پٹرول''

''لیس سر'' جانی نے کہا اور پٹرول پمپ کا ہینڈل چلا کر پائپ کو کار کے پیچھے ٹنکی تک لے گیا۔ کیپ اتار کر پٹرول بھرنا شروع کیا۔ گھنشیام اس عرصہ میں کار پر کپڑا مار رہا تھا۔

جانی پٹرول بھر رہا تھا مگر اس کی نظریں کہیں اور تھیں۔ کبھی وہ اس کار کی سڈول چمکیلی سفید 'باڈی' کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا تھا، کبھی وہ کن انکھیوں سے اس لڑکی کی موہنی صورت کی طرف دیکھتا تھا، جو اس وقت موٹر کے آئینے میں اپنا چہرا دیکھ کر لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ کار اور لڑکی، لڑکی اور کار۔ دونوں اتنی خوب صورت تھیں کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جائے۔ دونوں پر جانی کا دل آگیا تھا— دونوں اس کی پہنچ سے دور تھیں...... یہ سب سوچتے ہوئے نہ جانے کب اس کا ہاتھ ہل گیا اور پٹرول کا پائپ ٹنکی کے منہ سے نکل گیا۔ جب گھنشیام کار کی صفائی کرتے ہوئے وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پٹرول ٹنکی کی بجائے زمین پر گر رہا ہے۔

''اے اے کیا کر رہا ہے؟'' وہ جانی کے ہاتھ سے پائپ چھینتے ہوئے بولا— ''لا یہ مجھے دے' تو صفائی کر۔''

جانی موٹر پر دھیرے دھیرے کپڑا پھیر کر صفائی کرتا رہا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک خوب صورت موٹر پر ہاتھ نہیں پھیر رہا ہے بلکہ ایک خوب صورت عورت کے بدن کو گدگدا رہا ہے، جب وہ موٹر کے سامنے پہنچا تو اب قریب سے اور غور سے اس سنہری بالوں والی حسینہ کو دیکھ سکتا تھا۔ کپڑا پھیرتے پھیرتے وہ اس کے اتنا قریب آگیا کہ وہ اس کے کپڑوں میں لگے سینٹ کی خوشبو سونگھ سکتا تھا۔ مگر اس 'حسنِ لاپرواہ' نے جانی کی طرف ایک نظر بھی نہ دیکھا' اس کے

نزدیک وہ بس ایک پٹرول پمپ والا آدمی تھا۔ جیسے اس نے اپنی زندگی میں سینکڑوں ایسے نوجوان دیکھے تھے جو اس کی طرف گھور کر لالچ بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔

اتنے میں مہاراج کمار نے پوچھا۔ ''کہاں چلیں راج محل ہوٹل یا ہوٹل جل ترنگ؟''

للی نے لپ اسٹک واپس رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اوہ نو ہوٹل جل ترنگ میں تو میں دن رات گزارتی ہوں۔ کہیں اور چلیے۔''

گھنشیام نے بل دیا۔ راج کمار نے روپے دیئے مگر جانی اس تمام عرصے میں موٹر پر کپڑا ہی مارتا رہا اور اس کی نظریں اس لڑکی پر ہی لگی رہیں۔ یہاں تک کہ راج کمار نے گاڑی چلا دی اور جانی کے پیروں تلے کی زمین تو نہیں کھسکی مگر ہاتھوں کے نیچے سے کار چلی گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ گھنشیام نے اس کو سہارا دے کر اٹھایا مگر اس کی نگاہیں دور ہوتی ہوئی کار پر اور کار میں بیٹھی ہوئی لڑکی پر لگی رہیں یہاں تک کہ کار۔۔ اور لڑکی۔۔ نظر سے اوجھل ہو گئی۔

''کیوں جانی ہو گیا نہ چیڑ فچو!'' گھنشیام نے اس کے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

جانی ابھی تک کھویا ہوا تھا۔ ''سنہری بال۔ بنارسی ساڑی بڑھیا سفید موٹر۔ یہ کوئی مہاراج کماری ہے کیا؟''

''ارے یہ کوئی مہاراج کماری نہیں ہے۔'' گھنشیام نے اسے بتایا۔ ''ہوٹل میں گاتی ناچتی ہے۔''

اور سو ایک دن للی ہوٹل جل ترنگ پر بینڈ کے ساتھ ایک انگریزی گانا گا رہی تھی اور نوجوان جوڑے ڈانس فلور پر ٹوئسٹ کر رہے تھے کہ جانی موٹر کلینرز کا مَیلا، گندا اُوورآل پہنے ہوئے داخل ہوا اور دروازے کے قریب ہی سے للی کو گاتے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ گھنشیام سچ کہتا تھا۔ یہ راجکماری نہیں سچ مچ گانے والی ناچنے والی کیبرے آرٹسٹ ہے، اس سے تو جان پہچان مشکل نہ ہونی چاہیے مگر اس سے جان پہچان کرنے کے لیے مہاراج کمار جیسی بڑھیا موٹر ہونی چاہیے۔۔ اگر ہو سکے تو مہاراج کمار کی ہی سفید موٹر ہونی چاہیے موٹر اور لڑکی۔ لڑکی اور موٹر دونوں کا ایک بڑا عجیب رشتہ تھا۔ جانی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک لمبے تڑنگے ویٹر نے آ کر اسے باہر کو جانے کو کہا اور جب

اس نے انکار کیا تو اس نے جانی کو بڑے پیار سے گود میں اٹھالیا اور بڑے پیار سے باہر پھینک دیا— اتنے زور سے کہ جانی کا سپنا ٹوٹ گیا۔ اور وہ ماضی کی یادوں سے لوٹ کر حقیقت میں واپس آ گیا۔

دراصل تو یہ حقیقت سپنا معلوم ہوتی تھی۔ آج سے دو مہینے پہلے یا دو دن پہلے کون جان سکتا تھا کہ ایک دن وہ سفید ریسنگ کار جانی کی ملکیت ہوگی اور خوب صورت للی جس کی ایک مسکراہٹ کے لیے راجے، مہاراجے اور بڑے بڑے بیوپاری ہزاروں روپے خرچ کرنے کو تیار تھے۔ اُس کار میں جانی کے بغل میں بیٹھی ہوگی۔

للی نے کہا— "جانی! تم اپنی ضد کے بڑے سچے ہو نا؟"

جانی نے جواب دیا "NEVER SAY DIE THT'S ME BABY" چرچ اسکول میں ماسٹر بھی یہی بولتا تھا IF AT FIRST YOU DONT SUCCEED TRY, TRY, AGAIN گھنشیام بل لے کر آیا— "ٹینک بھر دیا جانی صاحب! پورے پچاس لیٹر۔ سینتالیس روپے پچاس پیسے ہوئے۔"

"او۔کے —" جانی نے بڑی شان سے ایک سو رپے کا نوٹ نکالا۔ اور اپنے پرانے ساتھی کو دیا— "یہ لو—"

اور پھر اس نے اسٹارٹر دبا دیا۔ للی نے کہا— "سو رپے کا چینج نہیں لو گے؟"

جانی نے موٹر کو گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا— "آج کی رات میرے پاس چینج لینے کا ٹائم نہیں ہے۔"

اور پھر اس نے موٹر چلاتے ہی تیز کر دی اور گانا گاتا ہوا، شور مچاتا ہوا، ہاتھ ہلاتا ہوا، موٹر دوڑاتا ہوا۔ دور ہوتا گیا۔

موٹر چلنے کی آواز سن کر گھنشیام واپس بھاگا۔ سو روپے کا نوٹ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہاتھ اٹھا کر نوٹ کو ہوا میں لہرا کر وہ چلایا۔ "جانی!" جانی! اے جانی صاحب! تمھارا سو روپے کا نوٹ!"

مگر جانی کی جیبیں ایسے ایسے سینکڑوں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جانی اکتیس ہزار کی

سفید موٹر میں سوار تھا۔ سفید موٹر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی، دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی — اور اس کو کیا چاہیے۔؟

گھر چاہیے —!

گھر والی چاہیے —!

کام چاہیے —!

اور یہ خیال موٹر تیز دوڑاتے ہوئے بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا — نام چاہیے۔ مجھے ایک نام چاہیے۔ میں کون ہوں؟ میرا باپ کون تھا؟ میرا اصلی نام کیا ہے؟ جانی؟ یا جمناداس؟ یا جمشید جی؟ یا جمال الدین؟

○

سچ اور سپنا

چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے اور ائیر کنڈیشنڈ راج محل ہوٹل کے برآمدے میں سینکڑوں بے گھر بے ٹھکانہ لوگ پتھر کی سیج پر سو رہے تھے یا سونے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک لمبی چوڑی اُمپالا آکر رکی اور اس میں سے دو جوڑے اتر کر ہوٹل میں گئے مرد کالے سوٹ پہنے ہوئے تھے، عورتیں بھڑک دار بنارسی ساڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ فٹ پاتھ کے سونے والے نہ صرف ان سلک کی ساڑیوں کی سرسراہٹ محسوس کر سکتے تھے بلکہ ان کے جسموں سے آتی ہوئی سینٹ کی خوشبو سونگھ سکتے تھے۔ نیچے تہہ خانے میں ہوٹل کا کچن تھا اور اس کے روشن دان فٹ پاتھ کے اوپر ہی کھلتے تھے اور وہاں سے بھنے ہوئے مرغ اور دوسرے بڑھیا کھانوں کی خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ ان کو بھی سونگھ سکتے تھے، تب ہی تو اس برآمدے میں سونے کے لیے چار آنے نقد مقامی دادا کو دینے پڑتے تھے۔ گو اس کا بیان تھا کہ اس میں سے دو آنے تو گشت کرنے والا حولدار لے جاتا ہے۔

کچھ لوگ سو نہیں رہے تھے، ہوٹل میں آنے جانے والوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''ارے یار! آج تو ہوٹل میں بڑی رونق ہے؟''

''دوسرے نے کہا۔'' ارے یہ سب ڈنر کھائیں گے۔ ڈانس کریں گے اور یہ سب

تمھارے لیے کریں گے۔"

"ہمارے لیے؟"

"ہاں تمھارے جیسے بھوکے ننگوں کے لیے۔"

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ فٹ پاتھ کے رہنے والوں کو کم سے کم ہنسنے کی آزادی ہے۔

ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ایک پوسٹر لگا ہوا تھا، جس پر بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "بہار کے اکال کے مارے بھوکوں کی امداد کیجئے"

اس پوسٹر کے سامنے ہی بہار۔ (یا بمبئی یا بنگال کے یا مدراس یا ہندوستان کے اور کسی علاقہ) کے ایک بھوکے کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ اس بھوکے کے تن پر ایک بڑھیا نیلی ٹیرلین کا سوٹ تھا۔ سلک کا قمیض تھا۔ ٹائی میں ہیرے کا پن لگا ہوا تھا مگر تھا وہ بہت بھوکا۔ ایک مرغ کھا چکا تھا، دوسرے مرغ پر حملہ کر رہا تھا۔

لاؤڈ اسپیکر سے کسی عورت کی آواز آ رہی تھی، مگر بھوکا اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا 'ہمارا فرض ہے کہ ہم بھوکوں کو کھانا کھلائیں جن کے پاس تن ڈھانکنے کو کپڑا نہ ہو ان کو کپڑا دیں۔۔۔۔۔۔"

ایک لمبی عورت جس کے گلے میں ایک ہیروں کا نیکلس اور چربی کی تین تہیں چڑھی ہوئی تھیں، مائیکروفون کے سامنے کھڑی بول رہی تھی۔

اس لیے ہماری سماج سیوک سوسائٹی نے ڈانس، ڈنر اور فیشن شو آرگنائز کیا ہے تاکہ اکال کے مارے لوگوں کی مدد کی جا سکے۔"

اکال کے مارے انسان نظر کے سامنے تھے۔ کسی آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر میں سے ان ہزاروں کھائے پیئے، اچھے کپڑے پہنے خوشحال لوگوں کو جھانک رہے تھے، جو فیشن شو دیکھنے راج محل ہوٹل کے ہال میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان میں امر اور آشا بھی تھے۔ آشا جس کی آنکھیں جگمگاتے ہوئے ہوٹل کا نظارہ کر رہی تھیں۔

اوراب گھومتے ہوئے اسٹیج پر فیشن شو کی ماڈل لڑکیوں نے آنا شروع کیا۔کوئی نئے ڈیزائن کی بڑھیا ساڑی پہنے تھی۔کوئی فراک،کوئی ڈریس۔کوئی شلوار قمیض،کوئی چوڑی دار پاجامہ قمیض اوراوڑھنی تو کوئی سوئمنگ کاسٹیوم،ہرایک لڑکی اپنے آپ کی اور اپنے لباس کی نمائش ایک نئے انداز سے کرتی تھی۔حسن اور فیشن کا یہ کارواں اسٹیج پر گھومتا رہا،گزرتا رہااور اکال کے مارے لوگوں کی دھنسی ہوئی آنکھیں انہیں گھورتی رہیں مگران آنکھوں میں غصہ نہیں تھا،شکایت نہیں تھی، فریاد نہیں تھی،صرف حیرت تھی کہ یہ سب کیا ہورہا ہے؟ کیوں ہورہا ہے؟ کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔"ہمارا فرض ہے کہ ہم بھوکوں کو کھانا کھلائیں۔جن کے پاس تن ڈھکنے کو کپڑا نہیں انھیں کپڑا دیں اوران کے سوال کے جواب میں اناؤنسر نے مائیکروفون پرایک اعلان کیا کہ اب چند عورتیں..........آپ کے سامنے ہمارے دیش کی رنگا رنگ پوشاکیں پیش کریں گی اور یہ سب پوشاکیں بھی ڈالیریا ٹیکسٹائل ملس ہی کے کپڑوں سے تیار کی گئی ہیں۔"

ساراہال تالیوں سے گونج اٹھا،تالیاں بجانے والوں میں سب سے زیادہ جوش سے تالیاں بجارہا تھا جانی۔ مگر امر کی نگاہیں ابھی تک بھرے ہوئے ہال میں اس کو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔

اسٹیج پر روشنی ہوئی اور للی ایک راجستھانی لباس پہنے دکھائی دی۔ جانی کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔کتنی سوئٹ لگتی تھی اس کی للی اس لباس میں!

یہ لباس کی نمائش بھی تھی ۔ جسم کی نمائش بھی تھی ۔ڈانس بھی تھا۔ اور ساتھ میں لاؤڈاسپیکر پرگانا بھی آرہا تھا۔لباس کی تعریف میں جس نے لباس پہننے والی کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔

تالیاں بجیں،للی دوسرالباس تبدیل کرنے گئی۔اتنے میں والینٹیر لڑکیوں نے چندہ جمع کرنے کے لیے ڈبے گھمانے شروع کردیے۔ڈبہ جب جانی کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے جوش میں آکراس میں ایک ہزار کا نوٹ ڈال دیا۔

اب تاج محل کے پس منظر میں للی ایک مغلیہ لباس پہن کرآئی۔انارکلی کی نزاکت ممتاز محل کا شاہی وقار،نور جہاں کا حسن،سب ہی کچھ تو تھا اس میں!

تالیاں بجیں۔ لتی تیسرا لباس تبدیل کرنے گئی۔ اس عرصہ میں چندے کے ڈبے ہوٹل کے منیجر، اور لیڈی سوشل ورکر کے سامنے کھولے جا رہے تھے۔ میز پر روپے، اٹھنیاں، چونیاں، ایک ایک روپے کے نوٹ، پانچ روپے کے، دس روپے کے، سو روپے کے نوٹ بکھر گئے اور ان ہی میں توڑ موڑ کر ایک نوٹ ڈالا گیا تھا۔ جس کی تہوں کو کھولا گیا تو ایک ہزار روپے کا نوٹ دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔

اس بار اسٹیج پر روشنی ہوئی تو کنچی ورم کا مندر نظروں کے سامنے ابھرا اور لتی بھارت ناٹیم نرتیہ کی چست اور کسی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے آئی۔ بھارت ناٹیم نرتیہ کے انداز کے ساتھ ہی، وہی لوچ، وہی نزاکت، وہی ابھی نئے۔ وہی مدرا۔

تالیاں اور زور سے بجیں، لتی چوتھا لباس تبدیل کرنے گئی۔ اسی وقت ہوٹل کا منیجر جس کے ہاتھ میں وہ ہزار روپے کا نوٹ تھا۔ پولیس ہیڈ کوارٹرس سے بات کر رہا تھا۔ سب ہوٹلوں کو پولیس سے ہدایات آ گئی تھیں کہ کوئی آدمی چوری کے نوٹ چلا رہا ہے۔ شبہ ہو تو فوراً نوٹ کا نمبر پولیس کو رپورٹ کیا جائے۔

اسٹیج پر پھر روشنی ہوئی۔ اس بار ڈل جھیل اور شکارے کے پس منظر میں لتی کشمیری لباس پہنے ہوئے آئی۔ لمبا، کالا فرن، اس پر کشیدے کاری کا کام، کانوں میں بھاری بھاری بالیاں اور بالے۔ چلنے کا انداز ایسا تھا کہ لگتا تھا کہ 'ایک پھول ہے کمل کا' جو جھیل کی سطح پر تیرتا ہوا آ رہا ہے۔

تالیاں بجیں تو اناؤنسر پردے کے سامنے آیا۔ اس نے کہا۔ '' میں آپ کو ایک خوش خبری سناتا ہوں۔ اس ہال میں ایک دل والا بیٹھا ہے، یا ایک دل والی بیٹھی ہے جس نے ایک دو روپیہ نہیں، پورے ایک ہزار روپے کا نوٹ ہمارے کلکشن باکس میں ڈالا ہے۔''

اس اعلان کا خیر مقدم پُر جوش تالیوں سے کیا گیا مگر لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اعلان پولیس کے کہنے سے کیا گیا ہے، جو اس طرح اس آدمی کا پتہ چلانا چاہتی ہے، جس نے یہ چوری کا نوٹ چندے میں ڈالا ہے۔

ہوٹل کے باہر پولیس کی جیپ آ کر رکی اور اس میں سے ایک انسپکٹر اور چار کانسٹیبل اتر کر بھاگتے ہوئے اندر گئے

'لگتا ہے پولیس کسی چور کو پکڑنے جارہی ہے۔' ایک فٹ پاتھ والے نے کہا۔

'چوراور راج محل ہوٹل میں؟' دوسرے نے اعتراض کیا۔'' یہاں تو شہر کے بڑے بڑے اور امیر لوگ آتے ہیں!'

'ارے یہی تو جگہ ہے دنیا جہان کے چور پکڑنے کی!'

ایک چور تو بڑا خوش تھا۔ اس کی تعریف میں اسٹیج سے اعلان ہورہے تھے اور لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ اناؤنسر کہہ رہا تھا۔'' اب میں اُن سے درخواست کروں گا کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں تاکہ ہم سب لوگ ان کے درشن کرسکیں۔''

پھر تالیاں — اب تو جانی کو اٹھنا ہی پڑا۔ اٹھا ہی تھا کہ امر اور آشا نے اسے دیکھ لیا اور اسی وقت جانی نے دیکھا کہ پولیس انسپکٹر اور اس کے سپاہی ایک طرف سے چلے آرہے ہیں۔ جانی اسٹیج پر جانے کی بجائے ڈریسنگ روم کی طرف لپکا۔ للّی نے کپڑے بدل کر ساڑی پہن لی تھی اور بال بنا رہی تھی کہ جانی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر بھاگا۔ ہوٹل کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر بھاگتے ہوئے جانی اور للّی اترے اور ان کے پیچھے پیچھے ہی امر اور آشا! ایک سیڑھی پر آشا کا پیر پھسلا، اور وہ گرتے گرتے بچی مگر اتنی دیر میں جانی اور للّی دروازے کے باہر پہنچ گئے تھے۔

پھر بھی جانی کے موٹر میں بیٹھنے تک امر بھاگ کر اس کو پکڑ سکتا تھا مگر عین اسی وقت فٹ پاتھ پر رہنے والوں میں سے ایک شرابی نے اس کو پکڑ لیا۔ اتنے میں جانی نے موٹر اسٹارٹ کی اور للّی کو ساتھ لے کر پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ گیا۔

شرابی کے منہ سے ٹھرّے کا بھپکا آرہا تھا۔ آشا اس سے گھبرا کر پیچھے کو ہٹ گئی۔

''کہاں جارہے ہو ہمیں چھوڑ کر؟'' شرابی مزدور نے امر کو کوٹ کے کالر سے پکڑ کر کہا۔

''تم کون ہو؟'' امر نے کالر چھڑاتے ہوئے کہا۔

''میں تمھارا بھائی، تمھارا دوست۔'' شرابی، شرابیوں جیسی باتیں کررہا تھا۔ مگر سب بے معنی نہیں تھیں— ''راج محل ہوٹل میں سے عیش کرکے آرہے ہو، کیوں پہچانو گے ہمیں؟''

''ارے بھائی میں تو رپورٹر ہوں۔ ہر جگہ جانا پڑتا ہے۔'' امر نے اسے سمجھایا۔'' اور پھر میں تو تم لوگوں کے ساتھ ہوں۔''

''اگر ہمارے ساتھ ہو تو ہمارا ساتھ دو۔''

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی فٹ پاتھ سے اٹھ کر آیا اور شرابی کو ایک طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ''ارے کیوں ان کو پریشان کر رہا ہے؟ یہ تو آزاد قلم والے امر کمار جی ہیں۔'' امر کو اور اس سے زیادہ آشا کو حیرانی ہوئی کہ فٹ پاتھ پر رہنے والے بھی اس کو پہچانتے ہیں۔ پھر ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے اس نے امر سے کہا۔ ''امر بھیا تم سیٹھ ڈالیریا کا خوب بھانڈا پھوڑ رہے ہو۔ ان سب کالے چوروں کو پکڑ وا اور ایک کو نہ چھوڑ د۔''

''میں پوری کوشش کروں گا۔'' امر نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا کیونکہ بحث اب خطرناک صورت اختیار کر رہی تھی۔ بھلا وہ کیسے وعدہ کر سکتا ہے کالے چوروں کو پکڑوانے کا چند گھنٹے بعد شاید وہ ان ہی کالے چوروں میں سے ایک کا ملازم ہو جائے گا۔'' ان حضرت کی مہربانی سے ایک چور تو بھاگ گیا جس نے شاید خون بھی کیا تھا۔ اچھا چلو آشا!''

آشا اور امر سڑک کے کنارے چلے جا رہے تھے اور ہر آنے والی ٹیکسی کو آواز دے رہے تھے مگر ٹیکسی بھری ہوئی نکلتی تھی۔ آشا نے امر کی نقل کرتے ہوئے اس کو پرانی یاد دلائی۔ ''اگر ہماری جیب میں ٹیکسی کے لیے پیسے نہیں ہوں گے تو ہم پیدل چلیں گے۔''

اس وقت وہ ٹاؤن ہال کی سیڑھیوں کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ادھر سے ایک جانی پہچانی آواز آئی— '' چائے میں تو چاہ ہوتی ہے—دس پیسے میں پیار کی پیالی۔ آؤ برخوردار آؤ۔ چائے پیو۔'' دونوں کو پرانا زمانہ یاد آ گیا—امر نے آشا سے کہا— '' چلو، بیتے دنوں کی یاد میں ایک پیالی چائے پی لیں۔''

''سلام بڑے میاں!'' دونوں نے مل کر کہا—اور سیڑھیوں پر بیٹھ گئے ''جیتے رہو بیٹا!'' بڑے میاں نے کہا اور بغیر ان کے پوچھے دونوں کو ایک ایک پیالی دے دی۔

سیڑھیوں پر' سڑک کی روشنی میں کتنے ہی لوگ بیٹھے تھے، دو تین کتابیں پڑھ رہے تھے۔ کوئی اخبار پڑھ کر اپنے پڑوسیوں کو سنا رہا تھا۔ ایک طالب علم امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ان ہی میں سے کوئی کوئی اٹھ کر بڑے میاں سے چائے لینے آ جاتا تھا۔

امر نے یہ سب دیکھا اور چائے پیتا رہا۔
آشا نے بھی یہ سب دیکھا اور چائے پیتی رہی۔
دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پیار کی پیالی کا ایک میٹھا گھونٹ پیا۔
''یہ سچ ہے یا سپنا؟'' آشا نے ہلکے سے امر سے پوچھا۔
''بڑے میاں سے پوچھو!'' امر نے چائے والے کی طرف دیکھا۔
''سچ کو جب پیار چھو لیتا ہے تو وہی سپنا بن جاتا ہے۔'' داڑھی والے بڑے میاں نے جوانی کا راز بتایا۔

اور امر نے سوچا۔ کیا ہو گیا ہے ہمیں؟ میں اب بھی آشا سے محبت کرتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ پھر اب ہم اس طرح سے بیٹھ کر پیار کی پیالی کیوں نہیں پیتے؟ چوپاٹی پر جا کر کبوتر کیوں نہیں اڑاتے؟ اپالو بندر پر اناناس کی قاشیں کیوں نہیں کھاتے؟ خوشبودار مہوبے کے پان کیوں نہیں بنواتے؟ مالا بار ہل پر جا کر رات کے سناٹے میں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں کیوں نہیں سنتے؟''

اتنے میں سڑک کے دوسرے فٹ پاتھ سے ایک آواز آئی— ''او بڑے میاں! دس بارہ کپ چائے لے آنا!''

بڑے میاں نے بالٹی اور ساوار اٹھایا۔ ''اچھا تم دونوں آرام سے چائے پیو۔ میں ابھی آیا۔'' آشا اور امر اکیلے بیٹھے رہ گئے۔ امر نے کہا ''آشا! میں نے فیصلہ کر لیا ہے؟''
''کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' امر نے کہا۔ خوشی کے مارے آشا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کب سے وہ یہ سننے کے لیے ترس رہی تھی۔ ''اسی لیے میں نے طے کر لیا ہے کہ سیٹھ ڈالیریا کی نوکری منظور کر لوں گا۔ ہم ایک دو برس کے لیے لندن یا پیرس چلے جائیں گے۔ تب تو تم خوش ہو گی؟''

ابھی آشا 'ہاں' نہیں کہہ پائی تھی کہ جانی کی موٹر کا مخصوص ہارن سنائی دیا۔ دونوں ادھر مڑے تو دیکھا جانی کی موٹر بڑی تیزی سے آ رہی ہے۔ جانی اور للّی اس میں بیٹھے ہیں۔ بڑے

میاں سڑک کو پار کر رہے ہیں۔ بڑے میاں کے ہاتھوں میں بالٹی اور ساوار ہیں—اور اگلے لمحے بڑے میاں سڑک پر گرے پڑے تھے، ان کی بالٹی اور ساوار گرے پڑے تھے اور جانی کی موٹر تیزی سے دور چلی جارہی تھی— سپنا سچ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

امر بڑے میاں کی طرف بھاگا۔ دوسرے فٹ پاتھ سے لوگ دوڑے۔ سب نے دیکھا کہ سڑک پر چائے کی پیالیاں ٹوٹی پڑی ہیں اور ساوار سے چائے بہہ رہی ہے اور چائے والے بڑے میاں زمین پر پڑے کراہ رہے ہیں۔

بڑے میاں، بڑے میاں! امر چلّایا، آشا نے جھک کر ان کی نبض دیکھی۔ گھبراؤ مت! بڑے میاں بڑی تکلیف سے بولے—''میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔'' شکر ہے وہ زندہ تھے اور ہوش میں تھے لیکن اٹھ نہیں سکتے تھے۔

''ان کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے—'' امر نے ایک آدمی سے کہا—'' اسپتال لے جانا ہے۔ جلدی سے ٹیکسی لے آؤ۔'' غریبوں کی جان کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔''

''وہ پیسے والا نہیں ہے۔'' امر نے آہستہ سے کہا—'' ہماری تمھاری ہی طرح غریب ہے۔ مگر اس نے یہ کار حاصل کرنے کے لیے کسی کو لوٹا ہے۔ شاید خون بھی کیا ہے۔''

'' آشا نے جدھر جانی کی موٹر گئی تھی ادھر دور سڑک پر دیکھتے ہوئے کہا'' اب تو وہ میلوں دور نکل گیا ہوگا۔''

امر کمار اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار تھے— دانت پیس کر بولا—'' میں جانتا ہوں وہ کہاں جا رہا ہے۔''

اور دور سے کسی اسٹیمر کے سائرن کی آواز سنائی دی جیسے انجانے خطرے سے انہیں آگاہ کر رہی ہو۔''

○

شیشے کی دیواریں

لولو کی فلیٹ ایرکنڈیشنڈ بھی تھی اور 'ساؤنڈ پروف' بھی۔ سمندر کی لہروں کا شور اندر نہیں آسکتا تھا۔ اندر کی آواز باہر نہیں جاسکتی تھی وہسکی کی بوتل کھلنے کا ہلکا دھاکا۔ گلاسوں میں وہسکی انڈیلنے کی گٹ گٹ۔ سائفن میں سے ہوا کے دباؤ کے ساتھ سوڈا نکلنے کی پھنکار، ریڈیوگرام پر ڈانس میوزک مہمانوں کی چیخ وپکار، بحث ومباحثے جو شراب پی کر ہوتے ہیں۔ عورتوں کی ہی ہی۔ مردوں کی ہوہو۔ ڈانس کرنے والے جوڑوں کی ہلکی پھلکی فلرٹیشن ہندوستانی اور انگریزی تہذیب جو ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں، بلکہ ایک دوسرے گلا گھونٹ رہی تھیں۔

''LET'S DRINK TO PROHIBITION''

''پچھلے سال جب میں مانٹی کارلو میں تھا......''

آپ بنگلور ریسز جارہے ہیں۔ میں تو جارہی ہوں۔''

''لیس ڈارلنگ۔''

''میرے HUSBAND تو بزنس ٹور پر گئے ہوئے ہیں۔''

''ویری گڈ۔ ویری گڈ۔''

''مرسیڈیز تو کب کی بیچ دی ہے اب تو امپالا لی ہے۔''

''اجی منافع کہاں ہوتا ہے۔ سب تو یہ مزدور لے جاتے ہیں۔''

''میری مل میں بھی اسٹرائیک ہوا تھا۔ BUT BY GOD, WE BROKE IT''

ان سب سے الگ چاچا چنی لال وہسکی کا گلاس ہاتھ میں لیے کھڑا کھڑکی کے شیشوں میں سے شہر کی روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ چاچا چنی لال نے کالج میں فلسفہ پڑھا تھا۔ طالب علم کی حیثیت سے بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں سے اس کا تعلق تھا۔ اب وہ اسٹاک ایکس چینج میں شیئرس کی دلالی کرتا ہے اور دس ہزار روپے ماہوار کماتا ہے۔ مگر اب بھی ہر پارٹی میں وہسکی کے چوتھے پیگ کے بعد ترقی پسند اور فلسفیانہ باتیں کرتا ہے یا کم سے کم سوچتا ہے۔

'' قومی یکجہتی کی اس سے اچھی اور روشن مثال کیا ہو سکتی ہے !۔۔۔وہ دیکھیے سامنے ایک طرف مہالکشمی کا مندر ہے، دوسری طرف حاجی علی کا مزار اور مسجد ہے۔ اس سے آگے بڑھیے تو مہالکشمی کا مندر یعنی ریس کورس ہے۔ اس کے پیچھے جو روشنیاں آپ کو نظر آ رہی ہیں، وہ کپڑے کی ملیں ہیں جو اس وقت رات کو بھی چل رہی ہیں۔ جہاں اتنا نفیس اور مہنگا کپڑا بنایا جاتا ہے، جسے خود اس کے بنانے والے مزدور نہیں خرید سکتے اور ان ملوں کے پیچھے پریل کی وہ چالیں ہیں، جہاں اس فلیٹ کے باتھ روم سے بھی چھوٹی چھوٹی کھولیوں میں، ان مزدوروں کی بیویاں اپنے شوہروں کا رات پالی سے لوٹنے کا انتظار کر رہی ہیں اور ادھر ریس کورس کی طرف گندے نالے کے کنارے وہ جھونپڑیاں ہیں جو بیسویں صدی میں ہمیں دنیا کے اس دور کی یاد دلاتی ہیں، جب انسان نے اینٹ، پتھر، سیمنٹ، لوہے اور شیشے کے گھر بنانا نہیں سیکھا تھا مگر یہ سب اس ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ کے باہر ہے۔ یہاں ان شیشے کی بند دیواروں کے پیچھے نہ مسجد کی اذان سنی جا سکتی ہے، نہ مندر کے گھنٹے اور نہ ملوں کی گڑگڑاہٹ اور نہ پھولوں سے مہکی ہوئی اس فلیٹ میں اس گندے نالے کی بدبو آ سکتی ہے، ہم محفوظ ہیں۔ بالکل محفوظ، دنیا کی ہر بلا اور بدبو سے محفوظ ہیں، آؤ! اس سکیورٹی کے نام پر ایک اور جام پیو..... مگر یہ کیا؟ وہسکی ختم۔ اور تم سب کہاں کھسک گئے؟''

'' چاچا چنی لال نے ابھی صرف چھ پیگ ہی پیئے تھے۔ سیدھے بار پر گئے، وہاں پہلے ہی وہسکی ختم ہو جانے کا رونا رویا جا رہا تھا۔

ٹوٹو۔ اولڈ بوائے! وہسکی خلاص؟''

''NOT A BLOODY DROP TO DRINK''

''مجھ سے کیوں نہیں بولا۔ اسکاچ کا پورا کینس CANS لے آتا۔'' سب کے طعنے سن کر ٹوٹو بولا۔ ''فکر نہ کرو۔ انکل سے کہہ دیا ہے ایک ڈزن باٹلز کے لیے۔''

''اچھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمھارا انکل یہ دھندا بھی کرتا ہے۔'' چاچا چٹنی لال بولے۔ ''یہ تو جگت انکل ہے، چاچا چٹنی لال!۔ اچھا میں اسے پھر فون کرتا ہوں!''

انکل کرسی پر اسی طرح نڈھال بیٹھا تھا۔ جس حالت میں جانی اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس نے کمزور ہاتھوں سے اسے اٹھایا اور بجھی ہوئی آواز میں 'ہیلو' کہا۔ مگر دوسری طرف کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور آواز میں زندگی آ گئی۔ ''ہیلو سر! I AM SORRY میں ابھی بھیجتا ہوں......I AM REALLY VERY SORRY SIR میں اسی دم روانہ کرتا ہوں۔'' اور پھر فون بند کر کے، کچھ سوچ کر، جیسے دل کڑا کر رہا ہو، مری ہوئی آواز میں پکارا۔ ''روزی! روزی!''

دروازے پر کسی نے گھنٹی بجائی۔

ٹوٹو نے دروازہ کھولنے سے پہلے 'پیپ ہول' کھول کر اس میں آنکھ لگا کر دیکھا۔ شراب بندی کا زمانہ ہے۔ کیا معلوم پولیس ہی چھاپہ مارنے آئی ہو مگر پیپ ہول میں سے پولیس والے نہیں دکھائی دیئے۔ آشا کا خوب صورت چہرا نظر آیا۔

ٹوٹو نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ 'ہیلو آشی!' اس نے تپاک اور بے تکلفی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ 'میں نے تو امید ہی چھوڑ دی تھی تمھارے آنے کی۔ مگر یہ کیا؟ اکیلی کیوں آئیں؟ کسی کو ساتھ کیوں نہیں لائیں؟''

آشا مسکرا کر بولی۔ 'میں کسی کو ساتھ لائی ہوں وہ 'کسی' ٹیکسی کے پیسے دے رہا ہے۔''

''گڈ!'' ٹوٹو ہنس کر بولا۔ ''دیکھیں تمھارا نیا بوائے فرینڈ کون ہے؟'' آشا نے لفٹ کی طرف دیکھتے ہوئے جو اوپر آ رہا ہے تھا۔ کہا۔ ''وہ میرا پرانا بوائے فرینڈ ہے۔''

اسی وقت لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے امر نکلا۔

''اچھا' تو یہ ہے تمہارا نیا بوائے فرینڈ!'' ٹوٹو کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

''ہیلو ٹوٹو!'' اورامر نے ہاتھ بڑھایا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

''ارے تم دونوں کو ساتھ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔'' ٹوٹو نے ایک مہذب جھوٹ بولا۔

''بائی دی وے۔'' امر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔'' وہ کرسچین نوجوان تو نہیں آیا جو تمھارے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا؟''

''نہیں بھائی! وہ شاید اپنی پارٹنر کی تلاش کر رہا ہے۔'' ٹوٹو نے جانی کے الفاظ یاد کرتے ہوئے دوہرائے۔'' کہتا تھا بمبئی کی سب سے حسین لڑکی کو ساتھ لاؤں گا۔ چاہے اسے زبردستی کیوں نہ گھسیٹ کر لانا پڑے۔''

میرین ڈرائیو پر جانی واقعی بمبئی کی (یا ہندوستان، یا دنیا کی) سب سے خوب صورت لڑکی کو گھسیٹ کر لا رہا تھا۔ وہ لاکھ چلا رہی تھی کہ'' جانی! میں گر جاؤں گی''۔ جانی میں گر جاؤں گی '' مگر جانی ماننے والا نہیں تھا۔ آخر کار جب بھاگتے بھاگتے خود بھی تھک گیا تو للّی کو سمندر کے کنارے کی دیوار پر بیٹھا دیا۔

''جانی! تم پیئے ہو یا پاگل ہو گئے ہو'' للّی ہانپتے ہوئے بولی۔۔ تم بولے تھے ٹوٹو کی پارٹی میں جائیں گے اور اب یہاں میرین ڈرائیو پر مجھے دوڑا رہے ہو۔۔؟''

جانی نے بےفکری سے جواب دیا۔ DONT WORRY BABY پارٹی میں بھی جائیں گے مگر پہلے تھوڑی سیر کریں گے، یہ سب جگہ اپنی لائف میں بہت امپورٹینٹ ہے۔'' پھر کچھ یاد کر کے مسکرایا۔'' کئی سال پہلے ایک رات میں یہاں سویا تھا تو پولیس نے پکڑ لیا۔ پوچھا گھر کہاں ہے۔ میں نے کہا نہیں ہے۔ بس آوارہ گردی کے چارج میں اندر کر دیا۔''

للّی نے اسے شبہ کی نظر سے دیکھا کس چور اچکّے کے ساتھ میں چلی آئی ہوں۔

'' مگر آج مجھے کوئی اریسٹ نہیں کر سکتا۔'' جانی نے اپنا بیان جاری رکھا۔'' آج وہاں میری گاڑی کھڑی ہے۔ پاکٹس میں مال بھرا ہوا ہے۔ وہاں سامنے کسی بھی بلڈنگ میں فلیٹ خرید سکتا ہوں۔'' اور پھر للّی کی طرف دیکھ کر'' بولو للّی تم کو کون سا بلڈنگ مانگتا۔ ہم ادھر ہی فلیٹ خریدے گا۔'' للّی نے چڑ کر جواب دیا۔'' تم فلیٹ خریدو یا نہ خریدو مجھے اس سے کیا؟'' اور یہ کہہ کر وہ وہاں

سے اٹھ گئی۔ کار کے پاس چلی گئی۔

''جانی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ وہ فلیٹ تمھارے لیے ہی تو خرید رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کار کے اوپر بیٹھ گیا۔ اب وہ امریکن فلموں کا غنڈا نہیں تھا۔ ایک معمولی ہندوستانی تھا، جو اس وقت رات کے سناٹے میں ایک لڑکی کو اپنے دل کا حال بتا رہا تھا— ''تم میرے ساتھ رہو گی نا؟ میرا کوئی نہیں ہے۔ ماں نہیں، باپ نہیں، برادر سسٹر نہیں، آئے اکیلا جائے اکیلا — 'THAT'S ME BABY' ایک بڑھا ہے، جسے میں انکل کہتا تھا، آج اس نے بھی چھٹی کر دی— میں تمھارا کوئی نہیں ہوں اور پھر اس نے اپنی پیدائش کا راز بھی بتا دیا۔ آج للی سے کچھ نہیں چھپائے گا۔'' میرا تو کوئی نام بھی نہیں، فٹ پاتھ پر پڑا ملا تھا۔ کون جانتا ہے، میں کون ہوں، جانی، یا جمنا داس، جمشید جی، یا جمال الدین— '' دفعتاً اس کی آواز اونچی اور جوشیلی ہوتی چلی گئی— ''مگر اب میرے پاس روپیہ ہے— تم فکر نہ کرو— ہمارے پاس سب کچھ ہوگا۔ اپنا گھر ہوگا۔ اپنے بچے ہوں گے—''

للی نے چونک کر جانی کی طرف دیکھا۔

''اتنی گھبرا کیوں گئیں؟ پہلے ہماری شادی ہوگی— پھر ہمارے بچے ہوں گے۔''

للی اتنی آسانی سے اس چرب زبان نوجوان کی بات ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا— ''تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے شادی کرنا منظور کر لوں گی۔'' اور کار کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب بکواس کافی ہو گئی۔ اب چلو یہاں سے۔''

مگر جانی بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ بھی کار میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ، پر مگر موٹر چلانے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

''سنو للی، یا لیلا یا لیلے یا جو بھی تمھارا نام ہے—'' اس نے کہنا شروع کیا۔ تمھارے بھورے بال ہوں، یا کالے۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔''

جانی کے لیے یہ سب کہنا بھی بہت تھا۔ للی اس کی مضحکہ انگیز سادگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی تھی۔ اس نے صرف 'سچ' کہا۔ مگر بہت کچھ کہا۔

''تم اکیلی ہو۔ دکھی ہو، اور یہ جانی یا جمیل یا جمشید جی یا جمنا داس جو بھی اس کا نام ہے یہ بھی دکھی ہے۔'' اور پھر اس نے دھڑ سے سوال کر ہی دیا— ''ہماری جوڑی اچھی رہے گی نا؟''

للی جو کیبرے آرٹسٹ کی حیثیت سے للی لاٹوش کہلاتی تھی اور جو ہوٹل کے اشتہاروں میں ایک غیر ملکی حسینہ ظاہر کی جاتی تھی اور جو ہوٹل کے اسٹیج پر ہر قسم کے امریکن ڈانس کرتی تھی مگر جس کی رگوں میں ہندوستانی خون تھا اور جو دراصل گرگام کی رہنے والی لیلا تھی، اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ اس نے صرف اپنی ساڑی کا پلّو سر پر کرلیا اور گردن جھکا دی۔

جانی کے لیے اتنا کافی تھا۔ وہ چلاّیا: ''تھری چیرس فور مسٹر اینڈ مسز جانی یا جمیل الدین، یا جمناداس یا جمشید جی، ہپ ہپ ہرّے!'' صرف چلاّ نا اس کی خوشی کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس نے اپنی موٹر کا ہارن بھی بجانا شروع کر دیا۔

سامنے والی بلڈنگ کے ایک فلیٹ کے بعد دوسرے فلیٹ میں روشنی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک فلیٹ والے نے جو غصے میں تھا کہ اس کی نیند میں خلل پڑا ہے۔ ایک بالٹی ٹھنڈے پانی کی عین جانی اور للی کے اوپر پھینک دی۔

''جانی ہم تو بالکل بھیگ گئے — '' للی چلاّئی — ''اب کیا کریں گے؟'' ایک بالٹی پانی، جانی کی خوشی اور جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ اب ہم پارٹی میں جائیں گے وہ بولا۔

اور یہ کہہ کر اس نے موٹر اسٹارٹ کی اور تیز دوڑاتا ہوا لے گیا۔

دروازے کی گھنٹی بجی، تو ٹوٹو نے پھر احتیاط سے 'پیپ ہول' کھولا — اس میں سے ایک بھولی بھالی مگر انجانی لڑکی کھڑی دکھائی دی۔ ٹوٹو نے دروازہ کھول دیا۔ کالے ساٹن کا فراک پہنے، بالوں میں پھول لگائے ایک بڑی بڑی آنکھوں والی چھوٹی سی لڑکی کھڑی تھی۔ مشکل سے سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ ہاتھوں میں دو تھیلے لٹکائے ہوئے تھی۔

''WELCOME YOUNG LADY'' ٹوٹو نے اس کا خیر مقدم کیا — ''مگر آپ ہیں کون؟''

''سر......سر......'' لڑکی کچھ گھبرا رہی تھی، کچھ شرما رہی تھی۔ کچھ بوکھلائی ہوئی سی تھی۔ ''میں باٹلیاں لائی ہوں۔ انکل نے بھیجی ہیں۔''

''اوہ گڈ۔ اولڈ انکل۔'' ٹوٹو خوشی سے چلاّیا اور روزی کو تھیلوں سمیت اندر گھسیٹ لیا۔

وہسکی آگئی۔ وہسکی آگئی۔ چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہسکی کی نئی بوتلیں کھولی گئیں۔

شراب گلاسوں میں انڈیلی گئی۔

دو شراب کے گلاس ہاتھ میں لے کر ایک صاحب روزی کے پاس آئے۔ اس کی طرف گلاس بڑھا کر بولے— ''لو پی لو' SWEETIE PIE'' وہ ایک غریب مگر خوب صورت اور جوان لڑکی سے بے تکلف ہو جانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔

''نو سر—'' روزی نے سر ہلا کر انکار کیا— ''ہم پیتا نہیں—

''لو سنا۔ ٹوٹو صاحب!'' وہ صاحب چلاّئے۔ BEST JOKE OF YEAR۔ ایک دارو سپلائی کرنے والے کی لڑکی، جو پیتی نہیں۔''

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ قہقہوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور بیچاری روزی کو ایسا لگا جیسے سارے کمرے میں شیطان بھرے ہوئے ہوں اور وہ شیطان ہنس رہے ہوں۔ اس پر ہنس رہے ہوں، اور ان کی ہنسی کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہ ہو رہا ہو۔ وہ اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں سے کبھی ادھر دیکھتی تھی، کبھی ادھر— مگر کہیں اس کو ہمدردی نظر نہیں آئی، وہ ایک لاچار اور بے کس ہرنی تھی، جس کو چاروں طرف سے شکاری کتوں نے گھیر رکھا تھا اور شکاری کتے اپنے خوفناک دانت نکالے ہوئے بھونک رہے تھے یا ہنس رہے تھے۔

مگر ٹوٹو کی فلیٹ نہ صرف ایئر کنڈیشنڈ تھی، بلکہ 'ساؤنڈ پروف' بھی تھی اور ان قہقہوں کی آواز ان شیشے کی دیواروں میں الجھ کر رہ گئی۔ دفعتاً روزی کو خوف کا احساس ہوا کہ اگر وہ چیخی، چلاّئی بھی تو اس کی آواز اس فلیٹ سے باہر نہیں جائے گی۔ اندر ہی گھٹ کر رہ جائے گی۔

اور اب قہقہے بند ہوئے تو وہسکی کا گلاس پھر اسے پیش کیا گیا۔'' اب میں نے پھر انکار کیا تو شکاری کتے پھر بھونکنا— یا ہنسنا— شروع کریں گے روزی سوچ ہی رہی تھی کہ گلاس اس کے منہ میں ٹھونس دیا گیا، پہلا گھونٹ زبردستی پلا دیا گیا۔ روزی نے آج تک وہسکی نہیں پی تھی۔ اس کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا گلا چاقو سے چیر دیا تھا۔ مگر اگلے لمحے میں اس کے تن بدن میں ایک عجیب گرمی کی لہر دوڑ گئی— گلاس اس کے منہ کو لگا ہوا تھا اور اس کو وہ سارا ہال اور اس میں بھرے ہوئے لوگ اور ڈانس والے جوڑے اپنے گلاس کی تلی میں سے عجیب سے دکھائی دے رہے تھے— جیسے دفعتاً وہ معمولی

انسانوں سے لمبے چوڑے، ٹیڑھے میڑھے، چھوٹے بونے مسخ صورتوں والے راکھشش ہو گئے ہوں۔ شاید ان کا اصلی رنگ جس کی صورت نہ صرف جانی پہچانی تھی، بلکہ جس کو دیکھ کر روزی کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے گلاس ہٹایا تو دیکھا سامنے سے جانی اور اس کے ساتھ ایک لڑکی۔۔ ایک لمبے قد کی خوب صورت لڑکی۔۔ چلے آ رہے ہیں اور ٹوٹو ان کا استقبال کر رہا ہے تو یہ ہے وہ ناچنے والی، للی! جس کی خاطر جانی نے اس کی، روزی کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔

اور پھر ٹوٹو جانی کو، للی کو کمرے کی دوسری طرف لے گیا اور جانی جس کی نظریں للی اور صرف للی پر جمی ہوئی تھیں، اس نے روزی کو دیکھا بھی نہیں۔

اور پھر روزی نے دیکھا کہ جانی اور للی ڈانس کر رہے ہیں اور للی کی بانہیں جانی کی کمر کے گرد ہیں اور جانی کی بانہیں للی کی گردن میں ہیں اور ناچتے ناچتے جب وہ اس کے پاس سے گزرے تو جانی نے روزی کو دیکھا۔

''ہیلو روزی!'' جانی نے ڈانس کرتے ہوئے ہی اس سے پوچھا، جیسے کوئی خاص بات نہ ہو''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

روزی نے دانت پیس کر جواب دیا۔۔ ''بالیاں لائی ہوں، جو تم نے لانے سے انکار کر دیا تھا'' اس وقت تک جانی ڈانس کرتے ہوئے دور نکل گیا مگر روزی کی جلتی ہوئی نگاہیں للی کا پیچھا کر رہی تھیں۔

''روزی نے اپنے برابر والے سے کہا۔۔ ''سرو ہسکی؟''

وہسکی کا گلاس ہاتھ میں آیا تو وہ اس کو غٹ غٹ کر کے پی گئی۔ نہ جانے کتنے گلاس پی گئی، جانی اور للی کو وہسکی میں گھول کر پی گئی۔

اور اب روزی ناچ رہی تھی۔ وہ ناچ رہی تھی کہ دنیا ناچ رہی تھی، گھوم رہی تھی۔ وہسکی کی ساری بوتلیں ناچ رہی تھیں۔ روزی کی رگوں میں خون ناچ رہا تھا۔ ہر شخص باری باری روزی کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ باقی تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ، جو گھوڑ دوڑ، اور رمی اور فلاش اور معمولی روزمرّہ کی فلرٹیشن سے بھی اکتا گئے تھے۔ ان کے لیے یہ ایک نیا کھیل تھا۔ اور اب وہ روزی کے ساتھ ناچ نہیں رہے تھے کھیل رہے تھے۔ گیند کی طرح روزی کو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر پھینک رہے تھے، دبوچ رہے تھے۔ ہاتھ پکڑ کر گھما رہے تھے چکر دے رہے تھے۔ ان ہی میں جانی بھی تھا، جو کھڑا تالیاں بجا رہا تھا۔ روزی نے نیم

بے ہوشی میں بھی جانی کو دیکھا تو اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ پہلے تو جانی بھی ڈانس کرتا رہا مگر جب اس نے دیکھا کہ روزی تو اس کے گلے کا ہار ہوئی جاتی ہے تو اس کو دھکے مار کر صوفے پر گرا دیا۔ کھیل ختم ہو گیا۔ تالیاں بجیں۔ پھر ایک اور نیا ریکارڈ لگا دیا گیا۔ روزی صوفے پر گر کر سنبھلی تو اس نے دیکھا کہ للی کسی اور کے ساتھ ڈانس کر رہی ہے اور جانی اکیلا کھڑا ہے اور یہ دیکھ کر وہ اس حالت میں بھی مسکرا دی۔ امر ٹہلتا ہوا جانی کے پاس گیا۔ اس کی آنکھوں میں شبہ کی ایک خاص چمک تھی۔

''ہیلو!''

''ہیلو!''

''ماچس ہوگی؟'' امر نے سگریٹ منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا Sure جانی نے جیبوں میں ہاتھ ڈالا۔ امر نے دیکھا کہ جس جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے وہاں ایک گڈی نوٹوں کی نکل آتی ہے۔ آخر کار ایک جیب میں سے ایک نوٹوں کی گڈی نکلی اور اس میں گڈمڈ ماچس کی ڈبیہ۔

امر نے سگریٹ جلاتے ہوئے جانی کو ایک خاص نظر سے دیکھا اور پھر دوسری طرف دیکھا تو ٹوٹو آشا کو ہال میں سے بالکنی میں پہنچاتا ہوا دکھائی دیا۔

''آشی ڈیر!'' ٹوٹو کہہ رہا تھا۔ ''تم جانتی ہو اور میں جانتا ہوں۔ اور تمھارا سارا خاندان جانتا ہے۔''

''کیا جانتا ہے؟'' آشا نے سوال کیا۔

''کہ تمھاری شادی ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ میں تو بڑا خوش ہوا تھا جب تم اپنے ڈیڈی کے پاس چلی گئیں۔ پھر بھی بیرسٹر صاحب کے لیے کیا مشکل تھا؟''

''کیا مطلب؟'' آشا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''طلاق!'' ٹوٹو نے ایک لفظ میں دو زندگیوں کا فیصلہ کر دیا۔

''طلاق — !اور اس کے بعد؟''

''اس کے بعد — میں تو ہوں ہی۔ اس بدھو سے پہلے بھی تھا اور بدھو کے بعد بھی ہوں۔''

''اور پھر — ؟'' آشا نے مسکرا کے سوال کیا اور سوچا، بدھو کون ہے، یہ تو بعد میں معلوم ہوگا ٹوٹو کو۔''

''اور پھر ہماری شادی ہو جائے گی۔'' ٹوٹو نے بڑے اطمینان سے بالکنی کے کٹہرے کے سہارے کھڑے ہوکر جواب دیا۔

''اور پھر —؟'' اب آشا کو مزا آرہا تھا اس سوال و جواب میں۔

''اور پھر — ہم ہنی مون کے لیے لندن، یا پیرس یا جنیوا چلے جائیں گے، جس کا تمھارا قلم گھسنے والا شوہر خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔''

''اچھا، یہ بات ہے؟'' آشا نے اپنا بیگ کھولتے ہوئے کہا اور پھر ہوائی جہاز کے دونوں ٹکٹ نکال کر ٹوٹو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا لیجیے شروع سے آخر تک فرسٹ کلاس۔''

ٹوٹو نے ٹکٹوں کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا کہ شاید جعلی ہوں — ''یہ ناممکن ہے! ایک معمولی اخبار کا ملازم اور یہ گل چھرّے!''

''اب میرا شوہر معمولی اخبار میں کام نہیں کرتا۔'' آشا نے بڑے فخریہ انداز میں کہا— ''وہ سیٹھ ڈالیریا کا P.R.O ہے۔ ڈھائی ہزار روپے مہینہ۔ فری ہاؤس۔ فری کار!''

''اس عرصہ میں بالکنی میں جانی بھی للّی کو ڈھونڈھتا ہوا آ گیا تھا۔ آشا اور ٹوٹو کو شاید پرائیویٹ باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر وہ نشیلی آواز میں لگا معافی مانگنے — ''آئی ایم سوری۔ میں ڈھونڈھ رہا تھا— مسز جانی کو، یا مسز جمناداس، کو یا جمشید کو۔'' اس کا مطلب للّی سے تھا۔

مگر ٹوٹو یہ مذاق نہ سمجھ کر بولا — ''ایک وقت میں چار لیڈیز کو ڈھونڈو گے تو ایک بھی نہیں ملے گی۔ آؤ چلو!'' اور یہ کہہ کر وہ جانی کا ہاتھ پکڑ کر ہال میں لے گیا۔ راستے میں امر ملا جو واقعی اپنی بیوی کو تلاش کر رہا تھا۔ امر آشا کو ڈانس فلور پر لے گیا کیونکہ اس کو اس سے ایک پرائیویٹ بات کرنی تھی اور ڈانس کے ہنگامے ہی میں یہ بات کان میں کہی جاسکتی تھی تاکہ دوسرے سمجھیں عشق و محبت کی باتیں ہو رہی ہیں۔

یہ ٹوٹو کیا کہہ رہا تھا؟'' امر نے آہستہ سے پوچھا۔

''ولایت کے ہنی مون کا لالچ دے رہا تھا۔'' آشا نے بھی دھیرے سے جواب دیا۔

''اور تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے کہا۔ میرے شوہر نے پہلے ہی سے یورپ جانے کا انتظام کرلیا ہے۔''

امر یہ سن کر مسکرایا نہیں، سوچ میں پڑ گیا۔ وہ یورپ جائیں گے یا نہیں۔ یہی تو فیصلہ کرنا تھا۔ ڈانس، میوزک کی لہروں پر وہ دونوں خاموشی سے ڈولتے رہے۔ پھر امر نے آہستہ سے آشا کے کان میں کہا ــ 'سنو' آشی میرا خیال ہے کہ خونی یہی جانی ہے۔ اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ تم اس پہ نظر رکھو۔ جب تک میں پولیس کو خبر کرتا ہوں۔''

''آپ فکر مت کیجیے ــ'' آشا نے جواب دیا ــ ''میں اس کو جانے نہ دوں گی۔''

اور اب ڈانس کی ایک دوسری دھن بج رہی تھی۔ جانی بالکنی کے دروازے میں اکیلا کھڑا تھا اور للی کو کسی دوسرے کی بانہوں میں ڈانس کرتے ہوئے ٹیڑھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اس کے پیچھے بالکنی کی طرف سے آواز آئی۔

''مسٹر جانی!''

جانی نے مڑ کر دیکھا ــ '' آپ میرا نام جانتی ہیں مسز امر کمار؟'' ''میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ ادھر آیئے!'' اور جانی آشا کے ساتھ بالکنی میں چلا گیا۔

دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آشا کے پیچھے شیشے کی کھڑکیاں تھیں جن میں سے ہال میں لوگ ڈانس کرتے ہوئے نظر آتے تھے، جانی کے پیچھے بالکنی کا کٹہرا تھا اور اس کے پیچھے دور ایک نیون سائن کی روشنی تھی، جو جلتی بجھتی رہتی تھی اور جانی کے چہرے کو کبھی روشن اور کبھی اندھیرا کر دیتی تھیں۔

آپ میرے بارے میں کیا جانتی ہیں؟

'' کہ آپ بہت خوب صورت ہیں!'' آشا نے سوچا، خوشامد ہر انسان کو پسند ہوتی ہے۔

'' آپ مذاق کر رہی ہیں۔'' جانی جانتا تھا وہ کتنا خوب صورت ہے۔''

'اور آپ بہت امیر ہیں۔'

'' یہ پتے کی بات تھی۔ اب تو جانی چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔'' آپ کو کیسے معلوم؟''

'' آپ کے ماتھے پر لکھا ہے ــ'' آشا نے جواب دیا ــ اور چیزیں میں آپ کا ہاتھ دیکھ کر بتا سکتی ہوں۔''

جانی کو اپنی قسمت میں کیا لکھا ہے، یہ جاننے کی بہت فکر تھی ــ جلدی سے کرسی آگے سرکا کر

ہاتھ آگے کردیا۔ ''اچھا تو بتایئے، اس میں کیا لکھا ہے؟''

آشا نے بظاہر ہاتھ کی لکیروں کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ''اس میں لکھا ہے کہ تم نے بڑی مشکلیں جھیلیں ہیں، بہت محنت کی ہے۔''

''وہ تو کی ہے۔'' جانی نے فخر سے سر اونچا کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس ہاتھ نے کچھ نہیں تو ہزار کاریں دھوئی ہوں گی۔ سینکڑوں مچھی پکڑنے کے جال گھسیٹے ہوں گے۔ وہ تو کوئی بھی بتا سکتا ہے مگر میرے ہاتھ کی لکیروں میں کیا لکھا ہے۔'' اب جو اس کی چِنتا تھی، اس کا اظہار کیا اس نے— ''کیا تم ان لکیروں میں ایک چھوٹا سا گھر دیکھتی ہو۔ ایک بیوی؟ بچے''؟

''روپیہ تو بہت ہے'' آشا نے جواب دیا۔ اور پھر کسی قدر توقف کے بعد ''مگر ہاتھ خالی ہے۔''

جانی کو غصہ آرہا تھا۔ اپنی قسمت کے خلاف اور اس مسز امر کمار کے خلاف جو اس کی قسمت بتا رہی تھی۔ ''جب روپیہ ہے تو ہاتھ خالی کیوں ہے؟ گھر کیوں نہیں ہے؟ بیوی بچے کیوں نہیں ہیں؟''

''وہ مجھے نہیں معلوم۔'' آشا نے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے یہ ہاتھ خالی ہے۔ کیونکہ یہ ہاتھ لینا ہی جانتا ہے، دینا نہیں۔''

''یہ سن کر جانی ایک دم بھڑک اٹھا جیسے کسی نے اس کو دیا سلائی دکھائی ہو۔ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بالکنی کی دیوار کے ساتھ لگ کر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا— ''جیسے یہ کہتے وقت آشا کا سامنا کرنے سے کتراتا ہوا۔

''یس میں لینا ہی جانتا ہوں کیونکہ دنیا نے مجھے یہی سکھایا ہے، جو چاہیے چھین لو جھپٹ لو۔ نہیں تو بھوکے رہ جاؤ گے۔ کسی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔'' اور پھر آشا کی طرف مڑ کر— ''تم لوگ مجھے جانی کہتے ہو نا؟ مگر مجھے تو اپنا نام بھی نہیں معلوم! سو مجھے کیا پرواہ ہے تمھارے فینسی لفظوں کی HONESTY IS THE BEST POLICY چرچ اسکول کے MOTTOS کی بکواس جیسے کوئی نہیں مانتا۔''

آشا اس کا ردعمل دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ''کیا ہوا تمھیں؟ میں نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ یہ ہاتھ لینا ہی جانتا ہے۔ دینا نہیں۔''

جانی نے دانت بھینچ کر جواب دیا اور اس کا طنز زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

''میرا ہاتھ لینا جانتا ہے تو تمھارے شوہر کا ہاتھ کون سا دینا جانتا ہے۔ جسے جوئل رہا ہے،

چھین رہا ہے، جھپٹ رہا ہے— AND I DON'T BLAMES HIM ڈھائی ہزار روپے۔ فری ہاؤس، فری کار۔ سیٹھ ڈالیریا کسی CHARITY میں نہیں دے رہا ہے۔''

اپنے شوہر کا اس طرح ذکر سن کر آشا کو واقعی غصہ آ گیا۔ ''مسٹر جانی! ہوش میں آؤ! تم میرے شوہر کا مقابلہ اپنے جیسے چور اور اسمگلر سے کر رہے ہو۔''

''اور کیوں نہ کروں— '' جانی نے زور سے جواب دیا— اندر ڈانس کی دھن زوروں پر تھی۔ سب تھرک تھرک کر ٹوئیسٹ کر رہے تھے۔ جانی کا چیخنا پکارنا اس شور میں کہاں سنائی دیتا تھا۔ ''اس میں اور مجھ میں فرق ہی کیا ہے؟ بس یہی کہ وہ اپنا جال بچھا کر انتظار کر سکتا ہے اور میں نہیں کر سکتا۔ میں جلدی میں ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ آشا کے ایک جملے نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے— ''اتنی جلدی میں ہو کہ تمھارے راستے میں کوئی آدمی آ جائے تو تم اس کا خون کرنے سے بھی نہیں چوکو گے؟''

جانی رک گیا اور جب وہ مڑا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا— ''تمھیں کیسے معلوم ہوا ؟'' اس نے سوال کیا۔

آشا نے کہنا شروع کیا— ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تم نے کیسے؟''

''تم جھوٹ بول رہی ہو'' اس نے آشا کی بات کاٹتے ہوئے کہا— ''تم پلین میں تھی ہی نہیں، اس وقت تو چاروں طرف اندھیرا تھا— ''

''میں پلین میں نہیں تھی — مگر میں نے خود تمھیں دیکھا ہے کہ کس طرح اس بوڑھے چائے والے کو......''

''اب جانی کے سانس میں سانس آیا— ''وہ چائے والا — وہ تو ایکسیڈینٹ تھا۔'' آشا نے اب دوسری طرف سے حملہ کیا— ''اور کیا یہ بھی ایکسیڈینٹ تھا کہ بوڑھے بے چارے کو پلین میں مار ڈالا— اور اس کی جیب میں سے سارا روپیہ چرا لیا— ''؟

''وہ روپیہ اس کا نہیں تھا۔ اس نے ضرور کہیں سے چرایا تھا— '' جانی نے اپنی زندگی کا فلسفہ بتایا اور روپیہ کسی کا نہیں ہوتا۔ ہر کوئی کسی نہ کسی سے اسے چھینتا یا چُراتا ہے'' اور پھر ایک

بھیانک خیال اس کی آنکھوں میں چمکا — وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ اور نیون سائن کی روشنی اور اندھیرا اس کے چہرے پر پڑتا رہا۔ ایک لمحہ وہ بھیانک راکھشش میں تبدیل ہو جاتا اور اگلے لمحے وہ ایک شریر بچہ بن جاتا جو نقلی چہرا لگا کر کسی کو ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔"

"اور یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے اسے زہر دے کر مار دیا؟" وہ بولتا جا رہا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ "میں نے اس کا گلا گھونٹ کر مارا تھا۔ جیسے اب میں تمہارا گلا ان ہاتھوں سے گھونٹنے والا ہوں۔"

آشا نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا — چھ منزل نیچے سڑک تھی۔ ادھر بھی موت، ادھر بھی موت بڑھتی آ رہی تھی۔ چیخنا پکارنا بے کار تھا۔ ڈانس میوزک کے شور میں کون سنے گا؟ — اب جانی بالکل اس کے قریب آ گیا تھا۔ وہ اس کا گرم گرم سانس اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی تھی اور اس کے سخت ہاتھوں کو اپنے گلے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ سکتی تھی — "وہ مجھے پھانسی صرف ایک بار دے سکتے ہیں —"

آشا نے آنکھیں بند کر لیں مگر اسی لمحے میں ڈانس میوزک کا ریکارڈ ختم ہو گیا آٹومیٹک ریکارڈ پلیئر کی سوئی آپ سے آپ اوپر اٹھ گئی۔ جب تک ایک ریکارڈ اوپر جائے اور دوسرے ریکارڈ پر ریکارڈ کی سوئی نیچے گرے مکمل خاموشی کا ایک لمحہ تھا۔ ایک دم خاموشی۔ جانی کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے زناٹے کا تھپڑ مارا ہو۔ ایک پل کے لیے وہ مڑا اور اسی دم آشا اس کے قاتل ہاتھوں سے نکل بھاگی۔

اندر ہال میں دوسرا ریکارڈ لگ گیا تھا۔ سب لوگ پھر ڈانس کرنے لگے تھے۔ شیشے کی دیواروں کے اندر کچھ ان کو معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا خونی ڈرامہ ہو رہا تھا۔ للی بھی کسی کے ساتھ ٹوئسٹ کر رہی تھی۔ جانی نے بے تحاشا دوڑتے ہوئے اسے ہاتھ سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لفٹ میں لے گیا۔ سب لوگ حیران رہ گئے مگر یہی سمجھے کہ جانی نے جلن کے مارے ایسا کیا تھا۔ بٹن دباتے ہی لفٹ کا دروازہ بند ہوا۔ لفٹ نیچے روانہ ہوا۔ اسی دم دوسرا لفٹ اوپر آتا ہوا نظر آیا۔ اس کا دروازہ کھلا اور اس میں پولیس انسپکٹر اور اس کے کانسٹبل باہر آئے۔ نیچے لفٹ میں نے جانی للی کو گھسیٹتا ہوا کار تک لے گیا۔ زبردستی اس کو کار میں ڈالا اور کار کو زناٹے کے ساتھ

بیک کرتا ہوا بلڈنگ کے احاطے سے باہر۔ اب یہ کار اس کے لیے شان دکھانے کی چیز نہیں تھی۔ اب اس کی زندگی اور موت کا انحصار اس کار پر ہی تھا۔ کار پھاٹک سے باہر نکل ہی رہی تھی کہ پولیس والے سیڑھیوں سے نیچے اترے اور ٹوٹو کی کار لے کر وہ بھی جانی کی سفید کار کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ اس وقت امر کو جانی کا پیچھا صرف اس لیے ہی نہیں کرنا تھا کہ اس نے جو چوری کی تھی اس کا الزام امر پر لگایا جارہا تھا بلکہ اس لیے کہ جانی ایک خونی تھا۔ جس نے ابھی چند منٹ پہلے اپنے ناپاک ہاتھوں سے آشا کا گلا گھونٹنا چاہا تھا۔ بمبئی کی سڑکوں پر رات کے سناٹے میں تین موٹریں ایک دوسرے کا پیچھا کر رہی تھیں۔

ایک سفید ریسنگ کار۔

ایک پولیس جیپ

ایک پرائیویٹ رائل کار۔

ایک میں مجرم تھا۔

ایک میں پولیس۔

ایک میں ایک جرنلسٹ

جرم۔

قانون

انصاف۔

کون آگے تھا اور کون پیچھے؟ قانون جرم کا پیچھا کر رہا تھا یا مجرم انصاف کا پیچھا کر رہا تھا۔

قانون۔

انصاف۔

مجرم۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تین کاروں کی دوڑ نہیں ہے۔ یہ زندگی کا ابدی اور لامتناہی بھاگیہ کا چکر ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے اور جسے کوئی روک نہیں سکتا۔۔۔ سوائے موت کے۔۔۔!

○

رات کی بانہوں میں

آخر کار کام سے تھک کر، شراب کے نشے میں چور ہو کر، پاپ کی چادر تان کر بمبئی شہر بھی رات کی بانہوں میں سو چکا تھا۔

ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑکیں بھی اس وقت کنڈلی مارے سو رہی تھیں۔ مالا بار ہل کے شاندار بنگلوں میں، وارڈن روڈ، اور پیڈر روڈ کی بلڈنگوں کی ایئر کنڈیشنڈ فلیٹوں میں، پریل کی چالیوں میں، سیوری کی جھونپڑیوں میں، آخری بتیاں بھی اب بجھ گئی تھیں اور اندھیرا چھا گیا تھا۔

شہر سو رہا تھا۔ سڑکیں سو رہی تھیں، بلڈنگیں سو رہی تھیں، مندر مسجد، ہوٹل کلب، ریس کورس سب سو رہے تھے صرف گھنٹہ گھر جاگ رہا تھا۔ جس کا روشن چہرا اس وقت ڈھائی بجا رہا تھا اور سڑکوں پر لگی ہوئی گیس کی بجلی کی بتیاں جاگ رہی تھیں۔ ہلکی سی بارش ہو کر تھم گئی تھی اور روشنیوں کی جھلملاتی ہوئی پرچھائیاں شفاف گیلی سڑک کے آئینے میں ناچ رہی تھیں۔ شہر سو رہا تھا لیکن روزانہ اخبار کے دفتر جاگ رہے تھے۔ دنیا گول ہے اس لیے ایک ملک سوتا ہے تو دوسرا ملک جاگتا ہے۔ بمبئی سوتا ہے تو نیویارک جاگتا ہے، واشنگٹن جاگتا ہے۔ زندگی کبھی نہیں سوتی، ٹیلی گراف کے تار اور ریڈیو کی لہریں کبھی خاموش نہیں ہوتیں۔ امریکن فوجی ہوائی جہاز کبھی نہیں سوتے۔ ایٹم بم لیے ہوئے رات دن فضا میں اڑتے رہتے ہیں۔ ویت نام کے چھاپے مار کبھی نہیں سوتے۔

'آزاد قلم' کے ایڈیٹر صاحب نے کام ختم کر کے اپنے نیوز ایڈیٹر سے پوچھا— ''کل کے اخبار کی خاص خبریں کیا ہیں؟''

نیوز ایڈیٹر نے فرنٹ پیج کا پروف پڑھتے ہوئے جواب دیا— ''ویت نام میں چھاپے ماروں نے ایک اور امریکن اڈے پر قبضہ کرلیا۔ امریکہ نے شمالی ویتنام کے شہروں پر ہزاروں بم گرائے۔ ایک سو اٹھارہ امریکن ہوائی جہاز گرائے گئے—''

''اور مقامی خبریں—؟

نیوز ایڈیٹر نے لوکل پیج کا پروف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی خاص خبر؟

سچ پوچھیے تو بمبئی شہر میں آج کل کچھ ہوتا ہی نہیں—ایک خبر تو اس بوڑھے کی موت کی ہے۔ جو ہارٹ فیل ہو کر پلیٹ فارم پر مر گیا جو امر نے لکھی ہے۔ سیوری کی جھونپڑیوں میں شکی مزاج شوہر نے دانتوں سے اپنی بیوی کی ناک کاٹ ڈالی۔ پریل کے ڈالیریا میں نائٹ شفٹ کا ایک مزدور اونگھ گیا اور اس کا ہاتھ مشین میں آ کر کٹ گیا۔ PROHIBITION پولیس نے چیمبور اور سائن کی کئی جھونپڑیوں کی تلاشی لی اور وہاں شراب بنانے کی تین بھٹیاں پکڑی گئیں اور ساتھ میں ایک بیس گیلن غیر قانونی کشید کی ہوئی شراب۔ ہوٹل میں بہار کے قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لیے فیشن شو ہوا۔ چیمبر آف کامرس کے سالانہ ڈنر میں تقریر کرتے ہوئے وزیر زراعت نے اناج کے تاجروں کے انسانی ہمدردی کے جذبات اور ان کی خدمات کو سراہا اور ہاں ایک خبر یہ ہے کہ پولیس اب تک اس چار لاکھ روپے کی تلاش میں ہے جو پہلے دہلی کے کسی بینک کے کیشئر نے غبن کیا اور پھر کسی نے ہوائی جہاز میں کیشئر کا خون کر کے اس کی جیب سے اڑا لیا۔ بس اور کچھ نہیں رات کو تو بمبئی میں کچھ ہوتا ہی نہیں۔ بے جان شہر ہے—اے ڈیڈ سٹی—''

'ڈیڈ سٹی' جانی نے سنسان سڑکوں پر کار کو بے تحاشہ دوڑاتے ہوئے سوچا—سڑک کے دونوں طرف فٹ پاتھ پر لوگ ایسے سو رہے تھے، جیسے مردے لٹا دیے گئے ہوں۔

پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جانی نے ایک چوراہے پر اپنی کار موڑا تو للی نے گھبرا کر کہا—

''جانی پلیز—! ناٹ سو فاسٹ۔ گاڑی اتنی تیز نہ چلاؤ!''

جانی نے پیچھے مڑ کر دیکھا —ایک جیپ کی ہیڈ لائٹس ان کی کار کے بالکل پیچھے آرہی تھیں۔اوران کے پیچھے کچھ اور فاصلے پر دو اور ہیڈ لائٹس!

سامنے دیکھتے ہوئے جانی نے کہا— ''دیکھتی نہیں ہو، پولیس ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔

''مگر کیوں—؟''للی پریشان تھی کہ یہ جانی ہر جگہ سے اس طرح پاگلوں کی طرح بھاگتا کیوں ہے۔اب تک وہ سمجھتی تھی کہ اس پاگل پن کے لیے شاید وہ خود ذمہ دار ہے۔ اور صرف حسد اور جلن کے مارے جانی ایسا کر رہا ہے مگر پولیس کا اس سے کیا تعلق تھا؟''اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے جانی سے پوچھا— ''تم نے کیا کیا ہے؟''

جانی بالکل سامنے دیکھ رہا تھا۔ موٹر کی رفتار اس نے اور بڑھادی تھی پھر بھی جیپ اب بھی اس کے پیچھے ہی چلی آرہی تھی مگر اس وقت وہ پولیس کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ زندگی جو ابھی چند گھنٹے پہلے کتنی مختلف تھی۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ روپیہ، دنیا کی حسین ترین محبوبہ، ایک خوب صورت طاقتور کار۔ پھر کیا ہوا؟ ٹوٹو کی پارٹی میں کچھ گڑبڑ ہوئی۔ وہ امرکمار سگریٹ جلاتے ہوئے اس طرح گھور کر اسے کیوں دیکھ رہا تھا؟ اس کی بیوی خواہ مخواہ اسے ساتھ لے کر بالکنی میں کیوں باتیں کرنے گئی تھی؟ روزی بوتلیں لے کر کیوں آئی تھی؟ اسی لیے نا کہ اس نے بوتلیں لانے سے انکار کر دیا تھا۔؟ مگر روزی کو شراب کس نے پلائی تھی؟ وہ تو وہاں سے بھاگ آیا۔ اب اس بیچاری کے ساتھ وہاں کیا ہو رہا ہوگا؟

''تم نے کیا کیا؟''للی نے پھر اپنا سوال دوہرایا۔

سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے جہاں اس کی ہیڈ لائٹس اندھیرے میں راستہ بتاتی چلی جا رہی تھی، جانی نے کہا— للی سے، یا شاید اپنے آپ سے'' میں نے کیا نہیں کیا؟ اپنے ساتھ، تمھارے ساتھ۔ روزی کے ساتھ۔

یہ عجیب بات ہے روزی نے سوچا— بوتل میں شراب ہوتی ہے۔ شراب میں نشہ ہوتا ہے۔ پھر میں نے شراب پی ہے، یا شراب نے مجھے پیا ہے۔؟ دنیا گھوم رہی ہے، بھاگ رہی ہے۔ مجھ سے دنیا بھاگ رہی، یا میں دنیا سے بھاگ رہی ہوں؟ اس کو......ایسا محسوس ہوا کہ وہ تو ساکن ہے مگر

دنیا بھاگ رہی ہے۔ زمین بھاگ رہی ہے۔ دیواریں بھاگ رہی ہیں۔ دیواروں پر لگی تصویریں بھاگ رہی ہیں۔ دیواروں پر روشنیاں بھاگ رہی ہیں، دوڑ رہی ہیں۔ اس سے دور بھاگ رہی ہیں لیکن سب روشنیاں اگر اس سے دور بھاگ گئیں تو اندھیرا چھا جائے گا اور اندھیرے سے اسے ڈر لگتا تھا۔

اور اب وہ ایک اندھیرے کمرے ہی میں تھی۔ یہاں ایک ایک کر کے روشنیاں بجھتی جا رہی تھیں۔ اندھیرا ہو گیا تو وہ سمندر کی لہریں کیسے گن سکے گی؟ سمندر کی لہروں کی گنتی اس کی زندگی میں بہت اہم تھی۔ اس نے جانی سے وعدہ کیا تھا کہ ہم دونوں سیر کو جائیں گے۔ سمندر کے کنارے ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں چلیں گے۔ سمندر کی لہریں گنیں گے۔

اور اب رات تھی اور رات کی مضبوط سخت بانہیں تھیں، جو روزی کے بدن کو لوہے کے ایک شکنجے میں کس رہی تھیں، دیوار پر لگی ننگی لڑکیوں کی تصویریں اسے گھور رہی تھیں اور ایک وہسکی بھرا گرم گرم سانس اس کے ہونٹوں کے قریب آتا جا رہا تھا اور آسمان میں ایک پنکھا چل رہا تھا۔ جو کبھی اس کے قریب آتا تھا۔ کبھی دور جاتا تھا۔ مگر اب روزی سمندر کے کنارے پر تھی۔ سمندر کی لہریں، جیسا کہ وہ سمجھتی تھی، خوب صورت اور شانت نہیں تھیں، بڑے زور سے چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں، جیسے ان کو غصہ آ رہا ہو۔ مگر روزی کم سے کم ان کو گن سکتی تھی۔

پہلی لہر

دوسری لہر

تیسری لہر

لہروں کے طمانچے چٹان پر پڑتے رہے اور دھیرے دھیرے چٹان طوفان سمندر میں ڈوبتی گئی۔

پندرھویں لہر

سولہویں لہر

سترھویں لہر

اور پھر بڑی بھیانک لہر آئی اور روزی ناقابل برداشت تکلیف کے سمندر میں ڈوب گئی۔

پھر سمندر کی لہریں ایک دم شانت ہو گئیں اور روزی کے لاشعور سے صرف ایک لفظ نکلا۔ ' جانی!'

جانی اور اس کی موٹر اس وقت ایک جان ہو گئے تھے۔ جانی کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود ساٹھ، پینسٹھ ستر میل کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔ بھاگ رہا ہے — لیکن بھاگ کر جائے گا کہاں؟ بمبئی ایک جزیرہ ہے اور اس جزیرہ میں وہ قید تھے۔ ان چوہوں کی طرح جو ایک بڑے چوہے دان میں بند تھے۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ سکتے تھے۔ دوڑ لگا سکتے تھے مگر چوہے دان سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

کار مائیکل روڈ سے پیڈر رروڈ، پیڈر رروڈ سے کیمپ کارنر کا 'فلائی اوور' اور وہاں 'فلائی اوور' کی دیواروں میں لگی ہوئی لمبی لمبی روشنیاں جو خود جانی کو اپنے پیچھے بھاگتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وہاں سے ہیوجز روڈ، سینڈ ہرسٹ برج ہوتے ہوئے چوپاٹی۔ جہاں رات کے سناٹے میں بھی نیون سائن آنکھیں چمکا کر پٹرول کا، ہوائی جہاز کی کمپنیوں کا، ہوڑا واٹر کا اور فلموں کا اشتہار کر رہے تھے۔

میرین ڈرائیو۔ روشنیوں کی کمان۔ اور تینوں گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے ایسے اڑی جارہی تھیں، جیسے تیر۔ نریمان پوائنٹ پر پہنچے تھے تو جانی نے ایک چال چلی۔ جیپ اور امر کی گاڑی دونوں نے تقریباً اس کے برابر آ کر اس کو دائیں بائیں سے گھیر لیا تھا۔ اب ان کی رفتار ستر میل فی گھنٹہ تھی۔ لیکن تینوں گاڑیاں ایک ہی رفتار سے چل رہی تھیں۔ اس لیے ایک دوسرے کو ساکن لگتی تھیں۔ جانی نے ایک دم بریک لگا کر گاڑی کو روک لیا۔ پولیس کی جیپ اور امر کی گاڑی زور میں آگے نکل گئیں۔ جانی گاڑی موڑ کر الٹے پیروں بھاگا — مگر امر نے بھی جلد ہی اپنی گاڑی روک لی۔

اب جانی کے پیچھے امر کی موٹر تھی۔ اس کے پیچھے پولیس کی جیپ۔ جانی نے دانت بھینچ کے سوچا— ''یہ کمبخت تو پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کیوں نہ ان کو چکر دیا جائے۔ شاید کہیں چھٹکارہ مل جائے''۔

میرین ڈرائیو سے چرچ گیٹ اسٹریٹ۔ چرچ گیٹ اسٹیشن۔ ایروز سینما — ٹریفک لائٹس اپنی لال سبز آنکھیں چمکاتی ہیں۔ مگر جانی زندگی اور موت کے قانون توڑ چکا تھا۔ 'بائیں' اور 'دائیں' اور 'ٹھہریئے' اور 'جایئے' کے قانون کو کب ماننے والا تھا۔ اور خصوصاً اس وقت جب کے سارا بمبئی خالی پڑا تھا۔ جیسے کہ ان تین کاروں کی دوڑ کے لیے ریس کا میدان بنایا گیا ہو۔

تار گھر کے سامنے سے ہوتا ہوا وہ فلورا فاؤنٹن کے گرد گھوما اور پھر گھومتے گھومتے گاڑی ٹریفک آئی لینڈ میں ڈال دی اور شہیدوں کی یادگار سے نکل کر پھر واپس تار گھر کے سامنے والی

سڑک پر آ گیا مگر امر نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ نہ پولیس کی جیپ نے 'فاؤنٹن کی فلورا' اور سینکٹ مہاراشٹر کے شہید اپنی بے نور آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔

امر گاڑی کے "ایکسیلیٹر" کو پورا دبائے ہوئے تھا۔ گاڑی ستر میل کی رفتار سے چل رہی تھی۔ پھر بھی جانی کی سفید رنگ کی کار کو پکڑ نہ پائی تھی۔ جس راستہ سے وہ آیا تھا اسی راستہ سے اب واپس جا رہا تھا۔ چوہوں کی دوڑ تھی نا، امر دانت کچکچا کر زور لگا رہا تھا لیکن جانی ہر قدم پر اس سے آگے ہی رہا۔ وہ بار بار ایسی خطرناک حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی دائیں کو جاتا، کبھی بائیں کو، کبھی ٹریفک آئی لینڈ میں گھس جاتا، کبھی فٹ پاتھ پر چڑھ جاتا۔ کہ امر کو فکر تھی کہ پولیس سے جان بچانے کی کوشش میں یہ اپنی جان تو نہیں دے گا۔

اور اب ورلی کے سمندر کے کنارے سنسان سڑک پر گاڑیاں دوڑ لگا رہی تھیں۔ یہاں جانی نے دیکھا کہ کچھ لوگ سڑک کی روشنی میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جیب سے ایک مٹھی سو سو روپے اور ہزار ہزار روپے کے نوٹ نکالے اور ہوا میں اڑا دیئے۔ فٹ پاتھ کے رہنے والے غریب اس نوٹوں کی بارش پر ٹوٹ پڑے۔ امر کو اور پولیس جیپ کو بریک لگانے پڑے، نہیں تو کوئی نیچے آ جاتا۔

جانی سمجھا' میں نے اس طرح پیچھا کرنے والوں سے چھٹکارا پا لیا ہے مگر اب تو امر کو بھی ضد ہو گئی تھی اور پولیس کی جیپ تو بھاگتی ہوئی سوٹروں کا پیچھا کرنے کی عادی تھی۔۔ تھوڑی ہی دیر میں پھر جا لیا۔

آشا امر کے قریب بیٹھی یہ خطرناک ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ یہ بھول چکی تھی کہ جانی اس کا گلا گھوٹنے والا تھا۔ یہ بھول چکی تھی کہ اس نے چار لاکھ روپے چرائے ہیں اور کیشیر کی جان لی ہے۔ وہ عورت تھی اور عورت موت کی نہیں زندگی کی فکر کرتی ہے۔ اپنے دشمن کی زندگی کی بھی فکر۔ اس وقت اسے صرف یہ چنتا تھی کہ اگر گاڑیاں اسی رفتار سے چلتی رہیں تو کوئی دم جانی کی موٹر الٹ جائے گی، یا امر کی موٹر یا پولیس کی جیپ۔۔۔ یا تینوں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گی یا کوئی غریب فٹ پاتھ کا سونے والا یا بھوکا بھٹکا سڑک پر چلنے والا کچلا جائے گا۔ جس رفتار سے وہ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے، اس رفتار میں بھی ایک نشہ تھا، ایک دیوانگی تھی۔ آخر اس رفتار سے کے لیے کیا جان دینا ضروری تھا؟

ان کو دھوکا دینے کے لیے ایک بار پھر جانی نے جاتے جاتے بریک لگا کر گاڑی کو جو یکلخت موڑا تو اس کے دو پہیے ہوا میں اٹھ گئے۔ لگتا تھا کہ کوئی دم میں موڑ الٹ جائے گی۔ للّی کے منہ سے تو چیخ نکل گئی۔

''جانی، جانی! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟'' مگر جانی دانت کچکچا کر موٹر کو سنبھال رہا تھا۔ اس وقت تو وہ للّی کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو بچّوں کی طرح رو رہی تھی، بلک رہی تھی۔

جانی اب سیدھی سڑک پر موٹر دوڑا رہا تھا۔ مگر اسی تیز رفتار کے ساتھ۔ للّی نے پھر گڑگڑا کر کہا— ''جانی! مجھے گھر واپس لے چلو۔ پلیز!''

''اس روڈ پر آ کر کوئی واپس نہیں گیا۔'' اور یہ کہتے ہوئے جانی کی آنکھوں میں ایک عجیب وحشت، ایک عجیب پاگل پن تھا۔

اور للّی نے دیکھا کہ دور سامنے ''ROAD CLOSED'' کا بورڈ لگا ہے۔ سڑک کی مرمت ہو رہی ہے اور اس لیے سڑک کو بند کرنے کے لیے بھاری بھاری پیپوں پر لکڑی کی بلّیاں رکھ کر ان کو پتھروں سے دبا دیا گیا تھا۔ بیچ میں بورڈ لگا ہوا تھا اور— ایک لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔

''جانی جانی!'' للّی چلائی— مگر جانی نے موٹر کی رفتار کو دھیما نہیں کیا— اب للّی نے خطرناک رفتار سے اس ''ROAD CLOSED'' کے بورڈ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور آنکھیں بند کر لیں۔

ستر میل کی رفتار سے موٹر اس رکاوٹ سے جیسے ہی ٹکرائی موٹر نے ایک جست لگائی، بیس فٹ اوپر اچھلی۔ چنگاریاں ہوا میں اُڑیں اور ایک پہیے پر نیچے گری، مگر جانی نے پھر پہیے کو گھما کر موٹر کو سنبھال لیا اور کچی سڑک پر ہی دھول اڑاتا ہوا چلا گیا۔

''یہ جانی کیا پاگل ہو گیا ہے؟'' آشا نے سوال کیا۔ امر سے نہیں۔ شاید اپنے آپ سے۔''

مگر امر نے بھی اپنی موٹر کچے راستے پر ڈالتے ہوئے جواب دیا— ''وہ پاگل نہیں تھا مگر چار لاکھ روپے نے اسے پاگل بنا دیا ہے۔''

اور آشا نے پہلے امر کی طرف دیکھا۔ پھر سامنے لگے موٹر کے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا اور آہستہ سے کہا— ''روپیہ ہر ایک کو پاگل بنا دیتا ہے—''

پھر وہ کھڑکی کے باہر سر نکال کر بے تحاشہ چلّائی — ''جانی! ٹھہر جاؤ، اپنی جان مت دو۔ امر پلیز! اسے روکو۔ یہ اپنی جان دیدے گا!''

امر بھی اپنی طرف کھڑکی سے سر باہر نکال کر چلّایا — ''رک جاؤ جانی، رک جاؤ! پاگل مت بنو—''

للّی نے ان کی آوازیں سن کر جانی سے کہا — ''جانی موٹر آہستہ کرلو۔ وہ لوگ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

''جانتا ہوں۔ کیا کہنا چاہتے ہیں —'' جانی نے جواب دیا۔ اور پھر سامنے لگے شیشے میں اپنی صورت دیکھ کر جس پر ایک خطرناک مایوسی کی پرچھائیں پڑتی جارہی تھی۔ ''وہ مجھے پھانسی دینا چاہتے ہیں۔''

''پھانسی!'' للّی نے خوف اور حیرت سے وہ خطرناک لفظ دوہرایا۔ ''کیا تم نے کسی کا خون کیا ہے؟''

جانی وحشت ناک آنکھوں سے ٹکٹکی لگائے سامنے سڑک کو دیکھ رہا تھا جس پر ٹریفک کو راستہ دکھانے کے لیے سفید پینٹ سے ایک لکیر ڈالی گئی تھی۔ اس نے للّی کو جواب دیا مگر ایک ایسی آواز میں جس میں مایوسی بھی تھی۔ تلخی بھی، شکوہ بھی، پشیمانی بھی — ''مجھے کچھ نہیں معلوم للّی! میں نے کس کا خون کیا ہے اور کس کس نے میرا خون کیا ہے؟''

جانی ایک فلسفی نہیں تھا۔ نفسیات یا معاشیات کا ماہر نہیں تھا۔ اس نے سوشلزم اور سرمایہ داری کے نظریات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ مگر اس خطرناک گھڑی میں جب ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے وہ زندگی اور موت کا راستہ طے کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے ایک طرف نیچے ہزاروں بے گھر فٹ پاتھ پر لمبی، لامتناہی قطاروں میں سو رہے ہیں۔''

سڑک کے دوسری طرف اونچائی پر ان امریکن فلموں کے پوسٹر لگے ہیں۔ جن کو دیکھ دیکھ کر اس نے اپنی زندگی کی ساری قدریں حاصل کی تھیں۔ تیز رفتاری، سنسنی خیزی، اوپری چمک دمک، چکاچوندھ کرنے والی زندگی، چاہے وہ چوری سے حاصل ہو، ڈاکے سے، تشدد سے یا قتل سے!

اور اس فیصلہ کن گھڑی میں جب زندگی کی سب سچائیاں سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہیں، اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی زندگی کا کوئی گہرا تعلق دنیا کی ان متضاد نشانیوں سے رہا ہے۔

ایک طرف نیچے فٹ پاتھ پر مفلسی کی نشانیاں۔ چادروں میں لپٹے ہوئے بے گھر اور بے سہارا لوگ۔ جو مُردوں کی طرف پڑے تھے۔

دوسری طرف اونچے اونچے بورڈوں پر ننگی عورتیں، ایک ہاتھ میں شراب کا جام دوسرے میں پستول لیے ہوئے مرد۔

اس کی زندگی اس 'نیچائی' سے اس 'اونچائی' تک جانے کی کوشش میں صَرف ہوئی ہے......

ایک پوسٹر پر لکھا تھا— ''ایک نام۔ ایک دعوت۔ ایک اعلان نامہ۔ زندگی کا ایک نظریہ

—INVITATION TO KILL,INVITATION TO KILL

خون کرنے کے لیے دعوت نامہ— یہ دعوت نامہ کس نے بھیجا تھا؟

خون کرنے کے لیے۔ کس کا؟ خود اس کا؟

خون کرنے......

خون......

اوراب وہ خون اس کے سر پر چڑھ کر بول رہا تھا— ''مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میں نے کس کا خون کیا تھا اور کس نے میرا خون کیا ہے؟''

وہ یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ سب سوچ رہا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر ہی تھا۔ اس کا پیر 'ایکسیلیٹر' ہی پر تھا۔ موٹر اُسی تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ اس وقت وہ اور موٹر ایک جان ہو گئے تھے۔ موٹر کی تیز رفتاری، اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں تھی اور اس کی ساری قوت ارادی، اس کی بے جگری اور جان بچانے کے لیے جان پر کھیل جانے کا جنون اس کار میں آ گیا تھا۔

اوراب کار شہر سے نکل کر باندرہ کی 'ہائی وے' پر جارہی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے جو کہرا شہر کو دھند کی چادر میں لپیٹ لیتا ہے، اب اس نے چاروں طرف سے اس کو گھیر لیا تھا مگر اس کی موٹر کی لائٹس اس کہرا کو چیرتی ہوئی چلی جارہی تھیں۔ موٹر اب بھی ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی مگر اس کے دماغ میں وقت ٹھہر گیا تھا۔

اس دھند کے پردے پر اسے اپنی ساری زندگی نظر آرہی تھی۔ اس دھند کے پرے اُسے اپنے وہ مفروضہ باپ نظر آرہے تھے جن میں سے کوئی ایک اس کے جنم کا ذمہ دار تھا اور جو بتا سکتا

تھا کہ اس کا اصل نام کیا ہے؟

جمنا داس؟

جمال الدین؟

جمشید جی؟

جانی؟

جانی نے گردن پھرا کر دیکھا— للی اب خوف کی شدت سے خاموش ہو گئی تھی۔ گم سم بیٹھی تھی مگر اب بھی کتنی خوب صورت لگتی تھی۔ کاش! وہ دونوں کسی چھوٹے سے گاؤں کے چھوٹے سے گھر میں ہمیشہ کے لیے رہ سکتے۔ کوئی چھوٹا سا کام کرلیتا وہ اور چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ان کے مگر وہ یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا کہ للی بھی چاروں طرف سے دھوئیں کی چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔ جیسے دھوئیں کا کفن پہنے ہوئے ہو۔اب اس نے دیکھا کہ اس کی کار کی دولائٹس دھند کو چیرتی ہوئی جارہی تھیں اور اس نے سوچا شاید یہی دھوئیں کی بنی ہوئی وہ پھانسی کی رسّی ہے جو آہستہ آہستہ میری گردن کی طرف بڑھتی آرہی ہے—!

ڈیڈسٹی! روزی نے سوچا— شہر مر گیا ہے— اور میں بھی مر گئی ہوں— یہ سڑکوں کی روشنیاں نہیں ہیں۔ ان بھوتوں کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہیں جو قبرستانوں اور شمشانوں میں منڈلاتے ہیں۔

مگر یہ سامنے کیا آرہا تھا—؟ تیز روشنی کی دو لمبی انگلیاں تھیں۔ جو صبح سویرے کی دھند کو چیرتی ہوئی آرہی تھیں۔ نہیں نہیں، روزی کے دماغ نے سوچا، یہ موٹر کی روشنیاں نہیں ہیں، یہ رات کی بانہیں ہیں جو مجھے اپنی نرم آغوش میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان بانہوں میں ہی میری زندگی ہے، میری موت ہے، میری نجات ہے۔ اس نے بھی اپنے ہاتھ پھیلا دیے— ”رات مجھے اپنی بانہوں میں لے لو—!“

جانی نے دھند میں سے روزی کو عین کار کے سامنے آتے دیکھا تو یکلخت بریک پوری طاقت سے دبا دیے— اور اس لمحے میں آسمان کے سب چاند ستارے آپس میں ٹکرا گئے اور ساری کائنات میں ان کے بلّوری ذرّے بکھر گئے۔

O

نئی کرن

موٹر کے شیشوں کی کرچیں دور تک سڑک پر پھیلی ہوئی تھیں۔ موٹر سڑک چھوڑ کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی تھی اور وہاں ایک بجلی کے کھمبے سے بغل گیر ہو رہی تھی۔ دو پہیے زمین پر تھے اور دو ہوا میں۔ ایک پہیہ اب بھی گھوم رہا تھا اور اس میں سے لتھڑا ہوا خون قطرہ قطرہ کر کے فٹ پاتھ پر گر رہا تھا۔

خون کے قطرے روزی کی لاش کے باہر گر رہے تھے جو موت کی آغوش میں بھی معصومیت سے مسکرا رہی تھی۔ اس کے چند قدم پر للّی مری پڑی تھی اور اس کے خوب صورت چہرے پر اب بھی حیرت چھائی ہوئی تھی۔ جیسے مرتے دم تک اس کو یہ پتہ نہ ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟

وہاں سے سو سو اور ہزار کے نوٹ ایک گندے نالے تک بکھرے ہوئے تھے۔ جہاں گندگی اور کیچڑ اور خون میں لتھڑی ہوئی جانی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی ایک عجیب افسردہ سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو — ''تار تو ٹوٹنا ہی ہے ایک دن مگر مزا کتنا آیا —''

امر، آشا، پولیس انسپکٹر اور سب انسپکٹر، سب لاشوں کا معائنہ کر رہے تھے کہ شاید کسی میں جان باقی ہو مگر انسپکٹر نے افسوس کے ساتھ ہر بار نفی میں سر ہلا دیا۔

امر نے ان تینوں لاشوں کی طرف دیکھتے ہوئے اور سیوک رام کی مُردہ چوتھی لاش، جو

مُردہ گھر میں پڑی تھی اس کو یاد کر کے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''چار لاکھ روپے کے لیے چار جانوں کی قربانی—!''

پولیس انسپکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا— ''مگر اس بوڑھے کا خون جانی نے نہیں کیا تھا۔ اس پر تو صرف روپیہ چرانے کا الزام تھا—''

''مگر خود اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے پلین میں جب اندھیرا ہوا تو بوڑھے کا گلا گھونٹ کر اس کے روپے نکال لیے—'' آشا نے کہا۔

سب انسپکٹر نے پوری تفصیل بتائی— ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ بوڑھا گلا گھونٹنے سے پہلے ہی مر چکا تھا—''

اور پھر انسپکٹر اور سب انسپکٹر ایمبولینس وغیرہ کا انتظام کرنے چلے گئے اور جانی کی لاش کے پاس صرف آشا اور امر رہ گئے۔

وہ لاش۔ اور اس کے پاس بکھرے ہوئے گندے نالے کی غلاظت میں لت پت نوٹ، جانی کی ساری زندگی ان کی نظروں کے سامنے پھر گئی۔

آشا نے خاموشی سے بیگ کھولا اور اس میں سے لفافہ نکالا— جس میں سیٹھ ڈالیریا کے بھیجے ہوئے لندن، پیرس، نیویارک کے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ تھے، ایک مسٹر امر کمار کے لیے۔ ایک مسز امر کمار کے لیے— اس لفافہ میں عیش و آرام کی زندگی کا پروانہ تھا۔

آشا نے لفافہ امر کے ہاتھ میں دے دیا۔ امر نے لفافہ کو دیکھا، پھر جانی کی لاش کو دیکھا، اس کے پاس پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھا۔ پھر لفافہ آشا کو لوٹا دیا— فیصلہ آشا کو خود کرنا ہوگا۔

آشا نے لفافہ سے ٹکٹ باہر نکالے، لفافہ پھینک دیا۔ پھر ٹکٹوں کو پھاڑ کر پھینک دیا اور ان کے ٹکڑے ان نوٹوں میں مل گئے جو جانی کی لاش کے آس پاس پڑے ہوا میں پھڑ پھڑا کر دنیا سے کچھ کہہ رہے تھے۔

''چلو آشا!'' امر نے دھیرے سے کہا۔

''کہاں—؟''

''جہاں ہمارے ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہیں— آٹھ بجے ہمیں ڈالیریا واڑی پہنچنا ہے،

تاکہ جب سیٹھ ڈالیریا کے آدمی بستی والوں کو نکالنے آئیں تو میرے کیمرے کی آنکھ اس ظلم اور انیائے کو دکھا سکے۔"

اور کالے بادلوں کو چیر کر سورج کی ایک ننھی کرن نے اس سڑک پر اجالا کر دیا۔ جس پر امر اور آشا ہاتھ میں ہاتھ دیے، قدم سے قدم ملائے اپنے مستقبل کی طرف جا رہے تھے۔

○

چار یار

پہلا باب

نوسیوک

وجے نگر کی مہارانی پھول متی بڑی خوب صورت عورت تھی۔ مگر نو جوان عورت نہیں تھی۔ سن کوئی پینتالیس برس کا ہوگا لیکن میک اپ اس غضب کا کرتی تھی کہ لوگ اُس کو پچیس برس سے زیادہ کا نہیں سمجھتے تھے۔ بیوہ ہوئے اُسے دس برس ہو گئے تھے لیکن بیوگی کے کوئی آثار اُس کے چہرے یا کپڑوں پر نہیں تھے۔

اُس وقت وہ بالوں میں خضاب لگا چکی تھی، آنکھوں میں مکارا اور چہرے پر پینٹ اور پاؤڈر کی جادوگری کر چکی تھی۔ غرض یہ کہ کیل کانٹے سے درست ہو کر باہر جانے کو تیار تھی۔ ساڑی کا پلّو اُس نے سر پر ڈال لیا لیکن سینہ پر سے ڈھلکا لیا تا کہ لوگوں کی نگاہیں اُس کی جوانی کی نشانیوں پر پڑیں۔ سنگھار میز کے تین آئینوں میں اپنے آپ کو دائیں بائیں سامنے اور پیچھے سے دیکھ کر اس کو اطمینان ہو گیا کہ ہر طرح سے تیار ہے۔ کسی بھی محفل میں پچیس تیس برس سے زیادہ کی نہ لگے گی لیکن آج اُس کو صرف نو آدمیوں کی محفل میں جانا تھا۔ اُس نے ایک کمی محسوس کی اور کولون کی بوتل کا اسپرے اپنے چہرے پر مار لیا تا کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ اُس نے سنگھار میں اتنا وقت اور اتنی محنت لگائی ہے۔

سنگھار میز سے ہٹ کر اُس نے اپنی لوہے کی الماری کھولی اور اندر سے ایک اسٹین گن نکالی۔ آج وہ اپنی نظر کے تیروں پر بھروسہ نہ کر سکتی تھی۔ اُس نے اسٹین گن میں گولیوں کی پیٹی لگائی تاکہ ضرورت پڑے تو درجنوں دشمنوں کو بھون کر رکھ دے۔ 'دشمنوں' کے بارے میں سوچ کر وہ آپ سے آپ مُسکرا دی۔

اپنی کلائی کی سنہری گھڑی میں دیکھا تو سات بج چکے تھے۔ چند ہی منٹ میں اندھیرا ہو جائے گا اور پھر پورا چاند نکل آئے گا۔ پورے چاند کی رات اس کام کے لیے نہایت مناسب رہے گی جس کام کے لیے وہ روانہ ہونے والی تھی۔

مہارانی پھول متی کو شکار میں بہت دلچسپی تھی۔ مہاراجا دِبنے چند کو بھی شکار کا بہت شوق تھا۔ شیر کے شکار ہی میں اُن کی موت ہوئی۔ ایک نہایت خطرناک شیر مہاراجا کی گولی سے زخمی ہوا تھا۔ مہاراجا کا خیال تھا کہ مر گیا ہے مگر وہ مکّار دم سادھے ہوئے پڑا تھا۔ مہاراجا مچان سے اُتر کر اُس کے پیٹ کے اوپر لات رکھ کر فوٹو کھنچوانے کی رسم ادا کرنے آیا، جیسے ہی اُس کے اوپر اپنی ٹانگ دھری شیر نے اُس کے پاؤں کو اپنے مضبوط جبڑے میں پکڑ لیا۔ مہاراجا چلّایا: ''پھول متی۔ گولی چلاؤ' مہارانی نے گولی چلائی مگر وہ گولی شیر کی بجائے مہاراجا کو لگی اور مہاراجا وہیں شیر کے اوپر گر کر ڈھیر ہو گیا۔ یہ عمر میں پہلی بار تھا کہ مہارانی پھول متی کا نشانہ چوکا تھا ورنہ وہ تو ایسا نشانہ لگاتی تھی جو کبھی چوکتا نہیں تھا۔ تب جا کر مہارانی مچان پر سے نیچے اتری اور مردہ مہاراجا کی لاش پر گر پڑی اور لگی بین کرنے۔

بات یہ ہے کہ مہارانی بننے سے پہلے وہ ایک مشہور فلم اسٹار تھی۔ جہاں ادھیڑ عمر کے مہاراجا اس سے عشق کر بیٹھے تھے اور موتیوں کا نولکھا ہار پھول کماری کے گلے میں پہنا دیا تھا اور پھول کماری محل میں آ کر مہارانی پھول متی بن گئی تھی اور اُس کا ایک فرضی شجرۂ نسب مہاراجا کے جیوتشی نے تیار کر دیا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ بھی ایک راجا کی بیٹی تھی۔ جس کا سلسلہ سوریہ ونشی خاندان سے جا ملتا تھا۔ جب سے پھول متی نے فلمی دُنیا کو بھلا دیا تھا مگر میک اَپ کے جتنے پینترے تھے وہ اُس کو آج بھی یاد تھے۔ بندوق چلانا اُس نے مہاراجا سے محل میں آ کر سیکھا تھا۔ مہاراجا نے خود اُسے مشّاق بندوقچی بنا دیا تھا۔ وہ اتنی مشّاق ہو گئی تھی کہ اُڑتی چڑیا کو گرا سکتی تھی۔

اس لیے ناممکن تھا کہ اُس کا نشانہ چوک گیا ہو۔ وہ وہیں لگا تھا جہاں وہ لگانا چاہتی تھی۔ یعنی شیر کو نہیں بلکہ مہاراجا کو۔ شیر کو دوسری گولی مار کر اُس نے ہلاک کر دیا تھا۔ مگر کس کی ہمت تھی کہ کہہ سکے کہ مہارانی نے مہاراجا کو مار ڈالا۔ کیونکہ اب مہاراجا کے تخت و جائیداد کی وہی مالک تھی اور ممکن ہے کہ واقعی گھبراہٹ میں مہارانی کا نشانہ چوک گیا ہو۔ کیونکہ اُس کے بین کرنے سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ اسے مہاراجا کی موت کا بہت افسوس ہے۔ اُن کو ایک ایکٹریس کے کمال کا کیا اندازہ تھا؟

پھول متی نے سنگھار پورا کیا۔ پھر خوشبودار سینٹ بغلوں میں اور کان کے پیچھے لگایا پھر گھنٹی بجائی۔ فوراً ایک بوڑھا سیوک آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

'کیا آ گیا ہے، سرکار' کرنام سنگھ راجپوت نے دو مہاراجوں کو گود میں کھلایا تھا۔ اور اس تمام وقت میں اُس کی داڑھی سفید ہو گئی تھی۔

'ہمیں تمھارے جیسے وفادار اور مضبوط دل کے آٹھ آدمیوں کی اور ضرورت ہے۔' پھول متی نے جواب دیا۔

'جو آ گیا ہو، سرکار۔' وفادار بوڑھے ملازم نے جواب دیا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا، آٹھ ملازموں کو ساتھ لیے ہوئے۔

ایک تو مہارانی کا ملازم خاص تھا جو اُن کو وقت پر کھانا دیتا تھا اور موٹر میں ڈرائیور کے پاس بیٹھ کر جاتا تھا۔ ہر کھانا اور شراب پہلے وہ چکھتا تھا۔ یہ اُس کا کام تھا۔ وہ بھی اصل راجپوت تھا۔ نام تھا سردار سنگھ۔

ایک ہٹے کٹے جسم کا مگر چھوٹے سے قد کا بوٹا سنگھ تھا جو مہارانی صاحبہ کا آبدار تھا۔ یعنی وقت بے وقت اُن کو پانی چاہیے تو فریج میں سے نکال کر دیتا تھا۔ ویسے بار کی چابیاں بھی اُس کے پاس رہتی تھیں اور شراب وہی پلاتا تھا۔ کوئی دعوت ہوتی تھی تو وہ مہارانی کی کرسی کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔

ایک مہارانی کا خاص ڈرائیور جیکسن ٹامس تھا جو اُن کی امپالا چلاتا تھا جو مہارانی کی خاص گاڑی تھی اور جس پر وہ اِس شان سے یونی فارم پہن کر بیٹھتا تھا کہ ڈرائیور نہیں اصل مالک ہی معلوم ہوتا تھا۔

مہارانی کے دو خاص نوکر تھے۔ ہمت سنگھ اور دلاور خاں۔ جو اُس کے باڈی گارڈ تھے۔ یہ پہلے مہاراجا کے باڈی گارڈ ہوا کرتے تھے۔ اُن کے دیہانت کے بعد پھول متی کو ورثے میں ملے تھے۔ دونوں جیب میں پستول رکھتے تھے اور ذرا سا بھی کھٹکا ہوتو اُن کے پستول فوراً نکل آتے تھے۔ اُن کو کافی تنخواہ ملتی تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں کوئی مہارانی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

مہارانی نے اُن سے کہا کہ اُن کے پستولوں کی آج ضرورت نہ ہوگی۔ وہ دونوں اپنے پستول مہارانی کے پاس رکھوا دیں۔

کسی قدر ہچکچاہٹ سے انھوں نے اپنے پستول مہارانی کی تحویل میں دے دیے اور مہارانی نے نہایت اطمینان سے اُن کو اپنی لوہے کی سیف میں بند کردیا۔

دو کہار تھے۔ رُلدو اور منگو۔ جو مہارانی کی پالکی اُٹھانے کے لیے مقرر تھے۔ یہ ذات کے اہیر تھے مگر پہلوان تھے اور چار چار من وزن اٹھانے کے قابل تھے۔ صرف ایک بار اُن کی پالکی استعمال ہوئی تھی جب کہ پھول متی کی شادی مہاراجا صاحب سے ہوئی تھی۔ لیکن اُن کو حکم تھا کہ اپنے آپ کو تیار رکھیں۔ نہ جانے کس وقت مہارانی صاحبہ کو اُن کی خدمات کی ضرورت پڑ جائے۔ اس لیے اُن کا کام کھانا پینا اور اپنی پالکی کی دیکھ بھال تھا۔

آٹھواں آدمی دُبلا پتلا اور سوکھا تھا۔ کسی طرح بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں تھا مگر اُس کو ساتھ رکھنا ضروری تھا کیونکہ وہ مہارانی کا راج جیوتشی تھا۔ جس کی رائے کے بغیر مہارانی کوئی کام نہیں کرتی تھی۔

سب سے پہلے وہ نواں آدمی ہی بولا: 'مہارانی جی! یہ سمے کسی گمبھیر کاریہ کے لیے اشُبھ ہے۔ راہو اور کیتو دونوں کا ملن ہونے والا ہے جو کسی بھی راج کاریہ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

مہارانی نے جواب دیا' جیوتشی جی یہ کاریہ تو آج ہی اسی وقت کرنا ہوگا۔ ورنہ ہمارے دشمن کل صبح ہم پر دھاوا بولنے والے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے خزانے کو اس وقت کسی سورکشِت جگہ نہ چھپایا تو کل وجئے نگر کے سارے ہیرے جواہرات، سارا سونا چاندی جو پیڑھیوں سے راجے مہاراجوں نے اکٹھا کیا ہے اُس پر بھارتیہ سرکار قبضہ کرلے گی۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی

ساری دولت انکم ٹیکس والوں کو ہتھیانے دیں۔؟'

پھول متی راجوں مہاراجوں کی کٹھن بھاشا بولنے کی کوشش تو کرتی تھی لیکن، پھر اخیر میں اُسے اپنی بمبئی کی فلمی دنیا کی سیدھی سادی زبان پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

اُس نے بڑے کڑے طریقے سے کہا: 'چلو۔ اب یہ بکسے اٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر اُس نے بڑے ڈرامائی انداز میں (آخر وہ ایک ایکٹریس تھی) ایک دروازہ کھولا جس کے پیچھے دس بارہ ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔ ہر ٹرنک آہنی تھا اور اُس میں ایک بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔ مہارانی نے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک صندوق کا تالا کھول کر اُس کا ڈھکنا کھول دیا تو سب کی آنکھیں ہیرے جواہرات سے چندھیا گئیں۔

'نہیں ہم بھارت سرکار کو ان سب پر قبضہ کرنے نہیں دیں گے۔'

مہارانی نے رانی جھانسی کی شان سے کہا کہ جیسے مہارانی لکشمی بائی کہتی تھی۔ 'ہم جھانسی پر انگریزوں کا قبضہ نہیں ہونے دیں گے۔' 'ہم' اُس نے اس طرح کہا جیسے وہ نو آدمی اُس کے سیوک نہ ہوں بلکہ اس سازش میں برابر کے شریک ہوں! دوسرے لمحے میں لوہے کے صندوق کا پٹ بند ہو گیا اور اُس میں تالا لگا دیا گیا۔

○

دوسرا باب

9۔ لاشیں

جب سب لوگ سامان اُٹھانے کو آگے پہنچے تو پالکی کے اہیروں کو یہ ٹرنک اُٹھانے میں دقت نہ ہوئی۔ حکم ملتے ہی دو دو آدمیوں نے ایک ایک ٹرنک کو اُٹھا لیا لیکن اس سب سامان کو کہاں لے جانا تھا یہ اُن کو ابھی نہیں معلوم تھا۔

مہارانی پھول متی نے حکم دیا: 'اُس سرنگ سے چور دروازے کو جاؤ اور یہ سب صندوق ہماری ٹرک میں رکھ دو اور خود اندر بیٹھ جاؤ اور باقی احکام کے منتظر رہو۔ ہانپتے کانپتے اتنے وزنی سامان کو اٹھا کر سب لوگ لے چلے۔ دو پھیرے کرنے تھے۔ سرنگ ایک گیراج میں جا کر نکلی۔ جہاں وہ ٹرک کھڑی تھی جو شکار کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس لیے اُس میں چاروں طرف سے آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ جب سامان اندر رکھ دیا گیا تو مہارانی کا حکم ملا۔ 'اندر بیٹھ جاؤ تم بھی، یہ آخری حکم جیکسن کے لیے تھا۔ 'میں خود ڈرائیو کروں گی۔'

ڈرائیونگ سیٹ پر اکیلی پھول متی بیٹھی اور بیٹھنے سے پہلے ایک بجلی کا بٹن دبایا جس سے گیراج کا دروازہ آپ سے آپ اوپر اُٹھ گیا۔ یہ راستہ محل کے پیچھے نکلتا تھا۔ ٹرک باہر نکلتے ہی وہ

آپ سے آپ بند ہو گیا۔ جیکسن کو اطمینان تھا کہ مہارانی بہت اچھی ڈرائیور ہے۔ چند ہی منٹ میں وہ اور اُن کی ٹرک سڑکوں پر ہوتی ہوئی شہر سے باہر نکل آئی اور اب وہ ریگستان کی طرف پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگے جا رہے تھے۔

سڑک چھوڑ کر اب ٹرک ریگستان میں سے جا رہی تھی۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ مہارانی سے پوچھے ہم کہاں جا رہے ہیں۔ مگر بوڑھے جیوتشی نے چاند اور ستاروں سے اندازہ لگا لیا کہ ٹرک پچھم کو جا رہی ہے۔ مگر اُس نے یہ کسی کو نہیں بتایا۔ سب لوگ دم بہ خود بیٹھے رہے۔ اُن کے دل میں مہارانی کے لیے وفاداری کا ایک جذبہ ضرور تھا کہ وہ جانتے تھے کام خطرے کا ہے، جوکھم کا ہے۔ اس کام میں وہ مہارانی کے شریک ہیں۔ وہ پوری طرح سے متفق تھے کہ مہارانی کو اپنا خزانہ گورنمنٹ آف انڈیا کے انکم ٹیکس افسروں کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کریں؟ سارے راجوں مہاراجوں کی طرح اُن کے سیوک بھی گورنمنٹ کے خلاف تھے۔ انکم ٹیکس کے خلاف تھے۔ خزانہ جمع کیا، راجوں مہاراجوں نے۔ یہ بھی کوئی انصاف تھا کہ اسے اُٹھا کر انکم ٹیکس والے لے جائیں (کیسے جمع کیا تھا اس کے بارے میں نہ انھوں نے کبھی سوچا تھا نہ یہ جاننے کی کوئی خاص غرض تھی!) ضرور اُسے چھپانے کے لیے ریگستان میں کوئی جگہ مہارانی جی نے مقرر کی ہوگی جہاں اُسے چھپا دیا جائے گا۔ شاید کوئی قلعہ ہوگا یا کوئی گڑھی ہوگی۔ خیر جو جگہ بھی ہوگی جلد انھیں معلوم ہو جائے گا۔ مگر مہارانی تو ٹرک کو پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔ دو میل ایک طرف کو جاتی تھی تو تین میل دوسری طرف کو۔ اُس کے ٹائروں کے نشان ہوا میں اُڑتی ہوئی ریت سے مٹتے چلے جا رہے تھے۔ اسی راستے سے واپس آنا مشکل ہوگا مگر ناممکن نہیں تھا، کیونکہ راج جیوتشی کی نگاہیں ستاروں پر جمی ہوئی تھیں اگرچہ اُس کو بھی مشکل پڑ رہی تھی۔ ستارے بھی ان چکر پھیریوں میں گم ہوتے جا رہے تھے۔

آخر کار ایک جگہ پر رُک کر مہارانی نے کہا: 'مجھے لگتا ہے انکم ٹیکس والے پولیس ہمارے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔ کہیں وہ لوگ گولیاں نہ چلا دیں۔ ممکن ہے کوئی زخمی ہو جائے۔ اس پر بوڑھے راجپوت گرنام سنگھ نے کہا۔ 'آپ فکر نہ کریں سرکار۔ اگر آپ اور آپ کے خزانے کی رکھشا کے لیے ہماری جانیں بھی چلی جائیں تو کوئی پرواہ نہیں۔'

'مجھے تم سے یہی اُمید تھی گرنام!' مہارانی نے کہا۔

'میں تم سب سے کہوں گی کہ کوئی آواز نہ ہونی چاہیے۔ میں اب موٹر کی لائٹ بجھانے والی ہوں، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ موٹر کی روشنیاں بہت دور سے نظر آجاتی ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی ہیڈ لائٹس اور ٹیل لائٹ بُجھا دی اور صرف چاند ستاروں کی روشنی میں ٹرک دوڑانی شروع کر دی مگر ٹرک کے چلنے کا انداز وہی رہا۔

یہاں تک کہ جیکسن نے اپنی ریڈیم والی چمکتی گھڑی میں دیکھا کہ رات کا ایک بج گیا ہے۔ اُس نے اندازہ لگایا۔' ہم چھ گھنٹے سے چل رہے ہیں۔ کم سے کم ہم دو سو میل تو ضرور آ گئے ہیں۔ مگر ان چک پھیریوں سے اصل میں وجئے نگر سے کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر بھی سو میل دور تو ہو گئے ہوں گے۔''

لق و دق ریگستان کے بیچ میں دفعتاً بریک لگنے کی کرخت آواز آئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ، جس سے سوتے بھی جاگ پڑے، دفعتاً انھیں معلوم ہوا کہ ٹرک ٹھہر گئی ہے اور مہارانی صاحبہ ریت کے سمندر میں کھڑی ہیں اور اُن کے ہاتھ میں اسٹین گن ہے۔

'چلو جلدی کرو۔ وقت بہت کم ہے۔' ٹرک کا دروازہ کھول کر وہ باہر آئے۔ ایسا لگا جیسے جیل خانے کی قید سے چھوٹے ہوئے قیدی ہوں۔ بھاری بھاری بکسے انھوں نے جیسے بھی ہوا اُٹھائے اور اُن کو باہر نکالا۔ ایک جگہ اُن کا ڈھیر لگا دیا۔

اب مہارانی نے انھیں حکم دیا۔ چلو یہ صندوق دفن کرنے کے لیے ایک گڈھا کھودنا شروع کرو اور یہ کہہ کر اُس نے اندر سے نو پھاوڑے نکالے اور اُن کو اپنے سیوکوں کی طرف پھینکا۔

سیوک تو مہارانی کے اشارے پر اپنی جان دینے کے لیے تیار تھے۔ پھاوڑے اُٹھا کر انھوں نے ریت میں گڈھا کھودنا شروع کر دیا۔

کوئی ایک گھنٹہ لگا کافی گہرا گڈھا کھودنے کے لیے۔

جب مہارانی گڈھے کی گہرائی سے مطمئن ہو گئی تو اُس نے حکم دیا۔ بس کافی ہے۔ اب یہ صندوق اس میں رکھو اور اوپر سے ریت بھر دو۔

صندوق پھر اُٹھائے گئے اور اُن کو گڈھے میں دفن کر دیا گیا اوپر سے ریت پھاوڑوں سے

اُٹھا اُٹھا کر ڈال دی گئی۔ چند منٹ میں خزانہ غائب ہو گیا اور اُس کی بجائے ایک قبر تیار ہو گئی خزانے کی۔

'نہیں نہیں یہ ٹیلہ نہیں چاہیے۔ شبہ ہوگا کسی کو۔ بالکل سپاٹ کر دو اسے۔'

سیوکوں نے پھر اپنے پھاوڑے سنبھالے اور زمین کو ہموار کر دیا۔

'شاباش۔ اب تم اُدھر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور دیکھتے رہو کوئی دشمن کا آدمی نہ آنے پائے اِدھر!'

سب منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک لائن میں۔

'آپ نچنت رہیے حضور..... گرنام سنگھ نے کہنا شروع کیا۔ اور جیوتشی نے جو ستاروں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

'ستارے کہہ رہے ہیں حضور یہ بڑی اشبھ گھڑی ہے.....'

اُن دونوں کے فقرے ادھورے ہی رہ گئے۔

ایک تڑاخوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ سوچ سکیں کیا ہو رہا ہے اسٹین گن کی گولیاں کھاتے گئے اور گرتے گئے۔ جیوتشی کو گولی سب سے اخیر میں لگی۔ اتنے میں وہ مڑ چکا تھا اور مہارانی کو اسٹین گن سے گولیاں برساتے دیکھ رہا تھا۔

اُس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

'حضور۔ یہ کیا کر رہی ہیں.....؟' ہاتھ کا اشارہ مہارانی کی طرف بھی تھا اور جہاں وہ کھڑی تھی وہیں دبے ہوئے خزانے کی طرف بھی۔ ایک گولی اُسے بھی لگی اور وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔

نو وفادار سیوک اب نو لاشوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

گرنام سنگھ وفادار بوڑھا۔

سردار سنگھ (اب مہارانی کو کھانا چکھ کر کون دے گا؟)

بوٹا سنگھ۔ (مہارانی کا بار کون کھولے گا اور کون اُن کو شراب دیا کرے گا۔؟)

جیکسن ٹامس (مہارانی کی امپالا اب خود اُسے ڈرائیو کرنا ہوگی)

ہمت سنگھ اور دلاور خاں (اب مہارانی کی حفاظت کون کرے گا؟)

رُلدو اور منگو۔ (اب مہارانی کی وہسکی کون اُٹھائے گا؟)
اور نواں راج جیوتشی۔ (اب مہارانی کو کون بتائے گا کہ کون سی گھڑی شُبھ ہے اور کون سی اشُبھ؟)

نو وفادار سیوک اب ریت پر مردہ پڑے تھے۔ سب کی کمر چھلنی ہوگئی تھی۔ اور اتنی جلدی یہ سب کام ہوگیا تھا کہ مرتے دم تک اُن کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ گولیاں کہاں سے آئی ہیں اور کس نے چلائی ہیں۔ اُن میں سے اکثر تو بھارت سرکار کو کوستے ہوئے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن کو دور دور بھی یہ خیال نہیں تھا کہ یہ مہارانی نے اُن کی سیوواؤں کا صلہ دیا ہے!

○

تیسرا باب

ڈاکو

ڈاکو شیطان سنگھ کا اصل نام مہادیو سنگھ تھا لیکن وہ شیطان کے نام سے مشہور تھا کیونکہ اس کی ساری حرکتیں شیطانی تھیں۔ کسی زمانے میں وہ ایک چھوٹے موٹے زمیندار کا بیٹا تھا لیکن اس کے باپ کی سب زمین ساہوکار بھگوان رائے کے پاس رہن رکھی تھی۔ اس نے کورٹ سے ڈگری لے کر مہادیو سنگھ کے باپ کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا اور مہادیو سنگھ کا پریوار بے جائیداد اور بے گھر ہو گیا۔ اس کی ماں نے کنوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ باپ سنیاس لے کر ہری دوار چلا گیا۔ رہ گیا مہادیو سنگھ۔ وہ نوجوان تھا۔ رگوں میں راجپوت خون تھا دیکھنے میں اچھا ہٹا کٹا تھا۔ گھوڑے یا اونٹ پر بیٹھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی راجکمار ہو۔ باپ کی جائیداد ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہ دوسروں کی جائیداد پر ڈاکے ڈالنے لگا اور آہستہ آہستہ شیطان سنگھ بن گیا۔

کہتے ہیں شیطان سنگھ نے آج تک کسی غریب کو نہیں لوٹا تھا۔ غریبوں کے پاس تھا ہی کیا لوٹنے کے لیے۔ ہاں راجہ کے افسروں سے اور ساہوکاروں سے اس کی پرانی دشمنی تھی۔ ان کے یہاں وہ ڈاکہ ڈالتا تھا اور جب ڈاکہ ڈالتا تھا پہلے سے اطلاع دے کر۔ ساہوکار اور ان کے کارگزار ان کے خزانوں کی لاکھ حفاظت کرتے لیکن شیطان سنگھ اپنے ساتھیوں کو لے کر اونٹوں یا گھوڑوں پر سوار دن یا رات

میں پہنچ جاتا اور چھاپہ مار کر جو ہاتھ لگتا وہ اٹھا لے جاتا تھا۔

دو مہینے پہلے وہ ایک ساہوکار کی بیٹی کو اٹھالایا تھا جو اس سے محبت کرتی تھی اور جس نے خبر بھیج کر شیطان کو بلایا تھا۔ اس کے لیے گوری کی محبت ایک مسئلہ بن گئی تھی کیونکہ اس نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ وہ تو جہاں موقع ملتا تھا اپنے جذبات کی پیاس بجھالیتا تھا لیکن گوری پڑھی لکھی تھی، خوب صورت تھی اور مزاج دار تھی۔ اس کی دلیری اور بہادری کے کارنامے سن سن کر اس پر فریفتہ ہو گئی تھی اور اب بھی اس سے عشق کرتی تھی۔ دو چار دن تک تو شیطان اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ رات دن گوری کی خاطر و مدارات میں لگا رہا، لیکن پھر اس نے سوچا اس طرح تو میں بھوکا مر جاؤں گا۔ گھر سے نہ نکلوں گا تو کھاؤں گا کیا۔ دل پر جبر کر کے وہ گوری سے جدا ہوا تھا حالانکہ گوری کہتی تھی مجھے بھی اپنی ٹولی میں لے لو اور ایک گھوڑا دے دو لیکن شیطان اپنے ساتھیوں میں اپنی جگ ہنسائی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ عورتوں کو ڈاکوؤں کی ٹولی میں لینے کے خلاف رہا تھا۔ اب اگر اس نے اپنا بنایا ہوا قانون توڑ دیا تو اس پر سب ہنسیں گے اور یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے گوری کو بتایا کہ وہ تین چار دن کے لیے جا رہا ہے اور وہ اس کے ساتھ نہیں آ سکتی۔ گوری نے کہا لیکن دیکھنا کسی عورت پر نہ ریجھ جانا ورنہ میں تمھیں گولی مار دوں گی،، شیطان نے ہنس کر کہا۔ تمہاری نظروں کے تیر سے گھائل ہو چکا ہوں۔ اب مجھ پر کسی عورت کا جادو نہیں چل سکتا لیکن گوری نے پھر اسے یاد دلایا تھا،، یہ ہنسی کی بات نہیں ہے، شیطان، میں ساری دنیا کو چھوڑ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ اگر مجھے پتہ چلا کہ تم کسی عورت کی باتوں میں آئے تو میں قسم کھاتی ہوں میں تمھیں اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گی،، اچھا بابا مار لینا، شیطان نے ہنس کر کہا اور اپنی ٹولی کو لے کر چلا آیا۔

مہارانی پھول متی جورات کو اتنی اچھی کار ڈرائیو کر رہی تھی اس وقت راستہ ہی نہیں بھول گئی تھی اسے پیاس بھی لگی تھی۔ لیکن ریت کے اس سمندر میں پانی کہاں؟ پانی ساتھ رکھنے کا اسے یا اس کے سیوکوں کو خیال ہی نہ آیا تھا۔ دو پہر ہو جانے کے بعد بھی رانی ریگستان سے نہ نکل سکی تھی۔ جدھر بھی رخ کرتی، ہر طرف ریت کے ٹیلے کھڑے نظر آتے لیکن ہوا ان کی شکلیں بدل رہی تھی۔ ابھی ابھی وہ ریت کے پہاڑ تھے۔ چند ہی منٹ میں ریگستان کی تیز ہوا انھیں سپاٹ کر دیتی اور ٹیلے دوسری طرف بن جاتے۔

راستے میں اسے ایک کھنڈر گاؤں بھی ملا۔ وہاں کا کنواں بالکل سوکھا پڑا تھا۔ لوگ پانی نہ ہونے کی وجہ سے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ گاؤں کے کھنڈروں میں وہ پریشان پھر رہی تھی۔ منہ پر کا میک اپ اب پگھل رہا تھا۔ بالوں میں اڑتی ہوئی ریت کی افشاں چھڑکی ہوئی تھی۔ موٹر کے شیشے میں اس نے اپنی صورت دیکھی تو ڈر گئی۔ یہ کون بڑھیا ہے جس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہیں اور جھریوں میں پسینے اور ریت سے کیچڑ املا ہوا ہے۔ ایک رات میں اس کے خضاب سے لگے سیاہ بال پھر سفید ہو گئے تھے۔ اب تو اس سے چلا بھی نہ جاتا تھا۔ اتنے میں ایک گولی چلنے کی آواز آئی۔ جب بھاگ کر ٹرک کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ ایک گولی ٹرک کے اگلے ٹائر میں لگی ہے جس میں سے ہوا نکل رہی ہے۔

"یہ گولی کس نے چلائی؟ اس نے ٹائر کی حالت کو دیکھ کر سوچا۔ جیسے کسی نے اس کے اَن سنے سوال کا جواب دیا ہو۔ شیطان سنگھ کی آواز آئی۔ شیطان سنگھ نے۔ تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کرنے آئی ہو؟ اس کے سامنے گھوڑے پر سوار مشہور ڈاکو شیطان سنگھ تھا۔ وہ بے حد خوب صورت تھا۔ مہا رانی کے کانوں میں اس کی مردانگی کے سنے ہوئے قصے گونجنے لگے لیکن ڈاکو نے مہارانی کو نہ پہچانا تھا۔ پھر وہ بولی۔ ہم یہاں کیوں آئے ہیں اس سے کیا غرض۔ تم کون ہوتے ہو مہارانی پھول متی سے سوال و جواب کرنے والے؟ اوہو تو آپ ہی مہارانی پھول متی ہیں؟ شیطان ڈاکو نے مہارانی کے چہرے پر جھریاں پڑی دیکھیں۔ اس کے سفید بالوں کو دیکھا جو اس کے سینے کے ابھاروں کو سہارا دے رہے تھے۔ کیا یہ وہ حسین عورت ہے، جسے شیطان نے گھوڑے پر سوار وجے نگر کے ایک پارک میں دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کئی بار وہ اس کے خوابوں میں آئی تھی۔ مدت تک اس کے ذہن و احساس پر چھائی رہی تھی لیکن جب سے گوری اس کی زندگی میں آئی تھی، مہارانی کے بھگانے کے خواب آنے بند ہو گئے تھے لیکن اس وقت اسے اس حالت میں دیکھ کر شیطان پر شیطان سوار ہو گیا۔ اس وقت سوال یہ نہیں تھا کہ مہارانی کا حسن نا قابل تسخیر تھا، بلکہ اس کا رتبہ، اس کا دبدبہ شیطان کی مردانگی کو جیسے آواز دے رہا تھا۔ تم مجھے حاصل نہیں کر سکتے۔ تم میرے قابل نہیں ہو۔

یہ شیطان کے لیے ایک چیلنج تھا جس کا جواب اسے دینا تھا۔ شیطان نے کہا، مہارانی ہوں گی تو اپنے گھر کی ہوں گی۔ یہ ریگستان شیطان کی راجدھانی ہے، یہاں جو آئے گا اسے میرے رحم و کرم کی بھیک مانگنی ہو گی۔ میں اور تمہاری بھیک مانگوں؟ معلوم ہوتا ہے تم ہمارے غصے سے

واقف نہیں ہو۔ میرا ایک باڈی گارڈ بھی یہاں ہوتا تو تمھیں اس گستاخی کا مزا چکھا دیتا لیکن وہ باڈی گارڈ ہے کہاں؟ شیطان نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کہیں مہارانی کے محافظ ریت کے ٹیلوں کے پیچھے نہ چھپے ہوں لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ مہارانی نے شیطان کو ڈرانے کے لیے آواز دی، ہمت سنگھ، دلاور خاں، لیکن آواز ریت کے ٹیلوں سے ٹکرا کر لوٹ آئی اور کوئی نہ آیا۔ پھر تو شیطان سنگھ شیر ہو گیا، مہارانی تم وہاں ان کھنڈروں میں جانا پسند کرو گی یا یہیں ریت کے بستر پر ہم ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنیں گے۔ مہارانی نے پھر اپنا غصہ دکھایا، کیا بکتے ہو؟ میں بکتا نہیں ہوں۔ تمہاری طرح فرماتا ہوں۔ میں تو تمھیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ اپنی پسند کی جگہ چن لو۔ اگر انکار کرو گی تو پھر سمجھ لو، یہیں ہوگا جو ہونا ہے۔ اب تو مہارانی کی آنکھوں میں مایوسی کا اندھیرا چھا گیا۔ وہ سوچنے لگی اگر میں نے اپنی حفاظت کے لیے ایک بھی آدمی زندہ رکھا ہوتا تو اس وقت وہ اس کی حفاظت کر سکتا تھا۔ اس نے تو اپنی اسٹین گن بھی ریت کے سمندر میں پھینک دی تھی کہ اب اس کا کوئی کام نہ تھا۔ وہ الٹے قدموں کھنڈرں کی طرف چلی۔ اب شیطان کے منہ پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ شیطان بھی گھوڑے سے اتر آیا۔ وہ مہارانی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا لیکن اس طرح کے اس کا منہ ایک دوسرے کی طرف تھا۔ شیطان لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ اب ان کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا تھا۔ شیطان کی گرم سانس مہارانی اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ اس سانس میں ہوس کی لپک تھی۔ اس سانس نے مہارانی کے جسم میں بھی آگ لگا دی۔ کھنڈروں میں پہنچتے ہی پھول متی نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ دیر نہ کرو شیطان، وقت بہت کم ہے لیکن ابھی شیطان کو اپنا بدلہ لینا تھا۔ نہیں اتنی آسانی سے یہ نہ ہوگا۔ تمھیں میری خوشامد کرنی ہوگی۔ میرے پیروں کو چھونا ہوگا، سمجھیں؟ مہارانی نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے التجا کی، شیطان پلیز، اب میری اور ہتک نہ کرو۔ پلیز،، نہ کروں؟ اچھا یہ کہہ کر شیطان نے مہارانی کو ایک ہاتھ پکڑ کر اٹھایا پھر دو جسم ایک ہو گئے۔ دونوں کی دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو گئیں۔ جب شیطان اپنے جذبات کی آگ بجھا چکا۔ تو اس نے مہارانی سے کہا، جب تمہارے جیون کی پھلواری میں ایک خوب صورت پھول مسکرائے تو یاد رکھنا۔ یہ نہ بھولنا وہ شیطان سنگھ کا بیٹا ہوگا۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو شیطان سنگھ میں تمھاری داسی بن کر رہوں گی، لیکن شیطان نے گڑگڑاتی ہوئی پھول متی کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ چل ہٹ تو تو اب جان کا جنجال بن گئی ہے۔

مجھے بوڑھی عورت سے سخت نفرت ہے۔ مجھے تو تیری ہیکڑی نکالنے میں دلچسپی تھی، تجھ میں نہیں۔ جا اور کوئی بوڑھا تلاش کر اپنی عمر کا یا اس سے بھی بڑا۔ وجے نگر میں ایسے بوڑھے بہت مل جائیں گے۔

یہ کہہ کر شیطان اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کو گنا نہیں کہ ان میں سے ایک آدمی کم تھا۔ وہ لایا تھا دس آدمیوں کو اور اس وقت صرف نو تھے۔ وہ دسواں اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا سیدھا، ان کے گاؤں کو چلا جا رہا تھا۔ وہ گوری کا جاسوس تھا۔ اس سے گوری نے کہا تھا اگر وہ شیطان کے شیطانی کرتوتوں کو آ کر اسے بتائے گا تو وہ سو روپے دے گی۔ گاؤں کے پاس وہ پہنچے تو دیکھا گوری ان کے سواگت کو پہلے سے کھڑی ہے لیکن شیطان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گوری کے ہاتھ میں بندوق ہے۔ کیوں شیطان؟ مہارانی کیسی لگی؟ شیطان نے اب اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ یہ خبر کس نے پہنچائی گوری کو؟ اب اسے بہادر سنگھ کی کمی محسوس ہوئی۔ اس نے دل ہی دل میں اسے کوسا اور جب جھوٹ بولنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو گوری سے صاف کہہ دیا۔ ارے تیری برابری کیا کرے گی وہ بڈھی مہارانی وہ تو.......... اپنا وعدہ یاد ہے نا؟ اور میرا وعدہ بھی؟ یہ کہہ کر گوری نے بندوق اٹھا کر لبلبی دبا دی۔ شیطان گولی کھا کر گھوڑے سے گر پڑا۔ اب گوری پاگل ہو گئی۔ اس نے بندوق اٹھا کر پھینک دی اور دوڑی شیطان کی طرف۔ شیطان کی چھاتی ہی سے نہیں اس کے منہ سے بھی خون نکل رہا تھا۔ گوری نے اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ جانی شیطان! تو نے یہ کیوں کیا؟ بول؟ تجھے مجھ سے پیار نہیں تھا نا؟ جو کچھ مجھ سے کہتا تھا وہ جھوٹ تھا نا؟ مہارانی کی گوری چمڑی پر فریفتہ ہو گیا؟ نہیں گوری پیار تو صرف تجھ سے تھا۔ اس کی تو ہیکڑی توڑنی تھی مجھے۔ اگر تو وہاں ہوتی تو تو بھی مجھ سے کہتی، شیطان اس کی ہیکڑی نکال دے۔ آخری وقت میں میں تجھ سے جھوٹ نہ بولوں گا۔

اس نے یہ کہا اور ایک آخری ہچکی آئی اور وہ مر گیا۔

اب گوری بندوق ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئی۔ بولو ساتھیو، اب مجھے کیا سزا دینا چاہتے ہو؟

ایک ڈاکو بولا شیطان سنگھ مر گیا۔ اب تو تم ہی ہماری سردار ہو تو اٹھاؤ شیطان کی لاش کو۔ یاد رکھو یہ تمھارا سردار تھا اس کا کریا کرم بڑی شان سے کیا جائے گا۔

O

چوتھا باب

بوڑھا

بوڑھا کٹھ پتلی والا کلو سر پر اپنی کٹھ پتلیوں کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کی کمر کے گرد ایک پٹی بندھی تھی۔ جس میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جب وہ چلتا تھا تو گھنٹیوں کی آواز دور تک جاتی تھی۔ مہارانی جواب پھر اپنی موٹر میں سے اسٹین گن لے کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جب گھنٹیوں کی آواز سنی تو اسٹین گن کا خونی منہ ادھر کر دیا جدھر سے آواز آرہی تھی۔ وہ گھنٹیوں کی آواز کو خطرے کا نشان سمجھتی تھی کیونکہ شیطان کی ٹولی کے اونٹوں کی گردن میں بھی ایسی ہی گھنٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔

بوڑھا کٹھ پتلی والا جو ریگستان میں پڑی نو لاشوں کو دیکھ کر پہلے ہی ہراساں ہو گیا تھا۔ اپنے گاؤں کی طرف جلدی جلدی قدم بڑھا رہا تھا۔ اس نے جب دور سے مہارانی کو بندوق ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑی دیکھا اور بندوق اپنی طرف تنی ہوئی دیکھی تو بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار راج محل میں کٹھ پتلیوں کا تماشہ مہارانی کے سامنے دکھایا تھا۔ اس لیے وہ مہارانی کو پہچانتا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہ مہارانی نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن بوڑھے کی جہاں دیدہ آنکھوں نے

دیکھ لیا تھا کہ مہارانی کے پینٹ اور پاؤڈر اور کالے بالوں کے نیچے بھی اس کا ہی چہرہ چھپا ہوا تھا۔

وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ مہارانی نے اسٹین گن سے گولیوں کی بوچھار کر دی لیکن نشانا لگانے کے لیے فاصلہ دور تھا۔ اس کے علاوہ شیطان سے جدا ہونے کے بعد مہارانی کے ہاتھ پاؤں اب تک قابو میں نہیں تھے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کہیں اسٹین گن سنبھالی جاسکتی ہے۔ بوڑھے نے اپنے قریب ہی گولیوں سے ریت اڑتی ہوئی دیکھی اور سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ وہ بھاگتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اپنے گاؤں میں، اپنے جھونپڑے میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ لیکن بے ہوش ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی بیٹی سونو کو آواز دے رہا تھا۔ بے ہوشی میں بھی اس کے سوکھے ہونٹ سونو، سونو پکارتے رہے۔ سونو اپنی سہیلیوں کے ساتھ دور کے ایک گاؤں میں پانی بھرنے گئی تھی۔ جب وہ اپنے جھونپڑے میں پہنچی تو باپ کو بے ہوش پڑا دیکھا۔ اس کے سر سے گھڑا گر کر ٹوٹ گیا لیکن سارا پانی ریت میں جذب ہونے سے پہلے اس نے تھوڑے پانی کا چھینٹا باپ کے منہ پر مارا۔ پانی پڑتے ہی بوڑھے کی آنکھیں کھلیں اور اس کے ہونٹ ہلے۔

سونو یہاں سے بھاگ چالاں۔ آپنی مہارانی پاگل ہوگئی ہے اور وہ تو منکا نے مار کا بھی ہے۔ میوں بھرت پور سے آؤ تو راستے میں نو منکاری لاشیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مہارانی مہارے اوپر بھی گولی دے میلی۔ وہ تو جان تھی بے ماتا ملتے بچائی یو۔ مگر پاگل مہارانی کا کائیں بھروسو۔ اٹھے بھی آوئی تو کوئی دھیرج نہیں۔ تو سٹ کے تیار ہو لے۔ رات کے اندھیرا ماں نکل بھاگ سیں۔"

سو رات ہوتے بوڑھے نے اپنے سر پر کٹھ پتلیوں کا ٹوکرا اٹھایا اور سونو نے اپنے اور باپ کے کپڑوں اور چیتھڑوں کا انبار اٹھایا اور دونوں ریگستان سے پرے جدھر سے ریل کی چھوٹی لائن بھرت پور جاتی تھی ادھر چل پڑے۔ بوڑھا کٹھ پتلی والا کلو ستاروں کے سہارے سفر کرنے کا عادی تھا۔ انہی پر بھروسہ کر کے چلتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح سویرے دور سے انھیں بھرت پور کا اسٹیشن اور چھوٹی لائن کی ریل دکھائی دی۔ ساری رات ریگستانی ہوا چلتی رہی۔ ہوا ریت کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے جاتی رہی۔ جہاں لاشیں پڑی تھیں ان کے اوپر ریت کا ایک ٹیلہ بن گیا۔ اس ریت کی قبر میں سے صرف بوڑھے جیوتشی کا ایک ہاتھ دبے خزانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نکلا رہا۔

اُس جگہ سے میلوں دور مہا رانی کی ٹرک ریت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ پہیوں میں گولیاں لگی تھیں۔ اب پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ چلنے کے قابل ہی نہ تھی۔ جب صبح ہوئی تو مہارانی کے منہ پر بالوں میں، سارے بدن پر ریت کا غازہ مل گیا تھا لیکن وہ اب بھی موٹر میں اسٹرینگ وہیل پر ایسے بیٹھی تھی جیسے موٹر چلا رہی ہو۔ وہیں راجستھان پولس نے مہارانی کو ٹرک سمیت گرفتار کرلیا۔ اب وہ بالکل پاگل ہوگئی تھی لیکن جب اس سے خزانے کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی، ڈھونڈ واسے۔ اسے میں نے سمندر میں ڈبو دیا ہے۔ سمندر میں غوطہ لگاؤ اور نکالو اسے؟

مہارانی کو پکڑ کر جے نگر واپس لایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے کہا یہ بالکل پاگل ہو چکی ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ نہ خزانے کا پتہ بتاتی ہے۔ اس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں۔ جب کبھی کوئی اس سے اس کے خزانے کا پتہ پوچھتا ہے تو خوفناک مسکراہٹ میں اس کے ہونٹ کھل جاتے ہیں...... ڈھونڈو۔ ڈھونڈ واسے اگر ڈھونڈ سکتے ہو۔

○

پانچواں باب

چار یار

بمبئی
اونچی اونچی عمارتیں۔
اوران عمارتوں کے نیچے غریبوں کی جھونپڑیاں۔
بے گھر فٹ پاتھ پر اپنے گھر بناتے تھے۔
فٹ پاتھ ہی پر سوتے تھے۔
فٹ پاتھ پر جیتے تھے۔
فٹ پاتھ ہی پر مرتے تھے۔
ایک فٹ پاتھ پر بوڑھا کٹھ پتلی والا کلو راجستھانی اپنا تماشہ کررہا تھا۔
اُس کے ٹوکرے میں ساری دنیا بند تھی۔
راجا
رانی

راجکمار

راجکماری

انگریز افسر

بینڈ بجانے والے فوجی

سیٹھ ساہوکار

غریب کسان

داروغا صاحب (بڑی بڑی مونچھیں)

داروغا صاحب کے ماتحت سپاہی

رانی کی پالکی

پالکی اٹھانے والے کہار

رانی کے سیوک

مورچھل جھلنے والے

چپراسی

ہرکارے

گانے والے

ناچنے والیاں

غرض یہ کہ دنیا کی اونچ نیچ سب اُس کے ٹوکرے میں تھی۔
لیکن اس وقت وہ ٹوکرے میں نہیں تھی۔ کٹھ پتلیوں کے اسٹیج پر آ گئی تھی۔

راجا کا دربار لگا تھا۔

رانی اپنے جھروکے میں سے دیکھ رہی تھی۔

چپراسی پنکھا جھل رہے تھے۔

ناچنے گانے والیاں ناچ گا رہی تھیں۔

کٹھ پتلی والا بوڑھا ناچ کی تال پر گھونگھرو بجا رہا تھا۔

سونو گانے والی کا گانا گا رہی تھی۔
اُس کی آواز میں عجیب جادو تھا۔
تھوڑی ہی دیر میں کافی بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔
صرف فٹ پاتھ والے ہی نہیں۔ دفتروں کے کلرک اور ان کے افسر بھی آ گئے۔
یہ سب کٹھ پتلی کا تماشا دیکھنے نہیں آئے تھے۔ سونو کی آواز کی کشش انھیں یہاں کھینچ لائی تھی۔
کچھ بدیشی ٹورسٹ بھی کھڑے فوٹو کھینچ رہے تھے — ان کے لیے کٹھ پتلیوں کا تماشا ایک نئی چیز تھا۔

گانے والے کی آواز میں عجیب جادو تھا۔ اس نے انھیں مسحور و مبہوت کر دیا تھا۔
لیکن یہ سب سونو کی آواز سن سکتے تھے۔ سونو کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔
وہ پردے کے پیچھے سے گا رہی تھی۔
لیکن جہاں سے وہ گا رہی تھی وہاں سے قریب میں ایک بلڈنگ تھی۔ اس بلڈنگ کی سب کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ہر کھڑکی میں سے دو چار سر نکلے ہوئے تھے۔ جو نیچے ہونے والا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہی تماشا نہیں جو اسٹیج پر باہر ہو رہا تھا۔ اسٹیج کے اندر بھی دیکھ سکتے تھے جہاں کٹھ پتلی والا بوڑھا اور اس کی لڑکی کٹھ پتلیوں کو نچا رہے تھے اور خود گا رہے تھے۔
مرد والا گانا بوڑھا گاتا اور لڑکی کی آواز میں اس کی بیٹی گاتی۔
تینوں سر ایک کھڑکی سے نکلے ہوئے تھے اور تینوں آنکھوں کا فوکس اس لڑکی کے چہرے پر تھا۔
وہ خوب صورت تھی اُس کی رنگت گیہواں تھی۔
لیکن اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، میلے تھے۔
تین لڑکوں میں سے ایک نے کہا۔ 'اگر اس لڑکی کو اچھے کپڑے پہنا دیے جائیں تو یہی بیوٹی کوئن بن سکتی ہے!' کہنے والا رابرٹ تھا جو ایک اخبار میں کمپوزیٹر کا کام کرتا تھا۔
بیوٹی کوئن کمپٹیشن کی خبر اُسی نے کمپوز کی تھی اور وہ جو خبر کمپوز کر رہا تھا اُس میں ذاتی دلچسپی ہونا اس کے لیے ضروری تھا۔
'بولی کا کیا کرو گے یہ تو راجستھانی بولتی ہے۔ جہاں منہ کھولا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔' یہ

ایک لمبا تڑنگا نوجوان تھا جو بستی کا رہنے والا تھا اور اپنے ڈیل ڈول کے بھروسے پر بمبئی میں فلم اسٹار بننے آیا تھا۔ لیکن کسی نے اُسے چانس نہیں دیا تھا۔ حالانکہ اپنا نام بھی اُس نے رلیا رام سے نرمل کمار رکھ لیا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ اگر اشوک کمار گنگولی سے نام بدل کر کامیاب ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں نرمل کمار بھی کامیاب نہ ہو۔

اب اُس کا تیسرا ساتھی بولا۔ "مائی فیئر لیڈی کے مسٹر ہگنز کی ضرورت ہو تو مجھے یاد کرنا۔ میں اس راجستھانی گنوار لڑکی کو سکھا پڑھا کر مہارانی بنا دوں گا۔" یہ کریم یا عبدالکریم تھا۔ فٹ پاتھ پر دکان لگا کر بنیان بیچتا تھا لیکن فلمی شاعر بننے کا سپنا دیکھتا تھا اور کیوں نہ ہو ایک سابق بنیان بیچنے والا آج دو ہزار فی گانا لیتا تھا! لکھنے پڑھنے کا اسے اچھا شوق اور ذوق تھا۔ اس لیے اس کمرے میں رہنے والوں کا خیال تھا، کوئی تعجب نہیں کہ وہ کسی نہ کسی دن دو ہزاری ہو جائے گا پھر ان تینوں کی چاندی ہوگی۔ کیونکہ تینوں کا معاہدہ تھا کہ جس کی جتنی آمدنی ہو، وہ سب اُس میں ساجھی ہوں گے۔ اُن کے کمرے میں رہتے تھے یہ تین ہی۔ لیکن ایک چوتھے ساتھی کی اُنھیں تلاش رہتی تھی۔ کیونکہ چوتھا کونا خالی پڑا تھا۔ اُس لیے اُنھوں نے باہر تختی لگا رکھی تھی۔ 'چار یار'۔ لیکن جو بھی آتا تھا اُسے یا تو یہ تینوں ناپاس کر دیتے تھے، یا وہ ان کی شرطیں سُن کر ہی بھاگ جاتا تھا۔ چار یار کمیون کا ممبر ہونے کی مندرجہ ذیل شرائط تھیں:

1. اقتصادی برابری۔ یعنی جتنی آمدنی ہوگی وہ سب مشترکہ خزانے میں جائے گی۔ اُس میں سے حسب ضرورت (جب سب اُسے ضرورت سمجھیں) نکالا جا سکتا تھا۔
2. پوشاک کی برابری۔ اُن کی اس 'کمیون' میں سب کے کپڑے مشترک تھے۔ چڈیوں اور بنیان کے سوا جو جس کا چاہے پہن سکتا تھا۔
3. کوئی بیکار نہ بیٹھے گا۔ جو کام بھی ملے گا اور جو تنخواہ یا محنتانہ ملے گا اُسے مشترکہ فنڈ میں لا کر جمع کرے گا۔ نفع نقصان میں سب برابر کے شریک ہوں گے۔
4. مشترکہ خط و کتابت۔ ہر ایک کا خط ہر ایک پڑھ سکے گا۔ کسی پرائیویٹ خط و کتابت کی اجازت نہیں تھی۔
5. اگر کسی کی دوستی کسی لڑکی سے ہوگی تو وہ فوراً دوسروں کو بتائے گا۔ باقی دونوں کی مرضی ہی

سے لڑکی سے دوستی کی جا سکتی تھی۔

6۔ کسی لڑکی کو 'چار یار' میں داخلے کی اجازت نہیں تھی، اس لیے کہ زر، زن، زمین ہی سے سارے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔

فی الحال یہ قوانین تینوں کے تحت الشعور میں تھے۔ کیونکہ اُن کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ صرف اپنی آنکھوں سے کٹھ پتلیوں کا تماشہ دیکھتے رہے۔

پہلے فراش آیا۔ اُس نے سارے اسٹیج پر جھاڑو دی۔

پھر سقہ آیا۔ اُس نے اپنی مشک سے سڑک پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔

پھر جنتا آئی اور وہ سڑک کے دونوں کنارے پر کھڑی ہو گئی۔ اُن میں کسان بھی تھے، ساہوکار بھی، تاجر بھی اور مزدور بھی۔

پھر راجا جی ہاتھی پر سوار آئے۔

رانی جی کی پالکی آئی۔

گھوڑ سوار فوج آئی۔

اُس کے بعد راجا جی کا دربار لگا۔

اُس میں گانے والیاں آئیں۔

گانے والیوں نے گانے گائے۔

ناچنے والیوں نے ناچ دکھائے۔

پھر دربار ختم ہو گیا۔

اب اور کیا کام تھا؟

جنتا سے ٹیکس وصول کرنا!

راجا کے گھوڑ سوار سپاہی اب گاؤں کی طرف روانہ ہوئے اور جنتا کے جھونپڑوں میں جا کر زبردستی ٹیکس وصول کیا۔

کلّو کٹھ پتلی والے کو نہیں معلوم تھا کہ ترقی پسند آرٹ اور لٹریچر کیا ہوتا ہے۔

وہ تو زندگی میں جو دیکھتا تھا وہی اُس کی کٹھ پتلیاں پیش کرتی تھیں۔

تماشہ ختم ہو گیا۔

اب وقت آیا پیسہ وصول کرنے کا۔ باپ بیٹی دونوں نے ہاتھ پھیلائے۔

بوڑھے کو کسی نے پانچ پیسے دیئے کسی نے دس پیسے۔

لیکن نوجوان لڑکی کو کم سے کم چونی ملی۔ ورنہ اٹھنیاں اور روپے دینے والوں کی کمی نہیں تھی۔

بعض لوگوں نے روپیہ دینے کے بہانے لڑکی کو ہاتھ لگانے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے اس صفائی سے روپیہ اڑا لیا کہ ہاتھ لگانے والا دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

پھر لوگ اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔ کچھ لوگوں نے اُس فُٹ پاتھ کا پتہ اپنے دماغ میں نوٹ کر لیا تا کہ 'بہ وقت ضرورت کام آئے۔'

جب فُٹ پاتھ سنسان ہو گیا تو بوڑھے نے اپنے پیسے اور لڑکی کی چونیاں اٹھنیاں اور روپے گنے، پورے ستاون روپے ہوئے! بوڑھے نے بھگوان کا شکریہ ادا کیا اور 'چار یار' کی کھڑکی میں سے تینوں سر غائب ہو گئے۔

''یار! یہ دھندا تو بُرا نہیں رہا۔ ہم بھی کٹھ پتلی کا تماشا شروع کر دیں۔ رابرٹ نے کہا۔

اور بستی کے بھیا عرف نرل کمار نے (جو ہیرو بننے کے خواب دیکھتا تھا لیکن کام ایکسٹرا ہی کا کرتا تھا) کہا: دیکھ یار میں اپنی کمپنی کے پروڈکشن منیجر سے کہوں گا کہ وہ اگلی فلم میں 'ڈریم سیکوئنس' کی بجائے کٹھ پتلیوں کا ناچ کیوں نہ رکھے۔ خرچ کم آئے گا اور آئیڈیا بالکل نیا تھا۔ اس لونڈیا کو بھی کوئی کام دے سکتے ہیں۔

'کیوں بے؟ عبدالکریم المتخلص بہ کریم نے کہا۔ تجھے کٹھ پتلیوں کی فکر ہے یا اس لونڈیا کی؟'

اس پر تینوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

'چلو بھئی اب اپنی پنچ میل کھچڑی پکا لیں۔' کریم نے کہا۔ میں نے اسٹوو میں تیل بھر دیا ہے۔ چل بھئی رابرٹ اپنا کمال دکھا۔

رابرٹ نے اسٹوو میں ہوا بھری اور دیا سلائی دکھائی۔ اگلے لمحہ چولہا جل گیا اور لگا سوں سوں کرنے۔

تب کریم نے اُس پر ایک بڑی دیگچی رکھی اور ایک مکھن کے بڑے ڈبے میں سے کاٹ کر

آدھا مکھن دیگچی میں ڈال دیا۔ جب یہ چھن چھن کرنے لگا تو رابرٹ نے کتری ہوئی پیاز ڈال دی۔ یہ بھی جب سرخ ہوگئی تو نرل نے کوئی سیر بھر چاول ڈال دیے اور لگا بڑا چمچہ گھمانے تاکہ مکھن چاولوں میں رچ جائے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد آدھی دیگچی پانی ڈال دیا اور دیگچی پر ایلومنیم کا ڈھکنا رکھ کر اوپر سے ایک پتھر رکھ دیا۔

'لو بھئی اب چاول تو آدھے گھنٹے میں تیار ہو جائیں گے۔ کیا کیا لائے ہو آج اس میں ڈالنے کے لیے؟

کریم نے کاغذ کا ایک پیکٹ نکالا جس میں مٹن کا کٹا ہوا قیمہ تھا۔

رابرٹ نے تین انڈے نکالے۔

نرل نے تین ٹماٹر۔ ایک جہازی سائز کی پیاز گٹھی اور ایک پیکٹ جمے ہوئے مٹروں کا۔
اب باری باری یہ سب اس دیگچی میں ڈال دیا گیا۔ انڈوں کو توڑ کر ان کے چھلکے الگ کیے گئے۔ ٹماٹر اور مٹن ایسے ہی ڈال دیے گئے۔ بعد میں نمک، کالی مرچیں اور پودینہ کاٹ کر ڈال دیا گیا۔

گھنٹے بھر میں 'پنچ میل کھچڑی' تیار ہوگئی اور تینوں نے اپنی اپنی پلیٹیں نکالیں اور اپنا اپنا حصہ لے لیا۔ کریم نے ہاتھ سے کھایا۔ نرل نے ایک پرانے چمچے سے اور رابرٹ نے اکلوتے کانٹے کا استعمال کیا۔

آج تو پنچ میل کھچڑی کمال کی بنی ہے! کل آلو والے پراٹھے بنائیں گے، کریم نے کہا۔
اور رابرٹ کھڑکی میں سے جھانک کر بولا۔ ارے دیکھو وہ کٹھ پتلی والا بوڑھا بھی اپنا کھانا کک COOK کر رہا ہے۔ اس کی ڈاٹر پھلکے سینک رہی ہے!

I WISH I COULD EAT ONE OF THE PHULKAS

واہ بیٹا! تو تو پھلکوں کی تعریف کرتے کرتے کھانے کے خواب بھی دیکھنے لگا! کریم نے کہا: کیا یہ لوگ یہیں فٹ پاتھ پر سوئیں گے؟

لگتا تو ایسا ہی ہے رابرٹ نے جواب دیا۔ جب ایک گھنٹے کے بعد سب سونے کے لیے تیار ہوئے تو انھوں نے آخری نظر نیچے فٹ پاتھ پر ڈالی۔

بوڑھا دیوار کی طرف سو رہا تھا اور لڑکی فٹ پاتھ کے کنارے پر۔ اتنے میں ایک موٹر آہستہ آہستہ

فٹ پاتھ کے پاس سے گزری اور اس میں سے ایک سیٹی کی آواز آئی۔ شاید یہ حضرت شام کو کٹھ پتلی کا تماشہ دیکھ کر گئے ہیں اور اپنا دیا ہوا روپیہ وصول کرنے آئے ہیں لڑکی ہڑبڑا کر اٹھی اور اپنے باپ (ہاں باپ ہی ہوگا کریم نے کہا) کے پاس گئی باپ سیٹی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً بستر بدل لیے۔ اب بوڑھا فٹ پاتھ کے کنارے پر سو رہا تھا اور لڑکی دیوار کے سہارے اس سے زیادہ حفاظت کا انتظام نہیں تھا

ہر ایک کے خواب میں کلو کٹھ پتلی والے کی بیٹی آئی۔ نرمل کمار نے سپنا دیکھا اسٹوڈیو میں جیسے ہی وہ داخل ہوا تو اس سے کسی ایکسٹرا نے کہا: ارے نئی ہیروئین دیکھی ہے ہماری؟ اس نے جب کہا نہیں تو دوسرے ایکسٹرا نے اشارہ کیا اسٹیج کی طرف، جہاں زرق برق لباس میں کٹھ پتلی والے کی لڑکی ناچ رہی تھی اور وہ مبہوت رہ گیا۔ کریم نے خواب میں دیکھا ایک عورت نقاب ڈالے کھڑی ہے، اس کے اوپر سے جب سات ریشمی نقابیں اتاری گئیں تو بیچ سے ایک کٹھ پتلی نکلی، جس کی شکل بالکل کٹھ پتلی والے کی بیٹی جیسی تھی۔ رابرٹ نے دیکھا، ایک بڑا چرچ ہے، جہاں یسوع مسیح کا مجسمہ سولی پر چڑھا ہوا ہے اور پاس ہی میری میگڈلین دوزانو ہے۔ جب وہ پاس گیا تو دیکھا کہ میری میگڈلین کی صورت بالکل کٹھ پتلی والی لڑکی کی طرح ہے۔ تینوں خواب ایک ہی وقت ٹوٹے جب ایک موٹر کے بریک لگنے کی بھیانک آواز آئی۔ پھر موٹر شور مچاتی ہوئی ریورس کی گئی۔ اس کے بعد موٹر تیز رفتاری سے غائب ہونے کی آواز! تینوں بیک وقت بیدار ہوکر کھڑکی کی طرف بھاگے اور نیچے دیکھا تو وہ لڑکی اپنے بابا کے کچلے ہوئے بدن کو گود میں لیے بیٹھی بابو، بابو کتھے چلے گئے؟ بین کر رہی تھی۔

○

چھٹا باب

اسمگلر

بھیکو بھائی کو بچپن ہی سے موٹروں کا شوق تھا۔

جب وہ پانچ برس کا بچہ تھا تو اس کے باپ نے اسے برتھ ڈے پر بیٹری سے چلنے والی ایک موٹر کھیلنے کے لیے دی تھی۔ جب وہ آٹھ برس کا ہوا تو باپ کے ساتھ امپالا میں بیٹھتا تھا اور اسٹیرنگ وہیل سنبھالنے کی پریکٹس کرتا تھا۔

جب وہ گیارہ برس کا ہوا تو باپ نے اسے ایک چھوٹی موٹر خرید کر دے دی اور ڈرائیور سے کہا کہ بھیکو بھائی کو موٹر چلانا سکھا دے۔ اس نے تین دن میں موٹر چلانا سیکھ لیا۔

باپ اسمگلنگ کرتا تھا لیکن اس زمانے میں اسمگلنگ کا دھندا کوئی برا کام نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بمبئی سوسائٹی میں سب جانتے تھے کہ پریم بھائی اسمگلنگ کرتا ہے۔

عبدالکریم بھائی اسمگلنگ کرتا ہے لیکن کوئی دروازہ اس کے لیے بند نہ ہوا۔ اور کیوں ہوتا؟ سب ہی اُس اسمگل کیے ہوئے مال کے خریدار تھے۔ کوئی اُس سے اسمگل کی ہوئی اسکاچ خریدتا تھا۔ کوئی اسمگل کیا ہوا کپڑا۔ کوئی گھڑی تو کوئی فاؤنٹین پین۔

بھیکو بھائی اٹھارہ برس کا ہوا (اُس وقت اُس کے پاس ایک مرسیڈیز گاڑی تھی) تو اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ بھیکو بھائی اُس کا تنہا وارث تھا۔ اسمگلنگ کا دھندا اُس کی گھٹی میں پڑا تھا۔

اپنے باپ کی اسمگلنگ کو بھیکو بھائی نے اور پھیلایا۔ اب وہ صرف باہر ہی کا مال نہیں منگاتا تھا بلکہ ہندوستان سے تاریخی نوادر اور آثارِ قدیمہ کے بُت اور سنگ تراشی کے نمونے باہر کے ملکوں میں بیچتا تھا۔ مراد آباد میں اُس نے ایک فیکٹری قائم کی تھی جو پیتل کی چیزیں بناتی تھی۔ جنہیں سال دو سال کے لیے زمین میں دفن کیا جاتا تھا تاکہ ان پر مٹی جم جائے اور زنگ وغیرہ لگ کر سچ مچ قدیم زمانے کی چیزیں لگیں۔ یہ دھندا کھلے بازار میں کیا جاتا تھا۔ بھیکو بھائی باقاعدہ بیجک بنا کر ان چیزوں کو اپنی ہی لندن کی کمپنی کو دس دس بیس بیس روپے میں بیچتا تھا۔ اور وہاں یہ چیزیں انٹکس کے نام سے سینکڑوں پاؤنڈ میں بکتی تھیں۔

اس دھندے سے بھیکو بھائی نے لاکھوں روپے ہندوستان میں اور لاکھوں پاؤنڈ سوئزرلینڈ کے بینکوں میں جمع کیے تھے۔ اِس طرح اُس نے اپنے باپ کی کمائی کو دس گنا کر دیا تھا۔ بمبئی میں اُس کا ایک ہوٹل تھا اور ایک ہوٹل لندن میں۔ بمبئی میں ایک ریستوران تھا اور ایک نیویارک میں۔ لُطف یہ تھا کہ گورنمنٹ نے اُسے 6 لاکھ کا قرضہ دیا تھا اور 4 لاکھ کا لائسنس، ہوٹل کا ساز و سامان باہر سے منگانے کے لیے۔ اُسے اس کے لیے ایک مہینہ دلی میں رہنا پڑا تھا اور پچاس ساٹھ ہزار خرچ کرنا پڑے تھے لیکن یہ سودا برا نہ تھا۔ کیونکہ بمبئی والا ہوٹل اُس نے چار لاکھ کا منافع کما کر کسی دوسرے کو بیچ دیا تھا اور اب اُس ہوٹل پر اُس کا صرف اتنا حق تھا کہ جب وہ لندن یا نیویارک سے ہندوستان آتا تھا تو ہوٹل کا بہترین سویٹ اُس کے لیے ریزرو رہتا تھا۔

لیکن اب بھیکو بھائی کے نام ہند سرکار کا وارنٹ نکلا ہوا تھا اور وہ نیویارک یا لندن میں رہ کر EXTRADITION کی کارروائی کو ٹال سکتا تھا لیکن وارنٹ نکلے ایک سال ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں وہ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا تھا۔

نیویارک میں اُس کی جان پہچان ایک CIA کے ایجنٹ کے ساتھ تھی۔ اُس نے اُسے دو چار کام کے آدمیوں سے ملا دیا تھا۔ اُن میں ایک تو جعلی پاسپورٹ بنانے کا ماہر تھا۔ دوسرا پلاسٹک

سرجری کا۔ پلاسٹک سرجری سے اُس نے اپنی شکل بدل لی تھی۔ ناک پکوڑا سی ہوگئی تھی۔ آنکھیں جو پیدائشی بڑی بڑی تھیں۔اب چھوٹی چھوٹی ہوگئی تھیں۔اب وہ ایک چینی، نیپالی یا کوئی منگولین معلوم ہوتا تھا۔ اس تبدیلی سے وہ اتنا خوش ہوا تھا کہ اُس نے نیپالی پاسپورٹ بنوالیا تھا، اور اُس پاسپورٹ کے سہارے وہ شان سے بمبئی ایئرپورٹ پر اُتر کر ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا اپنے ہوٹل پہنچا تھا۔ جہاں جنرل شمشیر جنگ کے نام سے اُس کے لیے سویٹ پہلے سے ریزرو تھا۔ شمشیر جنگ کے نام سے اُس سے ایک ہی غلطی ہوئی تھی۔ٹریولرس چیک جن کا ایک گڈا اُس کی جیب میں تھا، وہ بھیکو بھائی ہی کے نام کے تھے۔لیکن ہوٹل کے منیجر کو اُس نے جلد ہی اپنا راز دار بنالیا تھا اور اِس کے بعد اُسے کوئی دقت نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک لڑکی کی وجہ سے بمبئی آیا تھا۔لڑکی اُس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔لڑکی کا نام نیلا نائک نروانی تھا۔وہ بھی ایک اسمگلر کی بیٹی تھی، بے حد خوب صورت اور حسین تھی اور اُس نے بھیکو کو چیلنج کیا تھا کہ وہ ایک بار ہندوستان آکر بتائے تو وہ اُس کی ہوکر رہے گی۔ پھر وہ دونوں واپس چلے جائیں گے، لندن یا نیویارک یا ساؤتھ امریکہ کے کسی ملک میں۔ اپنی نئی شکل میں بھیکو نیلا کے گھر پہنچا تھا جہاں خفیہ پولیس چوبیس گھنٹے پہرہ دیتی تھی۔ اُنھیں حیرت ہوئی تھی ایک داڑھی والے نیپالی شمشیر جنگ کو وہاں آتے دیکھ کر۔ کیونکہ خفیہ پولیس کو نیلا اور بھیکو کے میل جول کا پتہ تھا اور اسی لیے وہ اس مکان کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے کہ بھیکو اُن کے جال میں گرے۔

جب نیپالی وہاں شام کو آیا تو انھوں نے دیکھا تھا وہ بہت خوش ہے۔ کیونکہ اب وہ نیلا پر اپنا حق جما سکتا تھا۔ وہ شرط جیت گیا تھا۔ ہندوستان میں وہ موجود تھا لیکن جب وہ دو گھنٹے کے بعد رات کو باہر نکلا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نیلا کو اُس کی نیپالی شکل پسند نہ تھی۔ حالانکہ اُس نے یقین دلایا تھا کہ اُس کا امریکن ڈاکٹر اُس کی کوئی بھی شکل بنا سکتا ہے جو نیلا کو پسند ہوگی، ویسی ہی شکل بنوالے گا وہ۔ لیکن نیلا نے اِس شمشیر جنگ سے محبت کا اظہار نہ کیا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ بھیکو بھائی اور نائک کی اسمگلنگ کے میدان میں عداوت تھی۔ نروانی نے اپنی بیٹی سے جاتے جاتے کہا تھا کہ بھیکو کو کسی طرح ہندوستان بلا کر اُسے گرفتار کرانا تمھارا اولین فرض ہے۔ اِس لیے جب شمشیر جنگ یہاں آیا اور موٹر سے اُترا تو نیلا نے پہلے ہی بمبئی سی بی آئی کو ٹیلی فون

کر دیا تھا کہ شمشیر جنگ کے نام سے جو آدمی رین بو ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے وہ بھیکو بھائی ہی ہے۔
اِدھر شمشیر جنگ نیلا کا ایک بوسہ لینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اُدھر سی بی آئی والے رین بو ہوٹل کے سویٹ میں شمشیر جنگ کی تلاشی لے رہے تھے۔ اُس کے بیگ میں سے بینک کے کاغذات نکلے تھے جو بھیکو بھائی کے نام سے تھے۔ اُس کے ٹریولرس چیک ملے تھے جو بھیکو بھائی کے نام سے تھے۔ اور تو اور اُس کے پرس میں ایک فوٹو رکھا ہوا تھا جو بھیکو بھائی ہی کا تھا۔ اب وہ اطمینان سے اُس کے سویٹ میں بیٹھ گئے کہ آتے ہی اُسے گرفتار کر لیں گے۔

لیکن ہوٹل کے منیجر نے (جو بھیکو بھائی ہی کا پرانا ملازم تھا) اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ اُس نے اپنے کاؤنٹر کے نیچے ایک خفیہ بٹن دبا دیا تھا جس سے ایک لال روشنی ہوٹل کے نیون سائن میں چمک اُٹھی تھی اور اس روشنی کو دور سے دیکھ کر بھیکو بھائی چوکنا ہو گیا تھا۔ رین بو ہوٹل پر روشنی چمکتی دیکھ کر وہ راج محل ہوٹل میں گیا تھا اور وہاں ایک ڈبل روم لے کر اُس نے بمبئی کی سب سے خوب صورت کال گرل کو فون کیا تھا اور ایک اسکاچ وہسکی کی بوتل منگوائی تھی اور کھانے کے لیے چکن تِکّے۔ اُس نے اور کال گرل نے اس بوتل کو ختم کر دیا تھا اور چکن تِکّوں کو بھی۔ بعد میں کال گرل نے لانگ ڈرائیو کی فرمائش کی تھی اور بھیکو بھائی اسکاچ وہسکی کے نشے میں چور فوراً تیار ہو گیا تھا۔

''بولو کہاں چلتی ہو؟'

'جہاں کہیں بھی لے چلو۔ بس یہاں سے کہیں دور!'

لیکن بھیکو بھائی پر تو اسکاچ کا نشہ چڑھتا جا رہا تھا۔'

وہ شہر کا چکّر لگاتا ہوا اُس فٹ پاتھ تک آ گیا جہاں کٹھ پتلی والا بوڑھا سو رہا تھا۔ کال گرل بولی: 'وہ جو سامنے فٹ پاتھ ہے نا وہاں میلے کپڑوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ اُس فٹ پاتھ پر موٹر چڑھا دو۔'

'یہ لو، میری جان!' اور یہ کہہ کر بھیکو بھائی نے موٹر اِدھر کر دی اور فٹ پاتھ پر گاڑی چڑھا دی۔ اُنہیں پتہ بھی نہ چلا کہ ایک بوڑھا اُن کی موٹر کے نیچے آ کر مر گیا ہے۔ لیکن بوڑھے کے لہو کی چند بوندیں اُن کے ٹائر سے چپک گئیں۔

وہ لہو جو ٹائر سے چپک گیا تھا اُس نے بھیکو بھائی کی موٹر کو 'سکڈ' کرا دیا۔ موٹر پھرکی کی طرح گھوم گئی۔ وہیل کو سیدھا کیا تو ایک کھمبے سے ٹکرائی اور وہیل پر ہی بھیکو بھائی ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

جب پولس آئی تو وہ کال گرل اتر کر لڑکھڑاتی ہوئی ایک ٹیکسی میں جا چکی تھی اور بھیکو بھائی کے جیبوں کی تلاشی لی گئی تو اس کے پرس میں سے وزیٹنگ کارڈ پر بھیکو بھائی کا نام اور پتہ چھپا ہوا تھا۔

شمشیر جنگ یعنی بھیکو بھائی کو آخیر تک معلوم نہ ہوا کہ ایک بے چارے بوڑھے راجستھانی کا لہو اُس کی موٹر کے ٹائر پر لگا ہوا تھا اور اُس نے اُسے مار ڈالا۔

جب چار یار کے تین نوجوان نیچے فٹ پاتھ پر پہنچے تو سونو باپ کی لاش کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ بین کر رہی تھی۔ باپو! باپو!! کتھے چلے گئے مُنے اکیلا چھوڑ کر۔

○

ساتواں باب

تین راکھیاں

تینوں یاروں نے مل کر بوڑھے کٹھ پتلی والے کلّو کا کریا کرم کیا۔

پولیس میں رپورٹ لکھوائی اور اُنھیں یہ جان کر کسی قدر تسلّی ہوئی کہ جس موٹر نے اُسے کچلا تھا وہ خود آگے جا کر ایک کھمبے سے ٹکرائی اور ٹوٹ گئی یہاں تک کہ اُس کا چلانے والا مر گیا۔ کسی آدمی کے مرنے سے اُنھیں خوشی نہیں ہوئی بلکہ 'شاعرانہ انصاف' کے اس مظاہرے سے اُنہیں اطمینان ہو گیا کہ بھگوان کے کام میں اِس معاملے میں کوئی دیر نہ ہوئی تھی۔ قاتل قتل کرنے کے دو چار ہی منٹ بعد اپنے کیے کی پوری سزا پا چکا تھا!

کریا کرم سے پہلے بوڑھے کی لاش کو ایک میلے کپڑے میں لپیٹ کر (جس پر کسی اور مُردے کا لہو، پیپ اور پسینہ لگا ہوا تھا) اور میونسپل مُردہ گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا تھا۔ جہاں خانہ پُری کرنے کے لیے اُس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا اور کارونرز کورٹ میں رپورٹ پیش کی گئی تھی۔ جہاں سے فیصلہ صادر کیا گیا تھا کہ ایک موٹر فٹ پاتھ پر چڑھ آنے سے بوڑھے کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور ہارٹ فیل ہو گیا۔ جس موٹر سے بوڑھے کی موت ہو گئی تھی وہ موٹر بجلی

کے کھمبے سے ٹکرا جانے سے اُس کا ڈرائیور بھی مر گیا۔ اُس کا نمبر کٹھ پتلی والے کے بعد اگلا ہی تھا۔ کم سے کم موت کے دھندے میں سب برابر تھے۔

کریا کرم کرتے ہوئے شام ہوگئی۔ اِس سارے عرصے سونو چپکے چپکے روتی رہی۔

تینوں 'یاروں' نے اُس سے کوئی اظہارِ ہمدردی نہیں کیا۔ صرف اُن کے ساتھ رہنے سے جو کچھ ہمدردی وہ پا سکتی تھی وہ اُس نے ضرور پائی۔ اُس کی ڈھارس بندھی رہی کہ بمبئی کے جنگل میں جہاں سوتا آدمی بغیر کسی بیماری کے بھی مر سکتا ہے وہ اکیلی نہیں ہے۔ لیکن یہ تو دن تھا۔ جب سونو اپنی دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ لیکن رات کو کیا ہوگا؟ کیا وہ اُس فٹ پاتھ پر سوئے گی جہاں غنڈے بدمعاش گھومتے رہتے ہیں۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی اُن کی ہوس بھری سیٹیاں سونو کو اچھی طرح یاد ہیں، باپ نہیں ہے تو اُسے فٹ پاتھ سے کوئی زبردستی اپنی کار میں ڈال کر لے جائے گا۔

جب وہ واپس آئے تو یہی سوال تینوں 'یاروں' کو بھی پریشان کر رہا تھا۔

'اچھا سونو ہم اب جاتے ہیں۔' کریم نے کہا۔

'ہمارے کمرے کی کھڑکی وہ اوپر ہی ہے۔' نرمل کمار نے کہا: 'جب ضرورت پڑے ہمیں آواز دے لینا۔'

اور رابرٹ نے کہا: اچھا گڈ بائی لٹل لیڈی۔'

سونو نے صرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

اُسے پتہ نہ تھا کتنے روپے اُنھوں نے خرچ کیے ہیں۔ (سونو بے چاری کو معلوم نہ تھا کہ مُردہ گاڑی میونسپلٹی کی طرف سے مُفت آتی ہے۔ اُس کا کوئی کرایہ نہیں دینا پڑتا۔)

تینوں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے۔

نرمل نے دروازہ کا تالا کھولا اور تینوں اپنے اپنے کونے میں بیٹھ گئے۔

دفعتاً رابرٹ نے کہا۔ 'وی آر بلڈی بوائز۔ ہم سُوّر کے بچّے ہیں!' یہ اُس کا تکیۂ کلام تھا۔

لیکن اِس بار نرمل نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ 'ہاں یار ہیں تو ہم اُلّو کے پٹھے۔'

اور کریم نے کہا۔ 'اُلّو کے پٹھے ہی نہیں ہیں۔ کمینے حرامزادے ہیں ہم! کسی انسان کی فکر ہی

نہیں ہے ہمیں۔'

نرل نے کہا۔' ہمارا ایک کونہ خالی پڑا ہے لیکن ہم اپنے برہمچاریہ کو قائم رکھنے کے لیے ایک کمزور غریب لڑکی کو انسانی درندوں کے اِس جنگل میں فٹ پاتھ پر اکیلی چھوڑ آئے ہیں۔'

کریم نے کہا۔، اس کا مطلب ہے کہ نرل نے اُس سے اتفاق کیا' کہ ہم میں انسانیت نام کو بھی نہیں ہے!'

'یار آئی ٹیل یو وی آر آل بلڈی بوائز'

'سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟' نرل نے پوچھا۔

کریم نے جواب دیا' پہلے تو ہمیں اپنے قانون بدلنے ہوں گے۔ قانون نمبر 4 جو کسی لڑکی کے اندر آنے کے بارے میں ہے ـــــ اُسے منسوخ کرنا ہوگا۔ اِس لڑکی کو ہمیں پناہ دینی ہے۔'

'رائٹ۔ ایبسو لیوٹ لی رائٹ!' رابرٹ نے زور سے کہا۔'فٹ پاتھ پر تو وہ نہیں رہ سکتی۔ دیٹ ول بی اے اسکینڈل!'

'لیکن لوگ کیا کہیں گے؟' کریم نے اُنہیں وارننگ دی۔' ہم تین مشٹنڈے اور ایک بے چاری لڑکی! اڑوس پڑوس والے عجیب عجیب باتیں کریں گے۔'

'ارے جہنّم میں جائیں پڑوس والے! میں سب کو جانتا ہوں۔ کہو تو سب کچا چٹھا کھول کے رکھ دوں اُن کا؟' نرل نے جواب دیا' دیکھو بھائی اپنا دل صاف ہونا چاہیے۔ کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ ہونی چاہیے۔'

'اپن کا دل تو صاف ہے۔' کریم نے کہا۔

رابرٹ نے صلیب کا نشان اپنی چھاتی پر بنایا۔ اپنا ہارٹ بھی بالکل صاف ہے ہار نبی روڈ کی طرح صاف ہے!'

'اچھا!' نرل نے کہا۔' تو کون جا کر بات کرے گا؟'

'ہم تینوں ساتھ ہی چلیں گے۔'

'لیس وَن فور آل اینڈ آل فور وَن۔' اُس نے تھری مسکیٹرز کا ڈائیلاگ دُہرایا۔

تینوں زینہ اُتر کر سوتو کے پاس پہنچے جو بیٹھی اپنے باپ کے پٹارے میں رکھی کٹھ پتلیوں کو

ٹھیک ٹھاک کر رہی تھی۔

'سونو جی! ہم آپ سے بات کرنے آئے ہیں۔' نرمل نے بات شروع کی۔

سونو نے گھنی پلکوں کو اُوپر اُٹھا کر اُن کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا۔

'جی' اُس نے کہا۔

کریم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ 'دیکھئے یہاں فٹ پاتھ پر آپ نہیں رہ سکتیں۔'

'کیوں؟' سونو نے غم زدہ آواز میں کہا۔

'اب آپ اکیلی ہیں اور یہ بڑا ظالم شہر ہے، ہم یہاں اوپر ہی رہتے ہیں، ہم آپ کو اپنے ساتھ لے چلنے کے لیے آئے ہیں۔'

'دیٹ آپ ہمارے کمرے میں آجائیں'

سونو نے خوفزدہ نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

نرمل نے جلدی سے کہا۔ 'دیکھئے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں خطرہ بہت ہے۔ ہمارے ہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم آپ کو اپنی بہن کی طرح رکھیں گے۔'

'بہن بنائے راکھو! ہمارا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔'

'ناؤ یو ہیو تھری برادر!' رابرٹ نے انگریزی کی ٹانگ توڑتے ہوئے کہا۔

'اب یہ سمجھو تمھارے تین بھائی ہیں۔' کریم نے اُس کا ترجمہ کیا۔

'بھیا دوج تو بہت دور ہے۔' نرمل نے کہا۔ 'لیکن تم آج ہی ہمارے راکھی باندھ سکتی ہو!'

سونو نے ٹوکرے میں سے تین دھاگے نکالے اور باری باری تینوں کی کلائی پر باندھ دیے۔

نرمل نے اُسے ایک روپیہ دیا۔

رابرٹ نے اُس کی نقل کرتے ہوئے ایک روپیہ دیا۔

کریم نے بھی ایک روپیہ دیا۔

'تو پھر چلو۔ اپنی کٹھ پتلیوں کو لے کر۔' نرمل نے کہا۔ 'بعد میں تم چاہو گی تو تمھاری کٹھ پتلیوں سے کچھ پیسہ مل جائے گا تمھیں۔'

سونو نے اپنا ٹوکرا سر پر اٹھایا اور اُن کے ساتھ چلنے لگی۔

وہ زینے پر چڑھ ہی رہے تھے کہ اوپر سے آواز آئی۔ 'گوری دھیرے چلو۔ کہیں تمھارا ٹوکرا پھسل نہ جائے!'

'یہ کون ہے؟'

'اوپر والے سیٹھ کا بیٹا ہے۔'

'کہنے دو سالے کو۔ کسی اور دن سمجھ لیں گے۔ انشاءاللہ۔'

'دیٹ از رائٹ۔ لیٹ دی ڈوگس بارک!' 'کتے کو بھونکنے دو!'

پہلے مالے پر دادا جگا مل گیا جس کا نام تو جگ موہن تھا لیکن وہ دادا جگا ہی کہلاتا تھا۔ اس ساری بلڈنگ میں رہنے والے اُسے ایک روپیہ ماہوار دیتے تھے اپنی حفاظت کے لیے۔

وہ سونو کو دیکھ کر نرمل سے بولا۔ 'کیوں۔ کیوں بھائی۔ اب تو ہو گئے تم پورے چار!'

نرمل نے جواب دیا۔ 'یہ ہماری بہن ہے۔ دادا جگا خیال رکھنا!' اُس نے کسی قدر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

دادا جگا نے نرمل سے نیچے اُترتے ہوئے کہا: 'تمھاری بہن سو ہماری بہن۔ ہی ہی ہی ہی!'

اپنے کمرے میں گھستے ہوئے سامنے والی ایک بُری زبان والی خوجن نے دروازے میں سے جھانکا۔

'تاک جھانک کیوں کرو ہو، مائی؟' کریم نے اُسے شرمندہ کرتے ہوئے کہا۔ 'یہ ہماری بہن ہے!'

سامنے کا دروازہ زور سے بند ہو گیا اور سونو اپنا ٹوکرا لیے اندر داخل ہو گئی۔ نرمل نے اندر جا کر اُس کا ٹوکرا اُتروایا۔ اُس کے لیے پلنگ وہ پہلے ہی بچھا گئے تھے۔ پلنگ نرمل نے دیا تھا، جس نے اب زمین پر اپنا بستر اجما لیا۔

رابرٹ نے اپنے پلنگ کا گدا سونو کے لیے دے دیا۔

کریم نے اپنا تکیہ اُسے دیا۔ جس پر اُردو کا ایک شعر کڑھا ہوا تھا۔ جو وہ پانچ روپے میں بھنڈی بازار سے کڑھوا کر لایا تھا۔

رات کو اُنھوں نے پنچ میل کھچڑی ایک پلیٹ میں نکال کر سونو کے سامنے رکھی۔ لیکن سونو باپ کے ساتھ کھانے کی عادی تھی۔ اُس نے ایک نوالہ بھی نہ کھایا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جو ٹپ ٹپ کھچڑی میں گر رہے تھے۔

خاموشی سے نرمل نے پلیٹ اُس کے سامنے سے اُٹھالی۔ کریم نے اپنا دودھ کا گلاس اُس کے سامنے رکھ دیا۔ 'کھچڑی نہیں کھائی تو دودھ ہی پی لو۔ ورنہ نیند نہ آئے گی۔

سونو نے خاموشی سے دودھ پی لیا۔ آج رابرٹ کا نمبر تھا برتن دھونے کا۔ رابرٹ نے سب برتن دھوئے۔ سونو کا دودھ کا گلاس بھی دھو دیا۔ پھر وہ اپنے بستر پر پہنچ گیا اور تکیے پر سر رکھتے ہی سو گیا۔

رات کو کریم نے کروٹ بدلی تو اسپرنگوں کی چوں چوں سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ بیٹھا۔ نرمل کے پلنگ کی طرف نگاہ کی تو دیکھا وہ بھی جاگ رہا ہے۔

'کیوں، نرمل! تمھیں نیند نہیں آئی؟' کریم نے اُس سے پوچھا۔

نرمل نے جواب دیا۔ 'نیند تو آرہی ہے لیکن میں جاگ رہا ہوں کہ تمھیں باتھ روم جانا ہو تو راستہ نہ بھول جاؤ۔'

سونو اپنے پلنگ پر لیٹی لیٹی اپنے بابا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ چت لیٹی اوپر لگے پنکھے کو تک رہی تھی اور نرمل اور کریم کی باتیں سُن رہی تھی۔ جب محلّے پڑوس میں مرغ بولنے لگے تب اُسے نیند آئی، پھر بھی وہ سب سے پہلے جاگ گئی اور اُٹھ بیٹھی۔

○

آٹھواں باب

دو خبریں

اگلے دن جب نرمل اور کریم سو کر اُٹھے (رابرٹ نائٹ ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا) تو اُنھوں نے دیکھا سونو نے اُن کے کمرے کی کایا ہی پلٹ دی ہے! اُس نے ایک الگنی اپنے پلنگ کے آگے لگادی تھی اور اُس پر ایک پلنگ پوش ڈال دیا تھا۔ یہ تھا پردے کا انتظام لیکن سارے کمرے میں جھاڑو بھی دے دی تھی اور سارے برتن دھو دیے تھے۔ انگیٹھی پر چائے کی کیتلی سنسنا رہی تھی اور سب کے میلے کپڑے دھو کر اُس نے ایک اور الگنی پر ڈال رکھے تھے۔ چپ چاپ اُس نے دو پیالی چائے اُن کے سامنے رکھ دی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اِسے کیسے معلوم ہوا کہ نرمل چائے کی پیالی میں تین چمچے شکر ڈالتا ہے اور کریم صرف ایک! جب اُس سے پوچھا تو کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ مَون برت رکھے اپنا کام کرتی رہی۔

جب کریم کو جواب نہ ملا تو اُس نے نرمل سے کہا۔ کیوں بھئی نرمل! ہم اپنی بہن کو مہمان بنا کر لائے ہیں یا کوئی نوکرانی رکھی ہے؟'

نرمل نے کہا۔' خیال تو ہمارا یہی تھا کہ مہمان بن کر ہی رہے گی لیکن مہمان زبردستی کام کرنا چاہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟'

اتنے میں رابرٹ اپنی نائٹ ڈیوٹی ختم کر کے آیا تو اُس کی بغل کے نیچے صبح کا اخبار تھا۔

'دِکھا یار تیری دُنیا میں کیا ہوا ہے؟'

اخبار دکھائے بغیر رابرٹ نے جواب دیا۔ بولیویا میں پھر ارتھ کوئک (زلزلہ) آیا ہے، کئی ہزار آدمی بے گھر ہو گئے ہیں اور سینکڑوں کی ڈیتھ ہوئی ہے۔'

'اور کیا خبر ہے؟'

'جتنے تیل پیدا کرنے والے مُلک ہیں اُنھوں نے ایک کانفرنس کر کے پٹرول کا بھاؤ اور بڑھا دیا ہے۔'

'فکر نہ کرو ہماری موٹر آنے میں ابھی بہت ٹائم ہے!'

اب رابرٹ اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔ اخبار کو اپنے گھٹنوں پر پھیلا کر رکھا اور بولا۔ 'ایک خبر راجستھان کی بہت دلچسپ ہے۔ بلکہ دو خبریں ہیں۔'

'سنا بھئی سنا۔' نرل نے کہا۔

راجستھان کا نام سن کر سونو بھی قریب آ گئی اور ایک ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ ایک بَلّی تھی جس نے چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔

رابرٹ اخبار میں خبر پڑھنے لگا۔

'پہلی خبر تو یہ ہے کہ راجستھان سرکار نے گورنمنٹ آف انڈیا سے سات کروڑ روپے مانگے ہیں راجستھان نہر کو فنش کرنے کے لیے۔'

نرل نے کہا۔ 'یہ ریاستیں کسی نہ کسی کام کے لیے روپے مانگتی ہی رہتی ہیں۔'

کریم نے پوچھا۔ 'اور دوسری دلچسپ خبر کیا ہے؟'

'بتاتا ہوں' رابرٹ نے کہا 'پہلے چائے پلاؤ!' مونو نے اسے بھی ایک پیالی میں چائے بنا کر دے دی اور رابرٹ حیران ہو گیا یہ دیکھ کر کہ اُس کی چائے میں شکر نہیں تھی۔ جیسی چائے وہ ہمیشہ پیتا تھا ویسی ہی چائے تھی، اُس میں دودھ بھی نہیں تھا۔ صرف آدھا کٹا ہوا نیبو رکھا ہوا تھا۔ حسبِ معمول اُس نے پہلے چکھا کہ کافی کھٹا ہے اور پھر اُسے چائے میں نچوڑ دیا۔

'بول یار! خواہ مخواہ نخرے بہت کرتا ہے تو؟ لگتا ہے اخبار کا لائنو ٹائپ آپریٹر نہیں ہے تو ایڈیٹر ہے۔'

اب رابرٹ نے ہیڈ لائنز سے لے کر نیچے تک کی سب خبر پڑھ دی۔

'سات کروڑ کا سونا اور ہیرے جواہرات ریگستان میں دفن!'

'وجے نگر، 24 اکتوبر (سماچار) معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وجے نگر کی مہارانی نے (جواب دماغی اسپتال میں زیرِ علاج ہے) اپنا سارا خزانہ ریگستان میں کسی نامعلوم جگہ دفن کر دیا ہے۔ صرف اُسی کو وہ جگہ معلوم ہے۔ لیکن جب انکم ٹیکس کے افسروں نے اُس سے سوال کیا تو وہ پاگلوں کی طرح ہنس کر بولی۔ 'ڈھونڈو اُسے ڈھونڈ لو!' اُس کے محل کے نو وفادار سیوک بھی خزانے کے ساتھ غائب ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خزانے پر پہرہ دینے کے لیے مہارانی نے ریگستان میں چھوڑے ہیں۔ اُس خزانے کی مالیت کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ کم سے کم پانچ ساڑھے پانچ کروڑ کا سونا اور جواہرات مہارانی کے پاس تھے جو انکم ٹیکس والے ضبط کرنے آئے ہوئے تھے۔ لیکن کسی طرح مہارانی کو اُن کا ارادہ معلوم ہو گیا تو اُس نے خزانے کو ریگستان میں چھپا دیا۔ کون جانتا ہے کس ریت کے تودے کے نیچے سے یہ دبا ہوا خزانہ نکل آئے۔ فی الحال تو اس کا ملنا مشکل نظر آتا ہے۔ اتنا ہی مشکل جیسے کسی نے سمندر میں ایک سوئی گرا دی ہو!

مہارانی کی حالت کے بارے میں تشویش ہے کہ اب اُس کا دماغ کبھی صحیح ہوگا یا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اپنا خزانہ گم ہو جانے پر اپنا دماغ ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔ بہرحال لاکھوں آدمی اور راجستھان سرکار اس سلسلے میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں کہ کسی طرح یہ خزانہ اُن کے ہاتھ لگ جائے!'

'ارے واہ! سات کروڑ کی ضرورت ہے راجستھان سرکار کو۔ اور سات ہی کروڑ کی دولت مہارانی نے ریگستان میں چھپا رکھی ہے!' نرل نے کہا۔

کریم نے لقمہ دیا۔ 'میرے بھائی کیا اِس سلسلے میں اپنی قسمت آزمائی نہیں کر سکتے؟'

رابرٹ نے انکار میں سر ہلایا۔ 'ابے کھانے کے تو دانے ہیں اور تو چلا ہے اپنی لک ٹرائی کرنے؟ لک تو اپن سب کی خراب ہے۔ نہیں تو لاٹری کے ٹکٹ ہر مہینے خریدنے میں نکل نہ آتی ایک لاٹری یا منی لاٹری؟'

نرل نے کہا۔ 'تو تو ہمیشہ کا نسوڑ ھیا ہے۔ کیا کہتے ہیں اُسے تیری انگریزی میں KILL JOY وہ ہے تو تو۔ دماغی گھوڑے دوڑانے میں کیا خرچ ہوتا ہے؟ خزانہ نہ ملے گا نہ سہی، دو چار دن اِس اُمید

میں گُھما گُھبی تو رہے گی۔ ہاں تو کریم اُس ریگستانی سمندر میں کیسے پتہ چلائیں گے اُس خزانے کا؟'

'دیکھو بھائی خزانہ ہونا تو چاہیے وجے نگر شہر کے آس پاس ہی!'

'ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مہارانی بھی تو وجے نگر ہی کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ سو دو سو میل گئی ہوگی اُس ٹرک میں!'

'بلکہ اِس سے بھی کم۔ مشکل سے پچاس میل!'

'اچھا پچاس میل سہی!' نرمل نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ 'مگر کس طرف؟ سمندر میں اور ریگستان میں پچاس میل کا مطلب ہوتا ہے دو ہزار پانچ سو مربع میل! کیونکہ کوئی سڑک تو ہوتی نہیں ہے وہاں۔ کسی طرف بھی جا سکتی ہے وہ۔'

یہ سُن کر کریم بھی قائل ہو گیا۔ پھر بولا 'میں بتاؤں۔ ہم بھی ایک ٹرک کا انتظام کریں اور مہارانی ہی کی طرح رات کو وجے نگر سے نکل پڑیں۔ اور اِدھر اُدھر بھٹکتے رہیں۔ صبح تک ہو سکتا ہے ہمیں اُس خزانے کا سُراغ مل جائے۔'

'واہ واہ کیا بات کہی ہے تم نے، کریم میاں؟ تمھیں تو کولمبس یا واسکوڈی گاما ہونا چاہیے تھا! کوئی نہ کوئی نئی دنیا کھوج نکالتے!'

'یو آر کریزی' رابرٹ نے کہا۔ 'ایک دم پاگل ہو تم سب! اچھا یہ بتاؤ ناشتہ کا کیا انتظام ہے؟'

'ابھی انتظام ہو جاتا ہے۔ میں ڈبل روٹی کا انتظام کرتا ہوں۔ تو سلائسوں پر مسکہ مار دے۔'

'پراؤ ٹھا بنائے رہی ہوں میں!' سونو نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ 'ساگے آلو کی ترکاری بھی ہے۔'

'واہ واہ کیا بات ہے ہماری مہمان کی۔ یہ تو یہاں کی مالکن بنی بیٹھی ہے!' نرمل نے کہا۔ 'کچھ دنوں میں کہیں ہمیں یہاں سے نکال باہر نہ کر دے؟'

سونو چولہے کے پاس بیٹھ گئی۔ تینوں دوست (بلکہ یار کہنا چاہیے) اپنی اپنی تھالی لے کر زمین پر پاس ہی بیٹھ گئے۔

آلو کی ترکاری بہت چٹ پٹی تھی۔ پراٹھے بھی مزیدار تھے اور ساتھ میں نیبو کا اچار تو اور مزا دے رہا تھا۔

'اور تم کب کھاؤ گی؟'

'میں تمھارے کھلائی لیوں پیچھے کھاؤں گی۔ مہارے گاؤں ماں استریاں پرشوں سے پہلے نہ کھاوے ہیں۔'

'ارے واہ رے سنو مہاراج عورتوں کو کیا طور طریقہ سکھا گئے ہو؟' کریم نے ایک لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

اور یہاں سے نرل نے بات کا رُخ موڑ دیا۔ یار! یہ ٹرک کا خیال برا نہیں ہے۔ ہربنس سنگھ کے بارے میں کیا خیال ہے یارو؟'

'کون ہربنس سنگھ؟ وہ شرابی کبابی جو ہمارا چوتھا یار بننا چاہتا تھا؟ وہ یہاں ہوتا تو جانتے ہو ہم سب کو شرابی بنا دیتا۔

کریم نے کہا:

یار شرابی بننا اپنے اختیار میں ہے۔ ہم بچے نہیں رہے کہ کوئی بھی ہمیں شرابی بنا سکتا ہے۔ ہربنس سنگھ پیتا ہے تو پینے دو لیکن یہ سمجھ لو آدمی جیوٹ والا ہے، اور اُس کے پاس اپنی ٹرک بھی ہے۔'

'رہے گا کہاں وہ؟ چوتھا کونا تو اب بھر گیا ہے۔ پھر سونو جی کی موجودگی میں ہربنس سنگھ کا آنا اور بھی قابل اعتراض سمجھتا ہوں۔ کریم نے نیا اعتراض کیا۔

'ہربنس جی کا آنا جروری ہے تو ان کو بلا لیو۔ مہاری پھکر میں آپ کرو ہوں۔ سونو نے گتھی کو سلجھاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

'ارے بھائی ابھی تھوڑا ہی بلائیں گے اُسے؟ صرف لالچ دیں گے کہ راجستھان واپسی پر اُس کو چار یار' میں جگہ دے دیں گے تب تک سونو جی کا کہیں نہ کہیں اور انتظام ہو جائے گا۔'

'اچھا اب سمجھ لو ٹرک کا انتظام تو ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کب چلنا ہے اور کہاں چلنا ہے؟'

'میں وشے کے مارگ جانوں ہوں، سونو نے دھیرے سے کہا۔ مہارا بابو تو جانتا ہی تھا۔ کٹھے نہ کٹھے وجے نگر اور بھارت پور بیچ میں ہے۔'

(بیسویں صدی، اگست 1978)

○

نواں باب

ایک ٹرک ڈرائیور

ہربنس سنگھ آنٹی جوزی کے بار میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ ٹرک کہیں لے جا کر بمبئی لوٹ کر آتا تھا تو وہ زیادہ تر وقت یہیں گزارتا تھا۔ جب سے چار یار میں اُسے رہنے کی جگہ نہیں ملی تھی اُس نے اپنا ٹائم ٹیبل ہی یہ بنالیا تھا کہ چھ سات آٹھ دن میں ایک ٹرپ کر کے آتا (کلکتہ یا دہلی یا ناگپور کا) اور واپس آ کر دو تین دن جو آرام کے ہوتے بمبئی میں اُن کا بیشتر حصہ آنٹی جوزی کے غیر قانونی بار میں گزارتا اور جب شراب کے نشے میں بالکل دھت ہو جاتا تو اپنی ٹرک ہی کی اگلی سیٹ پر سو جاتا اور ایک دن ایک رات تک سوتا ہی رہتا۔ جب اُٹھتا تو ریلوے اسٹیشن پر جا کر ایک روپیہ بخشش کا دے کر وہاں کے غسل خانے میں نہاتا دھوتا اور لانڈری کے دُھلے کپڑے پہن کر باہر نکلتا۔ پھر وہ نئی ٹرپ کے لیے تیار ہو جاتا۔

پچھلے کئی مہینے سے یہی اُس کا پروگرام تھا۔ راستے میں وہ دوسرے ڈرائیوروں کی طرح کبھی نہ پیتا تھا۔ وہ لاکھ کہتے، راستے کے ڈھابے والے اُسے للچاتے لیکن وہ ایک بوند بھی نہ پیتا۔ جب سے بیئر کھلی تھی لوگ اُسے بیئر آفر کرتے لیکن اس کی 'نہیں' کبھی 'ہاں' نہ بنتی۔ وہ ہمیشہ کہتا۔

میرے ساتھ پینا ہی ہے تو آنٹی جوزی کے بار میں آؤ اور وہاں پیو جتنا جی چاہے۔ میں بھی سب کسر وہیں پوری کرتا ہوں۔'

آنٹی جوزی ایک کرسچین بڑھیا تھی، جس کا شوہر انکل جوزف بھی یہی دھندا کرتے کرتے ایک غنڈے کے چاقو کا شکار ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد 'بار' چلانے کی ساری ذمّے داری جوزی کے سر پر آ پڑی تھی۔ اُس نے 'بار' کو اپنے حسنِ انتظام سے اور بھی مقبول بنا دیا تھا۔ جھونپڑے میں نئے پردے لگائے تھے۔ کاؤنٹر نیا بنوایا تھا۔ گاہکوں سے وہ ہمیشہ ہنس کر بات کرتی تھی۔ کچھ روپیہ ڈوب بھی جاتا تو جھگڑا فساد نہ کرتی تھی۔ ایسی مثالیں بھی موجود تھیں جب کہ لوگوں نے جوزی سے پیسے اُدھار لیے تھے اور واپس بھی کر دیئے تھے۔ اگرچہ ہربنس سنگھ اِن میں سے نہیں تھا!

ہاں تو ہربنس سنگھ ایک رات جوزی کے بار میں بیٹھا ہوا پی رہا تھا کہ ڈھونڈتا ڈھونڈتا نرل وہاں پہنچا۔

'کیوں بھئی ہربنس سنگھ کیا حال ہے؟' اس نے پوچھا۔

ہربنس سنگھ نے اُسے حقارت بھری نظر سے دیکھا اور جواب دیا: ''تمھاری بلا سے! تمھارا بگلا بھگت کا گھونسلہ تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟''

'اُسی کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں یار!'

'کرو بات۔'

'اُس دن ہم سب نے انکار کر دیا، اُس کا بہت افسوس ہے، اُسی دن سے ہم تمھیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ آج جا کے اِس جگہ کا پتہ چلا ہے تو میں یہاں آیا ہوں۔'

'لیکن میرا پرانا قرض بھی تو تمھیں چکانا ہے؟'

'وہ میں ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'

'تیار ہو؟'

یہ کہہ کر ہربنس سنگھ کھڑا ہو گیا۔ اور ایک گھونسہ نرل کو رسید کیا۔

لیکن وہ بھی اسسٹنٹ ماسٹر کی اسٹنٹی کر چکا تھا اور ویسے بھی اکثر فلموں میں ہیرو کا ڈپلی کیٹ کرتا تھا۔ وہ عین وقت پر ایسا جھک گیا کہ گھونسہ اُسے چھُوتا ہوا ہی لگا۔

'واہ بیٹا۔ فلمی چینٹرے دکھاتا ہے؟' ہربنس سنگھ بولا۔

'بس یار اب تو کافی ہوگیا۔' زمین پر سے اٹھتے ہوئے نرمل نے کہا۔ اب تو تو خوش ہوگیا؟'

یار! چل حساب برابر ہوگیا۔ تم لوگوں نے میری انسلٹ کی تھی۔ میں نے ایک گھونسہ مار لیا۔ تجھے لگا یا نہیں یہ تیری ہوشیاری اور میری غلطی تھی۔ چل معاف کیا!'

یہ کہہ کر اُس نے نرمل سے ہاتھ ملایا اور اُسے شراب کی بوتل آفر کی۔

'میں تو کام پر پیتا نہیں ہوں!'

کام کیا ہے؟''

آہستہ سے نرمل نے اس کے کان میں کہا:

سات کروڑ کے ہیرے جواہرات ہیں۔ ہربنس سنگھ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ انھیں کہیں لے جانا ہے؟ نہیں انھیں ڈھونڈنا ہے۔

کس کے ہیں؟

''ایک مہارانی کے۔''

کہاں ہیں اور کہاں لے جانا ہے؟'

'راجستھان کے ریگستان میں کہیں دفن ہیں۔ ممکن ہوا تو انھیں یہاں بمبئی لانا ہے۔'

'معاوضہ کیا ملے گا؟'

چار یاری میں پارٹنر شپ! پانچواں حصہ تمھارا ہوگا۔''

پانچواں حصہ کیوں؟'

'ایک لڑکی بھی پارٹنر ہے ہماری!'

'ایک لڑکی بھی ہے اِس کھیل میں؟'

'دیکھ ہربنس! اُس لڑکی کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ اُسے ہم نے بہن بنایا ہوا ہے۔ راستہ وہ بتائے گی۔'

'تم نے بہن بنایا ہوا ہے۔ میں نے تو ایسی کوئی غلطی نہیں کی۔'

'تمھیں یہ غلطی کرنی پڑے گی۔ ورنہ تم ہمارے ساتھی نہیں بن سکتے!'

'اچھا سوچیں گے؟
'سوچنے کی بات ہی نہیں ہے۔ سمجھے!''
'اچھا یار سمجھ گیا۔ بول اب کب چلنا ہے؟'
'کل سویرے ہی رات کے اندھیرے میں جب تیری ٹرک کی کوئی چیکنگ نہ ہو۔'
'وہ کیسے ہوگا؟'
'وہ ایسے کہ میں تمھارا کلینر بن جاؤں گا۔ اورلڑکی اور دو آدمی تار پولین کے پیچھے گھس جائیں گے۔ تم کہہ دینا بھیڑیں اور بکریاں لے جا رہے ہو۔'
'بھیڑیں اور بکریاں؟' ہربنس سنگھ نے سونو کو گھور کر دیکھا اور فقرہ کسا۔ بھئی ایک تو بکری ہے اچھی۔ باقی بھیڑوں کا میں ذمّے دار نہیں ہوں!' اُس نے کریم اور رابرٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

'یہ ہربنس سنگھ بڑا مذاقیہ ہے!' نرمل نے گھبرا کر سونو سے کہا۔ 'تم برا نہ ماننا اس کی بات کا!'
سونو نے ایک پیالی چائے کی بہت سا دودھ اور بالائی ڈال کر ہربنس سنگھ کو دے دی۔ 'شکر دیکھ لینا کافی ہے کہ نہیں۔'
ہربنس نے ایک سُڑر پا مار کر کہا۔ 'بالکل ٹھیک۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں تین چمچے شکر پیتا ہوں؟'
'بدّھی سے! سارے ٹرک ڈرائیور لوگ چائے میں تین چمچے شکر اور بالائی ڈال کر پیتے ہیں۔ میں اپنے گاؤں کے پاس ایک سڑک پر ایک ڈھابہ چلاتی تھی۔'
ہربنس سنگھ چائے پی کر بہت خوش ہوا اور ایک اور پیالی کی فرمائش کی۔ پھر نرمل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ 'سامان کیا کیا ساتھ جائے گا۔ یاد رکھنا ریگستان میں رات کو بہت سردی ہوتی ہے۔'
'سب یاد ہے اور ساری چیزوں کا انتظام ہے۔ کیوں رابرٹ؟'
'یس!' رابرٹ نے جواب دیا۔ لسٹ چیک اپ کرلو۔'
'پانچ کمبل!'
نرمل ایک فہرست پر ٹک مارک کرتا رہا۔
'پانچ گرم کوٹ'

'ہاں'

'پانچ پھاوڑے'

'کیا سونو بھی پھاوڑا چلائے گی؟ ہر بنس نے ہنس کر سوال کیا۔

'جی ہاں۔ برابر کی حصہ دار ہوں۔ کام میں بھی اور خزانے میں بھی!'

'پانچ پانی کی کپیاں ملیٹری کی ہیں۔ چور بازار سے لی ہیں۔'

'ٹھیک ہیں مگر چھاگل بھی رکھ لو۔'

'تین چھاگل بھی ہیں۔'

'پہیوں میں لگانے کے لیے زنجیریں۔ چار عدد۔ اگر ٹرک ریت میں دھنس گیا تو کام آئیں گی۔'

'یہ کام کیا تم نے فرسٹ کلاس!' ہربنس نے انہیں شاباشی دی۔

'پانچ کلہاڑیاں'

'وہ کس لیے۔ کیا درخت کاٹنے کے لیے؟'

'نہیں۔ خزانے کے ٹرنکوں کے تالے توڑنے کے لیے۔'

'اچھا اور؟'

'ایک تارپولین۔'

'وہ تو میرے ٹرک میں ہے۔ اُس کے نیچے ہی تو تم چھپ کر جاؤ گے۔'

'نہیں یہ اور ہے۔ خیمہ بنانے کے لیے۔ دوپہر کی دھوپ میں آرام کرنے کے لیے۔'

'پانچ چٹائیاں بچھانے کے لیے۔ تارپولین کے نیچے۔'

'پانچ پلیٹیں۔ پانچ مگ تام چینی کے۔ ایک چائے بنانے کی کیتلی۔ ایک اسٹو و ایک ترکاری کاٹنے کی چھری۔'

'ایک توا روٹی پکانے کے لیے۔'

'کھانے پینے کا پورا انتظام ہے۔'

'ہاں ہو سکتا ہے ایک مہینہ لگ جائے۔'

'ایک پیڈ۔ پچیس لفافے۔ ڈاک کے ٹکٹ اور پوسٹ کارڈ۔'

'تم تو ایسا انتظام کر رہے ہو جیسے پکنک پر کشمیر جا رہے ہو!'
'پانچ چاقو۔ کلپ سے کھلنے والے۔'
'یہ کیوں؟'
'ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے!'
'اور آپس میں لڑائی کرنے کے لیے بھی!'
'ایک گیتا، ایک قرآن شریف، ایک بائبل اور ایک گرنتھ صاحب۔'
'ان کی کیا ضرورت پڑ گئی۔'
'معلوم نہیں کس کا آخری وقت کب آ جائے اور کہاں؟'
'زندگی سے موت تک ہر چیز کا انتظام کر لیا ہے تم نے؟'
'بندوق وندوق کی ضرورت نہ ہوگی تمھیں ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے؟'
'نہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ ایک بندوق لے جا سکتے ہیں اور ایک بندوق سے اچھا ہے کوئی بندوق نہ ہو۔ اوّل تو کوئی ڈاکو ملے گا نہیں۔'
'کیوں ٹھیک ہے نا؟'
ہربنس نے کہا۔ 'بالکل ٹھیک۔ اب ٹرک میں سامان رکھوا دو۔ مگر یہ سامان ہے کہاں؟'
'رکھ دیا گیا ہے تمھاری ٹرک میں۔ اسٹپنی وغیرہ کا انتظام ٹھیک ہے نا؟ راستے میں پنکچر ہو سکتا ہے۔'
'اُس کی فکر مت کرو تم۔ سب میں نے تیار کر لیا ہے۔'
'اب بولو کب چلنا ہے؟'
'اسی وقت!'

O

دسواں باب

سونو! سونو!

بمبئی سے ایک سڑک — جو نیشنل ہائی وے کہلاتی ہے، نہ جانے کیوں؟ — جو اندور کو جاتی ہے۔ اُس پر ہربنس سنگھ کا ٹرک چلا جا رہا تھا۔

ہربنس سنگھ ٹرک چلاتے وقت گاتا ضرور تھا۔ اس وقت بھی گا رہا تھا۔ 'تو بناوچ دئی نا۔'

نرل نے کہا۔ 'یار گانا بند کرو ورنہ اِس کے معنی بتا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔'

ہربنس سنگھ نہ کہا— 'اِس کا مطلب یہ ہے کہ.....'

'اچھا یہ بات ہے!' نرل نے کہا۔

ہربنس سنگھ نے کہا۔ 'یار! یہ لڑکی کہاں ہاتھ لگی؟ پٹاخہ ہے! ساتھ ہی سمجھدار بھی ہے!

نرل نے سب کچھ بتادیا کہ کیسے اِس کا باپ ایک اسمگلر کی موٹر کے نیچے آکر مر گیا۔ کیسے اُن تینوں نے اُسے بہن بنا کر اپنے گھر میں اُسے جگہ دی۔

'لڑکی کمال کی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں!'

'سِکھ سے شادی کرے گی؟ راجستھانی بڑے نک چڑھے ہوتے ہیں۔ ذات پات پہ

جان دیتے ہیں۔

'یہ سب باتیں بعد میں کریں گے۔ جب کام ختم ہو جائے گا اور ہمیں خزانہ کھوجنے کا دس فیصد مل جائے گا۔'

'اچھا یہ بتاؤ یہ جگہ ہے کہاں؟'

'راجستھان میں ایک شہر ہے دھنے نگر اور ایک گاؤں ہے بھارت پور۔ ان کے بیچ میں کہیں خزانہ ریت میں دبا ہوا ہے۔ ریگستان ہی ریگستان ہے۔ اُس راستے پر سونو کے باپو نے مہارانی کو دیکھا تھا۔ مہارانی نے اُس پر بندوق بھی چلائی تھی لیکن بہت دور سے — وہ پاگل ہو گئی تھی اور اب بھی پاگل خانے ہی میں ہے۔ روپے والوں کے لیے وہ دماغی مریضوں کا اسپتال کہلاتا ہے۔'

'تو یہ بتاؤ ہم اندور کیوں جا رہے ہیں؟'

'وہاں بھجن گانے والوں کی ایک ٹولی ہے۔'

'پھر ہمیں اُس سے کیا؟'

'اُنہیں ساتھ لے چلیں گے۔ اُس علاقے میں اگر ہم یہ کہہ دیں کہ بھجن گانے والے ہیں اور ہم میں سے ایک یہ کہہ دے کہ اُس کے سپنے میں دیوی آئی ہے جو ریگستان میں کہیں پر کٹ ہو گی تو سب لوگ مان لیں گے اور ہمیں کوئی دِقّت نہ ہو گی۔'

'بڑے ہوشیار ہو جی تُم — نمبر وَن کے بدمعاش! بھگوان کو بھی اپنے جُرم میں ساجھی دار بنا لیا نا؟ لیکن اُس ٹولی کے بھجن گانے والوں کو بھی ساجھے دار بنا لیا تو مشکل پڑے گی۔ بھجن گانے والے پیٹ کے بڑے ہلکے ہوتے ہیں۔ نہ جانے کس سے کب بھید کھول دیں۔'

'ارے ہم تو اندور اُن لوگوں کو دیکھنے اور اُن کے طور طریقے دیکھنے جا رہے ہیں اُنھیں ساتھ تھوڑا ہی لے جائیں گے؟ تو نے ہم کو بہت سیدھا سمجھ رکھا ہے؟''

'سیدھے تو تُم ایسے ہو جیسا کنڈلی مار سانپ! سچ بات یہ ہے کہ تُم سب بڑے حرام زادے ہو!'

اندور پہنچے تو معلوم ہوا بھجن منڈلی مانڈو گئی ہوئی ہے۔ آج رات کو وہیں پروگرام ہے! ہر بنس سنگھ اُس جگہ کو جانتا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ پانچ روپے دے کر اندر بیٹھنے کا

انتظام کرلیا۔ لوگوں کو یہ بتایا کہ ہم بھارت سرکار کے جیولوجیکل ڈپارٹمنٹ کے آدمی ہیں۔ مانڈو کے کھنڈروں میں دھاتوں کا پتہ لگانے آئے ہیں۔ سوچا، بھجن منڈلی ہی سے بھوی پوجا کرلیں تب کام آرمبھ کریں۔

رات کے دس بجے بھجن منڈلی کا پروگرام شروع ہوا۔

پانچ آدمی تھے۔ ساتھ میں ایک عورت تھی۔

لکڑی کا ایک چبوترہ بنایا گیا تھا۔ اُس پر دری کا فرش تھا۔ اوپر ایک میلا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ منچ پر ہارمونیم اور طبلے کی جوڑی رکھی ہوئی تھی۔ اک تارا عورت کے ہاتھ میں تھا جو سُر دیتی جاتی تھی اور ساتھ میں بھجن پر سُر دھنتی بھی جاتی تھی۔ کہتے تھے اُس پر دیوی سوار ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنے حال میں نہیں رہتی۔

پروگرام ہلکے پھلکے بھجنوں سے شروع ہوا جیسے 'جے جے رام۔ کرشن ہری جے جے رام کرشن ہری۔' اور تین گھنٹے بعد پروگرام ختم ہوا ایک بہت مشکل بھجن سے۔ جس میں 'چار یار' ہی نہیں سارے تماشائی بھی شامل ہو گئے۔ پیسوں کی بارش ہوئی 'دیوی' کو نوٹوں کے ہار پہنائے گئے۔ اخیر میں 'دیوی' بے ہوش ہوگئی۔ اُس کے بعد پروگرام ختم ہوا۔ دیوی پر پانی چھڑکا گیا۔ لوگوں کے جانے کے بعد وہ ایک دم اُٹھ بیٹھی اور بولی۔ میرے اوپر پانی ڈال رہے ہو کہ چھڑکاؤ کر رہے ہو؟ سارے کپڑے بھگو دیئے۔ میں نمونیہ سے مرگئی تو کون ذمّہ دار ہوگا۔'

نرمل نے سونو کے کان میں کہا۔ 'یہ کام تو تُم بھی کرسکتی ہو!'

سونو نے صرف سر ہلا کر ہاں کی اور خاموش رہی۔

جب ٹرک آگے چلا تو اُس پر ایک لال کپڑا لگا ہوا تھا۔ جس پر سنہری حرفوں میں لکھا تھا۔ 'شری رام بھجن منڈلی، اندور۔ اندر سب لوگ گیروے رنگ کی کفنیوں میں تھے۔ رتلام کے بعد راجستھان کا بارڈر پار کیا تو سپاہیوں نے ہاتھ جوڑ کر انھیں سلام کیا۔ اور یہ سب کو ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر آشیرواد دیتے رہے۔ بیچ میں 'دیوی' (سونو) بال کھولے اور بکھرائے بیٹھی تھی۔ اب تو جس گاؤں سے گذرتے تھے لوگ اُن کے درشن کو لائن باندھے کھڑے رہتے تھے۔

جب بڑا مجمع دیکھتے تھے تو وہاں بھجنوں کا ایک پروگرام بھی دے دیتے۔ اُس ٹرک ہی پر

تختے ڈال کر اسٹیج بن جاتا اور اُس پر دیوی کو بیچ میں بٹھا کر پروگرام شروع ہو جاتا۔

جب بھارت پور کے گاؤں میں پہنچے تو پروگرام کے اخیر میں دیوی نے اعلان کیا کہ اِس نے سپنے میں دیکھا ہے کہ لکشمی دیوی اِس گاؤں کے آس پاس پرکٹ ہونے والی ہے۔ اب تو گاؤں والے بھی دیوی کے درشن کو اکٹھے ہو گئے۔ لیکن نرل نے اُنھیں سختی سے جھڑک دیا۔ کہا کہ پانچ آدمیوں نے پاک اور صاف ہو کر اور بھجن گا گا کر اپنے آپ کو دیوی کے درشن کے لیے تیار کیا ہے۔ جب دیوی ایک بار پرکٹ ہوگی تو پھر ساری دُنیا اُس کے درشن کر سکے گی۔ اِس لیے کسی کو تعجب نہ ہوا جب ان کی ٹرک بھی رات کے اندھیرے ہی میں ریگستان میں کھو گئی۔

ریگستان میں کوئی لیکھ یا پگڈنڈی تو تھی نہیں جو وہ دجنے نگر شہر کا راستہ تلاش کرتے۔ اُن سے کہا گیا تھا کہ دجنے نگر وہاں سے چالیس پچاس میل شمال مغرب کو ہے۔ اُس طرف وہ ستاروں کو دیکھتے ہوئے چل پڑے۔ ٹرک پہلے تو سخت ریت پر چل رہی تھی بعد میں جب نرم ریت آئی تو اُس میں دھنس گئی۔ ٹارچ کی روشنی میں پہیوں میں زنجیریں ڈال دی گئیں اور موٹر کو دھکا دیا گیا۔ لیکن صبح کے دُھندلکے میں دیکھا کہ چاروں طرف بڑے بڑے ریت کے تودے کھڑے ہیں جو تیز ہوا کے ساتھ اپنی شکلیں بدلتے جا رہے ہیں۔ موٹر کو آگے پیچھے دھکا دینے میں وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ آئے کدھر سے تھے اور جا کدھر رہے ہیں؟ اب تو رات کا انتظار تھا کہ کب رات ہو اور کب ستارے نظر آئیں اور وہ لوگ یہ فیصلہ کر سکیں کہ کدھر جانا ہے؟

اس لیے انھوں نے تارپولین ٹرک کے اوپر لگانے کا فیصلہ کیا اور اُس کی چھاؤں میں بیٹھ کر چائے پی اور تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ دوپہر ہوئی تو سونو نے اُن کے لیے کھچڑی بنائی اور الگ الگ پلیٹوں میں اُنھیں کھانے کے لیے دی لیکن اُس کھچڑی میں اُڑتی ہوئی ریت اتنی گر گئی تھی کہ کھانے کے قابل نہ تھی۔

اری یہ کیا پکایا ہے؟ سردار ہربنس سنگھ نے غصّے میں چیخ کر کہا۔ اپنا سر؟'

کریم نے سونو کی حمایت میں کہا۔ سردار جی! ریت بھی تو کتنی اڑ رہی ہے! وہی چاولوں میں مل گئی ہے؟'

ہربنس سنگھ نے پنجابی کی ایک گالی دے کر پلیٹ اٹھا کر پھینک دی۔

سونو رونے لگی، 'میں اِتّے گالیاں کھانے واسطے نہیں آئی ہوں۔ بھاڑ ماں جائے ہمارا خزانہ؟'

'ہربنس۔ نرل نے چیخ کر کہا 'چل معافی مانگ سونو سے۔ ایک تو وہ ہمیں پکا کر کھلاتی ہے۔ اُلٹی اُسے گالیاں ملتی ہیں!'

'ہربنس نے آج تک کسی عورت سے معافی نہیں مانگی' یہ کہہ کر ہربنس اپنی بانہہ کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔

'یہ عورت نہیں ہے۔'

'پھر کیا ہے؟'

'ہماری بہن ہے۔ اِسے گالی نہیں دے سکتے تم! سمجھے؟'

ہربنس نے ایک گالی نرل کو بھی دے دی۔

'اچھا یہ بات ہے؟' یہ کہہ کر نرل کھڑا ہو گیا۔ 'اُٹھ اپنی ماں کا پوت ہے تو؟'

دونوں کھڑے ہو گئے۔

اگلے لمحے دونوں گتھم گتھا تھے۔ ہربنس سنگھ ٹرک ڈرائیور تھا، جہاں روز مار دھاڑ ہوتی ہے۔ نرل بھی فلم اسٹوڈیوز میں فائٹ ماسٹروں کا سِدھایا ہوا تھا۔ چھ فٹ کا قد تھا۔ ہربنس سنگھ ساڑھے پانچ فٹ کا ہوگا۔

ڈھِشوں۔ ڈھِشوں شروع ہوگئی لیکن یہ فلمی لڑائی نہ تھی اصل لڑائی تھی۔ لیکن ریت پر گر کر چوٹ اتنی نہ لگتی تھی۔ کچھ دیر تک لڑائی چلتی رہی۔ کبھی یہ اوپر کبھی وہ! کبھی ہربنس کبھی نرل! پھر رابرٹ، کریم اور سونو بیچ میں آ گئے۔

سونو نے کہا: نرل جی! مھاری وجہ سوں لڑے۔ میں سردار جی کو معاف کروں ہوں۔ اُن کی ٹرک بنا ہم سبھو کائی نہیں کر سکا۔ اب بہتر یہی ہے کہ غصہ تھوکاں۔ میں اڑتی ریت کو کائی نے کائی راستہ کروں۔ میں دو جی کھچڑی پکاؤں ہوں۔'

'جا بے سردار دے پُتر! ایک لڑکی نے تیری سفارش کی ہے تو میں معاف کر دیتا ہوں۔'!

'ارے جا یہ فلم نہیں ہے، جہاں نقلی کرانے چلتے ہیں۔ اب کبھی مجھے غصہ نہ دلانا۔ چلو اب کے تو میں غصہ تھوک دیتا ہوں۔ آخ تھو! یہ کہہ کر اُس نے واقعی بڑے زور سے تھوکا۔ پھر آپ

سے آپ ہی مسکرا دیا اور اپنا ہاتھ نرمل کی طرف بڑھایا۔ دونوں نے ہاتھ ملا لیا اور پھر سب سونو کے چولھے کے آس پاس ایک پردے کی آڑ بنانے میں لگ گئے۔ جدھر سے ریت آ رہی تھی اُدھر تارپولین کا پردہ لگا دیا۔ اب چولھے پر پھر سونو نے کھچڑی پکائی جو سب نے اچار کے ساتھ بڑے مزے لے کر کھائی۔

شام آئی تو نئی مصیبت ساتھ لائی۔ اُس ریگستان میں سات برس سے بارش نہیں ہوئی تھی لیکن اِن کی قسمت سے اُس شام کو کالے کالے بادل نہ جانے کیسے گھر کر آ گئے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ بارش تو زیادہ نہ ہوئی لیکن بادل ڈٹے ہی رہے۔ ستارے نظر ہی نہ آتے تھے تو رستہ کیا دکھاتے۔ آخر کو تھک کر سب سو گئے۔

لیکن نرمل ساری رات جاگتا رہا۔ اُس کے جاگنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ سارے دن کے تھکے ہوئے تھے سب؟ کسی کو سونو تو خواب میں نظر آئی۔

'کسی نے اُس کی طرف کوئی حرکت کی۔ جب آنکھ کھلی تو سونو غائب تھی۔

باقی سب موجود تھے بلکہ خرّاٹے بھر رہے تھے۔

اس لیے کسی پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ بھگا کر لے گیا ہوگا۔

پاؤں کے نشان بھی وہاں پر نہیں تھے اس لیے کہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا موسم تو خوشگوار کر دیتی ہے لیکن ریت پر پڑے ہوئے پیروں کے نشانوں کو غائب کر دیتی ہے۔

'سونو ـــ سونو! نرمل نے اتنی اونچی آواز سے پکارا کہ سب اُٹھ بیٹھے۔

(بیسویں صدی، اکتوبر 1978)

O

گیارھواں باب

پریم

سب پریشان ہو گئے ہر ایک نے اپنی پریشانی کا اظہار مختلف طریقے سے کیا۔

یا مظہر العجائب! کریم نے سو کر اٹھتے ہوئے کہا۔ سونو ہو گئی غائب؟

نرمل نے ڈانٹ کر کہا: ہم سے اجازت لیے بغیر وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ یہ ہمارا معاملہ ہے۔" ہربنس نے انگڑائی لے کر کہا: یار لونڈیا کا جو اعتبار کرے وہ ہے کھوتا۔

رابرٹ نے اپنے سینے پر لٹکے ہوئے صلیب کو ہاتھ لگا کر کہا۔ او مائی گاڈ، سونو کہاں ہو گی؟

لیکن سب حیران رہ گئے جب مغرب کی طرف سے، جہاں سورج غروب ہوتا تھا سونو کی آواز آئی۔

امی او۔ ایک آدمی بے ہوش پڑیو تھو۔ وِن نے اٹھا کے لائی ہوں۔

اب وہ انھیں دکھائی دی۔

خاکی لباس پہنے ہوئے ایک بے ہوش آدمی کو کندھے پر ڈالے لا رہی تھی۔ یہ لڑکی بھی عجوبہ تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا تنکا نہ اٹھا سکے گی اور اب ایک ہٹے کٹے سپاہی کو اپنے

کندھے پر اٹھائے لڑکھڑاتی لا رہی تھی۔ سب اس طرف دوڑے۔ زہل اور کریم بے ہوش آدمی کو جو کوئی فوجی جوان معلوم ہوتا تھا ہاتھ اور ٹانگوں سے پکڑ کر اپنے کیمپ میں لائے۔ اب زہل نے سونو سے پوچھا: کہاں گئی تھیں؟ میں تو پاکستان سرحد دیکھنے واسطے گئی تھی۔

سرحد؟ ہاں، ہاں، سرحد۔

وہ کہاں ہے؟

یہیں ہے بس دو کوس ہوگی۔ وہاں کیا کرنے گئی تھی؟

بس ان کے واں کے سپاہیوں کو دیکھنے گئی تھی۔ مہارے گاؤں کے پاس بھی سرحد ہے۔ چوکی ہے۔ مہاں لوگ کبھی کبھی ادھر جاواں ہیں۔ دو باتاں کر کے اور دو گھونٹ پانی کے پی کے پاچھے آ جاواں ہیں۔

سرحد تو خطرناک جگہ ہے۔ روز تو وہاں گولیاں چلتی ہیں۔ وے بھی مہارے لوگاں جیسا دو ٹنگری کے انسان ہیں۔

تو اسے تو وہاں سے لائی ہے؟ کوئی پاکستانی سنتری یا جاسوس ہوگا؟ نہیں جی۔

اچھا اب اس کا کیا کریں؟

ان نے جیتاؤ۔ اور کائے کرنا ہے؟

زہل نے چھاگل میں سے پانی ایک گلاس میں نکالا اور اسے بے ہوش جوان کے منہ سے لگایا۔ حلق تک سوکھا ہوا تھا۔ بہت مشکل سے پانی پیا جو آب حیات ثابت ہوا۔ آنکھیں کھول کر وہ بیٹھ گیا۔ کون ہو جی تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں تیل کی کھوج کر رہا ہوں یا تھا۔ راستہ بھول کر ریگستان میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ میری کپّی میں پانی ختم ہو گیا اور رات کو مجھ پر ایسی بے ہوشی چھائی کہ میں تو سمجھا میری موت قریب آ گئی ہے، خواب میں یم دوت سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہنے لگا۔ جا بچہ ابھی تیرا وقت نہیں آیا۔ مگر مجھے یہاں کون لایا؟ زہل نے مونو کی طرف اشارہ کیا۔ وہ لائی اٹھا کر،، نوجوان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ لڑکی مجھے اٹھا کر لائی؟ یقین نہیں آتا، مگر واقعہ یہی ہے۔ رابرٹ نے کہا، تمہارا نام کیا ہے؟ میرا نام کیا ہے؟ میں تو اس بے ہوشی میں

یہ بھی بھول گیا ہوں.... ابھی بتا تا ہوں... میرا نام ہے.... نام ہے...... اچھا سا نام ہے...... ہاں .... میرا نام ہے پریم ناتھ فلمی نام معلوم ہوتا ہے نا؟ فلمی بھی اور نقلی بھی؟ بولو۔ تمہارا اصلی نام کیا ہے؟ نرمل نے ڈانٹ کر کہا۔ ارے بھائی بتا تو دیا، یقین نہ ہو تو دیکھ لو، اسے دیکھ کر تو مجھے سب کچھ یاد آیا، یہ کہہ کر کلائی پر سے قمیض اوپر کو سرکائی جہاں 'پریم ناتھ' گدا ہوا تھا۔ اب تو یقین آیا؟

ہاں۔ پاکستانی جاسوس بھی پریم ناتھ گدوا کر ادھر آ سکتا ہے۔ نرمل کے انداز میں تلخی ہی تلخی تھی۔ سونو تڑپ کر سامنے آ گئی۔ اب اور کائے ثبوت جائے ہے۔ آ، دیکھو اس کی ڈائری جو اس کے کنئے ہی پڑی تھی۔ میں تو فوٹو ہی دیکھی جو بو ہے یہ تو سب پڑھ سکو ہو۔ یہ کہہ کر اس نے ایک پیکٹ ان کے سامنے پھینک دیا۔ وہ ڈائری نہیں تھی۔ آئل کارپوریشن آف انڈیا کا پاس تھا۔ تصویر تو پریم ناتھ کی ہی لگی تھی اور ساتھ میں ایک سرٹیفکیٹ انگریزی میں چھپا ہوا تھا کہ یہ تصدیق کی جاتی ہے کہ، پریم ناتھ جس کے باپ کا نام گوپی ناتھ ہے آئل کارپوریشن آف انڈیا کا ملازم ہے اور راجستھان ڈویژن میں تیل کی کھوج کر رہا ہے۔

سونو نے سب سے پہلی چائے کی پیالی پریم ناتھ کو دی، کیونکہ اسے اپنی جائیداد سمجھ بیٹھی تھی۔ اسی کے دم سے تو وہ زندہ تھا۔ اتنا دودھ، پریم ناتھ نے احتجاج کیا اور سونو نے CONDENSED MILK کا ڈبہ دکھاتے ہوئے کہا، ہاں اور کیا؟ اور دودھ بھی تو گائے کون نی، ٹین کے ڈبے کی ماں کا ہے۔ سب اس پر ہنس پڑے۔ جب سب نے چائے پی لی تو سونو نے پانی کم ہونے کی وجہ سے پیالیاں ریت ہی سے مانجھ کر دھودیں۔

رابرٹ نے کہا: دیٹ از ریمارک ایبل۔ ریت سے برتن دھونے کا فارمولہ میں نے آج ہی دیکھا ہے۔

میں تو ریگستان کی رہن والی ہوں۔ کدھی کدھی جب مہارے گاؤں کا کنواں سوکھ جاوے ہے تو آٹھ دس کوس سوں پانی بھر کے لانا پڑے۔ مالوگ تو اس ریت سے ہی نہاواں ہاں۔

ریت سے ہاتھ لیتی ہو؟ رابرٹ نے سوال کیا۔ وہ کیسے؟

اب کیا وہ تمہارے سامنے نہا کر بتائے گی، بے شرم کہیں کا۔ اب بار دکھاؤں گی یہ کہہ کر اس نے باریک ریت کا ایک مٹھا بھر کر اپنے بازوؤں پر ملا۔ کہنیوں تک جہاں سے اس کا شلوکہ

پھنسا ہوا تھا، دو تین بار ملنے پر واقعی جلد صاف شفاف ہو گئی۔ پھر اس نے اپنا لہنگا پنڈلیوں پر سے اوپر کیا اور لگی ریت ملنے تھوڑی دیر میں اس کی ٹانگیں بھی صاف شفاف ہو گئیں۔ پھر اس نے یہی عمل اپنے چہرے کے ساتھ کیا۔ بس کلی نہیں کر سکتے۔ ورنہ ہم تو دانت بھی ریت سے رگڑ کر صاف کر سکتے ہیں۔ کمال ہے یہ تو مجھے بھی سکھا دو۔ مجھے بھی اب تو سالوں ریگستان میں گزارنے ہیں تھوڑا سا پانی تو پینے کے لیے بھی ناکافی ہوتا ہے۔ اگر میں نے کچھ پانی منہ دھونے میں ضائع نہ کیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی کہ میں ریت کے طوفان میں ڈوب جاؤں اور جب ہوش آئے تو......

اس نے سوال کیا جو اسے پہلے ہی کرنا چاہیے تھا۔ تم لوگ کس چیز کی کھوج میں آئے ہو اور یہ سونو تمھیں کہاں ملی یہ تو یہیں کی رہنے والی معلوم ہوتی ہے۔

نرل نے جواب دیا ہم یہاں خزانہ کھوجنے آئے ہیں۔ مہارانی وجے نگر نے اپنا خزانہ کہیں اس ریگستان میں چھپا دیا ہے۔ سات کروڑ کا خزانہ ہے اور گورنمنٹ انھیں دس فیصد کمیشن دے گی جو ڈھونڈنے میں اس کی مدد کریں گے لیکن ہم تو پہلے ہی پانچ آدمی ہیں اب تم بھی حصہ مانگو گے۔ نہیں، میں تو سرکاری ملازم ہوں۔ کافی تنخواہ ملتی ہے۔ مجھے حصہ نہیں چاہیے۔ لیکن میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ یہ دیکھو میرے پاس یہ نقشے ہیں سارے ریگستان کے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا میپ کیس نکالا جو اس کی پیٹی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ یہ بتاؤ تم چلے تھے کس گاؤں سے اور جانا کہاں ہے تمھیں۔ سونو نے اس گاؤں کا نام بتا دیا، جدھر انھیں جانا تھا۔ ان دونوں گاؤں کے بیچ ہی میں پاگل مہارانی نے اپنا خزانہ چھپایا ہے لیکن ہمیں اس کی کھوج کرنے میں احتیاط برتنی پڑے گی۔ کیونکہ مہارانی نے نو سیوک بھی چھوڑے ہوئے ہیں جو اس خزانے کی حفاظت کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس ہر طرح کے ہتھیار ہوں گے جبھی تو ہم بھجن منڈلی کا روپ دھارن کیے ہوئے ہیں۔ سمجھا! پریم نے کہا اور پھر اپنے نقشے پر انگلی سے نشان بنا کر بولا، ہم اب یہاں ہیں، یہ رہی سرحد اور یہ ہے پھیلا ہوا ریگستان، یہاں سے تم چلے تھے (ایک گاؤں کی طرف اشارہ کر کے) اور یہاں ہمیں جانا ہے (ایک اور گاؤں کی طرف اشارہ کر کے) اور ادھر تمھیں جانا ہے۔ تمہارا خزانہ کہیں یہیں ملے گا۔ یہ کہہ کر اس نے بیچ میں انگلی رکھ دی۔ سوال یہ ہے کہ وہ نو ہتھیار بند سیوک کہاں ہیں؟ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خزانہ کہاں ہے تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

سونو نے کہا، اچھا بھئی، اب پردہ سنبھالو تو میں کھانا بنائے لیوں پیچھے بجر کھچڑی ہی کھانی پڑے گی۔ لیکن آج میں ایک ٹین کھول کے اس میں مٹر ڈال دوں گی، مٹر پلاؤ کا مزا آوے گا۔

کھانے کو کچھ تو میرے پاس بھی ہے یہ کہہ کر پریم نے اپنا ناشتہ کا پیکٹ کھولا کچھ خشک گوشت کی بوٹیاں تھیں۔ بس تو ٹھیک ہے، یہ بوٹیاں میں چاولوں کے ساتھ ملا دیتی ہوں، بہت اچھی بریانی ہو جائے گی۔ لو پھر پردہ ہم لگائے دیتے ہیں۔ رابرٹ نے کہا اور تارپولین کا پردہ چولہے کے اردگرد کر دیا۔ سب ادھر ادھر چلے گئے۔ پریم وہیں سونو کے پاس بیٹھا رہا۔

کیوں سونو تم ان لوگوں میں کیسے مل گئیں؟

مھارا کرم! ماں تو پہلے ہی سوکھے میں مری تھی، باپو کٹھ پتلیاں دکھا کر مَنے جندہ راکھے تھے۔ انہی ریگستان میں وے ایک دن گاؤں واپس آ رہا تھا تو مارگ میں مہارانی نے پگلا پن میں انھیں دیکھیو۔ اس نے باپو کے ماتھے پر گولی بھی چلائی۔ پن بھگوان کی کرپا سوں وے بچ گیا۔ اسی رات کو ڈر کے مارے وے گاؤں چھوڑ دیا اور من نے ساتھ لے کر ممبئی آئی گیا۔ وے فٹ پاتھ پر رہتا تھا، دن میں تماشہ کرتا تھا۔ ایک دن باپو فٹ پاتھ پر سویا تھا کنارے پر۔ مھارے جیسی کرم جلی کے لیے ایک جالم موٹر گاڑی آئی اور واں نے کچلتے گئی بڑی۔ یہ لوگ اسی فٹ پاتھ کے اوپر ہی چال کے ایک کمرے میں رہتے تھے من نے بہن بنالیا اور من نے آپ نے کمرے میں رہنے واسطے لے گیا۔

بہن بنالیا؟ کیسے؟

ماسو راکھی بندھوا کر اور سب نے اس کا پالن بھی کیا؟ ابھی تو سب کیا ہے لیکن میں یہ غلطی نہ کروں گا۔ سونو تمھارے واسطے ضرورت نہیں ہے تم تو یوں ہی سریف لگتے ہو۔

لگتا ہی ہوں۔ ہوں نہیں؟

مھارے اُنٹھے کہوے اگر کوئی چھوری تاریگستان میں لٹو پڑ پول جاوے اور وہ اس کی جان بچائے تو ہومینو ہی وہ جاوے ہے۔ سچ۔ سونو؟

کہوے تو جرور ہیں۔ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں تو اب یہیں رہنے والا ہوں۔ اس ریت کے نیچے تیل کا ایک سمندر ہے۔ میری کھوج تو یہی کہتی ہے۔ بس تو میں یہیں رہ پڑوں گا۔ تمھارے

گاؤں میں۔ اچھا! تو تم مھارے ساجی دار ہو۔ من نے جو ملے گا۔ آدھا اس میں سے تمنے دے دوں گی۔ نہیں وہ تم اپنے پاس رکھنا۔ میری تنخواہ ہی بہت ہے۔

مگر جہیز میں تو رقم دینی پڑے گی نا؟

پاگل ہوگئی ہو میں تم سے جہیز لوں گا؟ لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے جہیز مانگا۔ تمھاری جیسی بہادر اور نیک لڑکی ہی مل جائے تو یہی بہت بڑا جہیز ہوگیا۔

پھر بھی تو مھارا ساجھی دار ہے۔ اس میں تمھارے کیا اعتراض ہے؟

تمھاری زندگی میں ساجھی دار ہوگئی اب تو۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں کہ اتنے میں ہنڈیا ابلنے کو آگئی اور سونو کا دھیان اپنی پنچ میل کھچڑی کی طرف چلا گیا۔

○

بارھواں باب

بگولہ

کھانا کھا کر طے یہ ہوا کہ صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے چار بجے وہ اس طرف روانہ ہو جائیں گے جدھر پریم ناتھ نے نقشے پر کانٹی لگا کر انھیں دیکھا تھا کہ خزانہ وہاں دبا ہوگا۔ رات کو سب کھا پی کر سو گئے۔ سونو نے پریم ناتھ پر سے اپنی نظر نہ اٹھائی۔ اسے اپنے برابر ہی سلایا۔ گو چار فٹ ریت کا فاصلہ ان دونوں کے درمیان تھا۔ دوسری طرف نرل سو رہا تھا اور وہ سوتے ہوئے بھی ایک آنکھ کھلی رکھتا تھا کہ کوئی کچھ کر تو نہیں رہا ہے؟ اگرچہ اب اس پریم ناتھ کے آنے کے بعد مشکل یہ ہو گئی تھی کہ اس پر وہ ایسا حکم نہیں چلا سکتا تھا جیسا کہ اپنے ساتھیوں پر وہ چلاتا تھا۔ ہربنس سنگھ بھی اب تو اس کی ہر بات ماننے کو تیار تھا۔ پریم ناتھ قد میں اس سے ضرور کم تھا لیکن تعلیم اور تجربے میں کسی طرح کم نہ تھا۔ سوتے سوتے سونو نے کروٹ لی اور اس کے دائیں ہاتھ نے ریت کا لمس محسوس کیا۔ آپ ہی آپ اس کا ہاتھ ریت کے نیچے چلا گیا جیسے کوئی سرنگ بنا رہا ہو۔ ہاتھ اس ریتلی سرنگ میں بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اس سرنگ کے اندھیرے میں اسے ایک اور ہاتھ ملا جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سونو نے سوتے سوتے سوچا۔ یہ مرد کا ہاتھ یہاں

کیسے آیا؟ اور ادھر پریم نے سوچا میں نے تو ریت کی سرنگ میں اپنا ہاتھ یونہی ڈالا تھا۔ لیکن ادھر بڑھنے کے بعد یہ عورت کا ہاتھ کس طرح اور کیوں آیا؟ پھر جب دوسرے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو ملائمت سے پکڑ لیا تو اس کے بدن میں یہ میٹھا میٹھا بجلی کا کرنٹ کیسا آیا؟ شاید اسی کا نام محبت ہے۔

جب نرل سو کر اٹھا تو اپنی گھڑی جس کا چمکدار ڈائل تھا، اس میں وقت دیکھا تو ابھی ساڑھے تین بجے تھے۔ آدھے گھنٹے میں انھیں روانہ ہو جانا چاہئے۔ ریت ہوا سے اڑ گئی تھی۔ اور دو ہاتھ ننگے ریت پر پڑے تھے۔ نرل کو ہمیشہ یہ بتایا گیا تھا کہ 'ملاپ' چاہے وہ ہاتھوں اور انگلیوں کا ہی کیوں نہ ہو، تنہائی میں ہونا چاہیے۔

چاندنی رات تھی اور ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی۔ نرل کی آنکھ کھلی تو اس نے ٹھوکر مار کر کریم کو اور رابرٹ کو اٹھایا اور ہلکے سے دو سونے والے کی طرف اشارہ کیا، جن کے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے اس طرح ہمکنار تھیں جیسے ایک ہی ہاتھ میں دس انگلیاں اگ آئی ہوں۔ نرل نے ایک انگوچھا سونو اور پریم کے ننگے ہاتھوں پر ڈال دیا اور اس وقت اسے عجیب سے اطمینان کا احساس ہوا۔ لیکن ہاتھ پر انگوچھے کا پڑنا تھا کہ سونو اور پریم کے جسموں میں ایک حرکت ہوئی اور دونوں ہاتھ ان کے اپنے اپنے پاس آ گئے۔ دوسرے لمحے وہ دونوں بھی اٹھ بیٹھے اور سونو نے کچھ شرما کر پہلے پریم کو دیکھا پھر گھوم کر نرل اور دوسرے ساتھیوں کو دیکھا جو سامان تہہ کر کے ٹرک میں رکھتے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں تیار ہو کر سب ٹرک میں بیٹھتے گئے۔ اخیر میں سونو کو رابرٹ اور کریم نے ٹرک کے پیچھے اوپر کھینچ لیا اور وہ ایک پٹرول کے خالی ٹین پر بیٹھ گئی۔ پریم اپنے نقشے سنبھال کر نرل اور ہربنس سنگھ کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی تو انجن کی آواز سے بھی اونچی ایک آواز اور آئی۔ ہربنس نے پریشان ہو کر کہا۔ طوفان؟ اتنے سویرے۔

اگلے ہی لمحے میں ریت کے طوفان کا ایک زبردست جھکڑ ان کی ٹرک کو ایسا لگا جیسے کسی جن بھوت نے ایک بِناتی تھپڑ مارا ہو۔ اترو۔ اترو۔ جلدی اترو، ہربنس نے سب کو کہا اور سب سے پہلے خود باہر کھڑا ہو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس بِناتی طوفان نے اس کی ٹرک کو الٹ دیا تو پھر اسے سیدھا کرنے کے لیے بیس آدمی کہاں سے اس ریگستان میں وہ لائے گا۔ پانچ مردوں

سونو نے کہا، اچھا بھئی، اب پردہ سنبھالو تو میں کھانا بنائے لیوں پیچھے بجر کھچڑی ہی کھانی پڑے گی۔ لیکن آج میں ایک ٹین کھول کے اس میں مٹر ڈال دوں گی، مٹر پلاؤ کا مزا آوے گا۔ کھانے کو کچھ تو میرے پاس بھی ہے یہ کہہ کر پریم نے اپنا ناشتہ کا پیکٹ کھولا کچھ خشک گوشت کی بوٹیاں تھیں۔ بس تو ٹھیک ہے، یہ بوٹیاں میں چاولوں کے ساتھ ملا دیتی ہوں، بہت اچھی بریانی ہو جائے گی۔ لو پھر پردہ ہم لگائے دیتے ہیں۔ رابرٹ نے کہا اور تارپولین کا پردہ چولہے کے اردگرد کر دیا۔ سب ادھر ادھر چلے گئے۔ پریم وہیں سونو کے پاس بیٹھا رہا۔

کیوں سونو تم ان لوگوں میں کیسے مل گئیں؟

مھارا کرم! ماں تو پہلے ہی سوکھے میں مری تھی، باپو کٹھ پتلیاں دکھا کر بنئے جندہ راکھے تھے۔ انہی ریگستان میں وے ایک دن گاؤں واپس آ رہا تھا تو مارگ میں مہارانی نے پگلا پن میں انھیں دیکھیو۔ اس نے باپو کے ماتھے پر گولی بھی چلائی۔ پن بھگوان کی کرپا سوں وے بچ گیا۔ اسی رات کو ڈر کے مارے وے گاؤں چھوڑ دیا اور من نے ساتھ لے کر ممبئی آئی گیا۔ وے فٹ پاتھ پر رہتا تھا، دن میں تماشہ کرتا تھا۔ ایک دن باپو فٹ پاتھ پر سویا تھا کنارے پر۔ مھارے جیسی کرم جلی کے لیے ایک جالم موٹر گاڑی آئی اور واں نے کچلتے گئی پڑی۔ یہ لوگ اسی فٹ پاتھ کے اوپر ہی چال کے ایک کمرے میں رہتے تھے من نے بہن بنالیا اور من نے آپ نے کمرے میں رہنے واسطے لے گیا۔

بہن بنالیا؟ کیسے؟

ماسو راکھی بندھوا کر اور سب نے اس کا پالن بھی کیا؟ ابھی تو سب کیا ہے لیکن میں یہ غلطی نہ کروں گا۔ سونو تمھارے واسطے ضرورت نہیں ہے تم تو یوں ہی سریف لگے ہو۔

لگتا ہی ہوں۔ ہوں نہیں؟

مھارے اٹھے کہوے اگر کوئی چھوری نار یگستان میں اکلو پڑ یول جاوے اور وہ اس کی جان بچائے تو ہو مینو ہی وہ جاوے ہے۔ سچ۔ سونو؟

کہوے تو جرور ہیں۔ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں تو اب یہیں رہنے والا ہوں۔ اس ریت کے نیچے تیل کا ایک سمندر ہے۔ میری کھوج تو یہی کہتی ہے۔ بس تو میں یہیں رہ پڑوں گا۔ تمھارے

گاؤں میں۔ اچھا! تو تم ہمارے ساجی دار ہو۔ من نے جو ملے گا۔ آدھا اس میں سے تمہیں دے دوں گی۔ نہیں وہ تم اپنے پاس رکھنا۔ میری تنخواہ ہی بہت ہے۔

مگر جہیز میں تو رقم دینی پڑے گی نا؟

پاگل ہو گئی ہو میں تم سے جہیز لوں گا؟ لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے جہیز مانگا۔ تمہاری جیسی بہادر اور نیک لڑکی ہی مل جائے تو یہی بہت بڑا جہیز ہو گیا۔

پھر بھی تو ہمارا ساجھی دار ہے۔ اس میں تمہارے کیا اعتراض ہے؟

تمہاری زندگی میں ساجھی دار ہو گئی اب تو۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں کہ اتنے میں ہنڈیا ابلنے کو آ گئی اور سونو کا دھیان اپنی پنچ میل کھچڑی کی طرف چلا گیا۔

○

اور ایک لڑکی نے پورا زور لگا کر ٹرک کو الٹنے سے بچا لیا۔ لیکن اس وقفے میں اس کا رخ ضرور بدل گیا۔ پہلے تو ریت کا ایک جھکڑ ہی آیا تھا لیکن اگلے لمحے ایک گھومتا ہوا بگولہ آیا اور موٹر بھی بگولے کی زد میں آ گئی۔ اس کی رسیوں سے لٹکے ہوئے چھ آدمی بھی پھرکی کی طرح گھومنے لگے۔ پریم نے برسوں ریگستان کی خاک چھانی تھی لیکن ایسا بگولہ وہ بھی صبح سویرے، اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا، نہ تجربہ کیا تھا۔

کئی گھنٹے بگولے کا یہ طوفان چلتا رہا۔ ان سب کے ناک، کان، منہ، حلق میں باریک باریک ریت گھس گئی، سانس لینا مشکل ہو گیا۔ بہت دیر کے بعد طوفان کچھ کم ہوا اور ٹرک کا گھومنا بند ہوا۔ آہستہ آہستہ گرد کا زور بھی کم ہوا اور اب وہ ایک دوسرے کے منہ دیکھ سکتے تھے اور ہنس رہے تھے۔ کیونکہ سب کے چہروں پر اتنی ریت لگی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا ان کے چہرے پر پاؤڈر کے ڈبے الٹ دیے گئے ہوں، ارے بندر لگتا ہے تو تو رابرٹ، نرمل نے کہا رابرٹ ہنستے ہوئے بولا اور تم بھی تو گوریلا مانک لگتے ہو۔

سونو نے صحیح بات کہی ارے سب لوگ اپنا اپنا منہ ٹرک کے شیشے میں دیکھو۔ سب کے منہ پر پاؤڈر لگا ہوا ہے اور شیشے میں اپنا منہ دیکھ کر بولی۔ میں تو بالکل بھتنی لگتی ہوں بھتنی، اس پر اور قہقہہ لگا۔ لیکن ہنستے تھے تو منہ اور حلق میں اور ریت گھس جاتی تھی اور پھر کھانسی آنے لگتی تھی۔ ایک کو کھانسی کا دورہ پڑا تو دوسرں کو بھی چھوت کی بیماری کی طرح یہ روگ لگ گیا۔ ہر ایک کو صاف کپڑے یا رومال کی ضرورت تھی جس پر ریت نہ لگی ہو۔ سب سے پہلے پریم نے اپنے اندر کی جیب سے صاف رومال نکالا اور اپنا چہرہ اور ناک کان کو صاف کیا۔ پھر اس نے یہ رومال الٹ کر سونو کی طرف بڑھایا۔ دھنیہ واد، مونو نے کہا اور رومال کی صاف طرف سے اپنا منہ پوچھنے لگی۔ ناک صاف کی تو اس کو یوڈی کولون کی بھینی بھینی خوشبو آئی۔

خوشبو لگائی ہے تم نے؟ اس نے پوچھا۔

پریم نے مسکرا کر، ہاں کی۔

مرد خوشبو لگاتے ہیں تو پریاں اٹھا کر لے جاتی ہیں ان کو۔

وہ تو سچ ہو گا آج سویرے ہی سویرے ایک پری اٹھا کر لائی ہے مجھے۔

تو کیا میں پری ہوں؟

اس میں کیا شک ہے، پریم نے کہا۔

لکھے کور ہنے والا ہے؟ سونو نے سوال کیا؟

لکھنؤ کا ہوں، لیکن یہ سوال کیوں کیا؟

بات یہ ہے کہ جاننا بہت جروری ہے۔ ہمارے گاؤں ملا جنے پور جلے میں کوئی نہیں بیاہ ہوئے۔

لکھنو جنے پور جلے میں نہیں ہے۔

تو ٹھیک ہے اور کسی دوجے جلے کا گاؤں ہوگا۔

کیوں بھئی؟ نرل بھی ایک انگوچھے سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ کیا بات ہو رہی ہے؟

کچھ نہیں، سونو جی مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ تمہاری جات پات کیا ہے۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟

پھر تم نے کیا بتایا؟ یہی بتایا کہ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، جات پات کو نہیں مانتا۔

پھر کیا مانتے ہو؟

انسانیت کو مانتا ہوں۔ ہندوستانیت کو مانتا ہوں، ہم تو اب چھ ہندوستانی ہو گئے ہیں۔ ایک کی کمی ہے نہیں تو ہماری بھی فلم بن جاتی، سات ہندوستانی اکٹھے ہوئے تھے گوا کی آزادی کے لیے۔ کسی مہارانی کا خزانہ تلاش کرنے کے لیے نہیں، کیوں بھائی تم اپنا کام کرو۔ ہمیں مہارانی کا خزانہ ڈھونڈنے دو۔ تم ہمارے کام میں کیوں بھانجی مار رہے ہو، میں بھی ایک خزانہ ڈھونڈنے یہاں آیا ہوں۔ HOW EXCITING TREASURE تم کون سا خزانہ ڈھونڈنے آئے ہو؟ تیل بھی تو ایک خزانہ ہی ہے جو ریت کے نیچے دفن ہے۔ اس کی مالیت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا نہ کوئی اسے چرا سکتا ہے۔ تمہارا خزانہ تو کب کا ڈاکو اٹھا لے گئے ہوں گے۔ کون ڈاکو؟ معلوم نہیں کون ڈاکو۔ لیکن یہ علاقہ ڈاکوؤں کے لیے مشہور ہے۔ ایک عورت ڈاکو تو اپنی ٹولی سمیت مجھے بھی ملی تھی۔ وہ بھی اسی خزانے کی تلاش میں تھی۔ نرل لیٹا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ عورت کون تھی؟ گوری نام بتاتی تھی۔ شیطان سنگھ کی بیوہ کہتی ہے اپنے آپ کو۔ لیکن لوگوں کا کہنا ہے شیطان سنگھ کو اس نے خود گولی ماری تھی۔

باپ رے باپ، کیڑھی جالم لگائی ہے۔ اپنے مرد نے بھی گولی مار دی۔

اب ہم ایک منٹ انتظار نہیں کر سکتے! چل بھئی ہربنس، ٹرک اسٹارٹ کر لیکن ٹرک اسٹارٹ کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ ریت ٹرک کے کل پرزوں میں بھی گھس گیا تھا۔ انجن کھول کر اس کی صفائی کرنی پڑی۔ پھر پٹرول کی ٹنکی میں جتنا تیل تھا وہ نکال کر اس کی بھی صفائی کی اور ریزرو ڈبے میں جو پٹرول پڑا تھا وہ ڈالا، تب ٹرک چلنے کے قابل ہوا۔ ست سری اکال کہہ کر ہربنس سنگھ نے ٹرک چلائی۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے۔ پریم نقشہ دیکھ کر راستہ بتاتا گیا اور وہ سیدھے چلتے رہے۔ ٹھہرو، ٹھہرو، پریم چیخا۔

ہربنس نے گاڑی روک دی۔ چاروں طرف ریت کے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ کہاں ہے خزانہ؟ کریم نے پوچھا۔ وہ دیکھو وہ آدمی اشارہ کر رہا ہے۔ اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا تو ایک ریت کے ٹیلے میں سے ایک پنجر کا ہاتھ نکلا ہوا تھا اور وہ واقعی ایک طرف کو اشارہ کر رہا تھا۔

چلو پہلے تو یہاں کھودو جہاں یہ پنجر پڑا ہے۔ نرمل نے پھاؤڑا چلاتے ہوئے کہا۔

پھاؤڑے چلنے لگے تو ایک کے بعد ایک پنجر ملنے لگے۔ تو یہ ہیں مہارانی کے سیوک، شاید حفاظت کرتے ہوئے یہ لوگ ڈاکوؤں کے ہاتھ مارے گئے۔ یا مہارانی کے ہاتھ سے۔

نہیں نہیں مہارانی اتنی ظالم نہیں ہو سکتی! سونو جلدی سے بولی، تمیں کائی جانو یہ مہاراجوں مہارانیوں کو؟ ماں نے پوچھو۔ جو لگائی میرے باپو بیچارے پر گولی چلا سکے ہے وہ آپنے سیوکوں کو بھی گولی چلا سکے ہے۔ دنیا میں کوئی بھی یہ بھید جاننے والا نہ رہوے۔

سونو ٹھیک کہتی ہے، اب ہمیں اس جگہ کھودنا ہے جہاں وہ ہاتھ اشارہ کر رہا ہے۔ نرمل نے کہا۔

جئے بجرنگ بلی کی! کہہ کر اس نے اپنا پھاؤڑا اٹھایا۔ رابرٹ نے صلیب کا نشان اپنے سینے پر لگاتے ہوئے پھاؤڑا اٹھایا اور حضرت عیسیٰ سے مدد مانگی خزانہ کی تلاش میں۔

یا علی مدد! کہہ کر کریم بھی پھاؤڑا چلانے لگا۔ سونو بھی پھاؤڑا چلا رہی تھی۔ اور ایک ٹیلے پر کھڑا پریم ان سب کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

(بیسویں صدی، نومبر 1978)

○

تیرھواں باب

گوری

بہ ظاہر ریت کھودنا آسان کام معلوم ہوتا ہے۔

نرم زمین، بالو کی تہہ کے نیچے اور بالو کی تہہ کھودنا آسان ہے لیکن ذرا سی بھی ہوا چل رہی ہو تو کام مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ جتنی ریت کھود کر کنارے پر ڈالتے اُتنی ہی ریت ہوا پھر وہیں لاکر ڈال دیتی۔ کئی گھنٹے کھودنے پر بھی 'چار یار' صرف کوئی دو فٹ زمین کھودنے میں کامیاب ہو سکے!

پھر پانی پینے کے لیے رُکے۔ پانی بھی اب تھوڑا ہی رہ گیا تھا۔ نزل نے لاکھ سمجھایا کہ دیکھو بھائی پانی سنبھال کر پیو ورنہ پھر پیاس لگے گی تو پانی نہ ہوگا! لیکن ہر ایک اتنا پیاسا تھا کہ اپنی پیاس پر کوئی پابندی نہ لگا سکا اور اخیر میں جب نزل کا نمبر آیا (وہ لیڈر تھا اس لیے اخیر میں پانی پیتا تھا) تو صرف دو گھونٹ پانی رہ گیا تھا۔

پانی پی کر وہ پھر کھودنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ خزانہ نیچے دبایا گیا ہوگا اور اِس لیے وہ زور سے پھاوڑے اور کدالیں چلانے لگے لیکن شام ہوگئی تب بھی وہ چار فٹ سے گہرا گڈھا کھودنے میں ناکام رہے۔

'واٹر ہے؟' رابرٹ نے کہا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ پانی ختم ہوگیا ہے۔
'ہاں یار! پانی تو ملنا چاہیے پینے کے لیے' کریم نے کہا۔
'جب ہی تو میں کہہ رہا تھا کہ پانی کم کم پیو۔' نرمل نے کہا۔
'یار بھاڑ میں جائے تمھارا اخزانہ!' ہرنس سنگھ نے کہا۔ 'مجھے تو ایک گھونٹ پانی چاہیے!'
'پانی نہیں ہے۔' پریم ناتھ نے کہا اور ثبوت کے طور پر چھاگل اور اپنی پانی کی بوتل کو اُلٹ کر رکھ دیا۔
'پانی کے بغیر کیسے رات کٹے گی؟' رابرٹ نے پوچھا۔
'میں کیا جانوں۔ جیسے پریم ناتھ کی کل رات کٹی تھی۔ یہی ہمارا حال ہوگا۔'
'ارے بھائی، میرا پانی تو پرسوں دوپہر سے ختم ہوگیا تھا۔ سارا دن پیاسا رہا تھا میں۔ جس کی وجہ سے رات کو بے ہوش ہوگیا تھا۔'
'تمھیں تو سونو نے اٹھالیا تھا۔ ہمیں کون اُٹھا کر پانی پلائے گا؟'
'میں اپنے حصّے میں سے ایک ہزار روپے ایک گلاس پانی کے لیے دینے کو تیار ہوں۔' رابرٹ نے معنی خیز نگاہوں سے پریم ناتھ کی طرف دیکھ کر کہا۔
'میں پانچ ہزار روپے دینے کو تیار ہوں!' کریم نے بولی بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُسے بھی یقین تھا کہ کریم ناتھ کے پاس ضرور کہیں نہ کہیں پانی ہوگا۔
'بھائی مجھے ایک ہزار کا لالچ دلانے کی ضرورت ہے، نہ پانچ ہزار کا۔ میرے پاس پانی ہوتا تو میں تمھارے ساتھ اُس کا بٹوارہ کر لیتا۔ میرے پاس پانی نہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ سونو بیچاری پیاسی بیٹھی ہے اور میں اُسے بھی ایک بوند پانی نہ دے سکا۔'
'سونو!' اب سب نے سونو کی طرف نگاہ پھیری۔ 'کیا یہ سچ ہے؟'
'مھا تو ریگستان کا لوگ ہیں۔' سونو نے جواب دیا۔ 'اونٹ کی طرح جب مھا پانی پیواں ہیں تو اپنے پیٹ میں کوں رہے ہے جس ماں ڈالو ملاں؟'
اس پر سب ہنس پڑے اور تناؤ کچھ کم ہوگیا۔
پھر سونو بولی۔ 'یا یوں سمجھ لو کہ مہارے لوگوں کو بن پانی رہوا کی عادت پڑ گئی ہے۔'

اتنے میں اُنھوں نے اُفق کی طرف نگاہ کی تو کچھ گھوڑے سوار آتے دکھائی دیے۔

'دیکھو تو کون آرہا ہے؟' نرمل نے کہا۔

'ضرور ڈاکو ہوں گے۔!'

'ہم پر ڈاکہ ڈالیں گے تو ان کو کیا ملے گا۔'

'لیکن ہمیں پانی مل جائے گا!' نرمل نے کہا اور پھر اضافہ کیا' شاید۔'

گھوڑے اُفق کے اُجالے کے مقابلے میں کالے اور بھیانک دکھائی دے رہے تھے۔ اب اور بھیانک ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ بالکل قریب آ گئے۔

'جئے بجرنگ بلی کی!' ایک عورت کی آواز آئی۔

'اُسی عورت کی ٹولی ہے یہ!' پریم ناتھ نے آہستہ سے کہا۔

سات ڈاکوؤں کی ٹولی تھی۔

آگے آگے اُن کی سردار تھی

سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔

وہ بندوقوں کا نشانہ نرمل اور اُس کے ساتھیوں کی طرف لگائے ہوئے تھے۔

'کیا کھود رہے ہو؟'

بیچ میں گڑھا کھدا ہوا دیکھ کر وہ بولی۔

نرمل نے جواب دیا' وہی جس کی تلاش میں تُم ہو— مہارانی کا خزانہ! اگر تم نے پہلے ہی نکال نہ لیا ہو! اگر تم ہمیں ذرا سا پانی دے دو پینے کو، تو ہم یہ خزانہ تمھارے ساتھ بانٹ سکتے ہیں۔'

'دھنیہ واد تمھارا— جو بھی تم ہو۔ لیکن ریگستان کا یہ حصّہ ہماری عمل داری میں آتا ہے۔ یہاں جتنی دولت ہے وہ ہماری ہے۔ کھودو گے تُم لیکن لے جائیں گے ہم!'

'تو ہم کیوں کھودیں گے؟' رابرٹ نے بیوقوفی سے سوال کیا۔

'اس لیے کہ تمھیں اپنی جان پیاری ہے۔ کھودنے سے انکار کرو گے تو یہ گولی تمھارے سینے کے پار ہوگی! میں باتیں کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ نہ پانی مفت دوں گی۔ دو دو گھونٹ پانی دوں گی، جب تم چار فٹ اور کھودو گے! چلو جگا! اِنھیں پانی کی چھاگل دکھاؤ۔'

جگا جس کے گھوڑے پر پانی کی چھاگل بندھی ہوئی تھی۔ چھاگل تھپ تھپائی یہاں تک کہ اُس سے کچھ پانی چھلک کر ریت میں جذب ہو گیا۔

'یہ ٹرک کس کی ہے؟'

'میری ہے۔' جواب ہربنس سنگھ نے دیا۔

گوری نے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ہربنس کی صورت شکل اور جسم کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ 'ٹھیک ہے۔ تُم بھی اور تمھاری ٹرک بھی ہمارے کام آئے گی۔'

ہربنس پنجابی میں موٹی سی گالی دینے والا ہی تھا کہ زبل کے مضبوط ہاتھ نے اُس کی کلائی پکڑلی اور زور سے دبایا۔ ہربنس خاموش رہا۔

'کیوں؟ میری تجویز منظور ہے کہ ابھی فیصلہ کردوں تمھارا؟'

گوری کے ایک اشارے پر سب بندوقوں کی سیفٹی کیچ کھنچنے اور لگانے کی آواز آئی۔

اب سات بندوقیں اُن کے سینوں پر تنی ہوئی تھیں!

رابرٹ نے مجبور ہو کر کدال اُٹھائی۔

پھر کریم نے

پھر زبل نے

پھر ہربنس نے

اخیر میں سونو نے

پھر پریم ناتھ نے

اور سب پھر کھودنے لگے۔

اب اُن کے بدن کانپ رہے تھے لیکن اُن کی ہر چوٹ میں ایک فیصلہ کُن انداز تھا۔ ایک خطرناک عزم! ایک بھیانک ارادہ! جس طرح وہ ریت پر اپنی کدالیں چلا رہے تھے۔ اُسی طرح کدالیں گوری اور اُس کی ٹولی پر بھی برسا سکتے تھے۔ اگر وہ بندوقوں کا نشانہ ایک سیکنڈ کے لیے اُن کے سینوں پر سے ہٹ جاتا۔

گڑھا گہرا ہوتا گیا۔

اِس عرصے میں گوری نے گیس کا ایک لیمپ بھی روشن کرا دیا تھا اور اُس کی روشنی میں کام ہو رہا تھا۔

گیس کی روشنی میں اُس نے سونو کو دیکھ لیا۔

'یہ چھوکری کس کی ہے؟' اس نے سونو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

پریم ناتھ نے سینہ تان کر جواب دیا۔ میری ہے۔ اور تُم مجھے جانتی ہو؟'

'ہاں ایک بار پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ تُم وہ تیل والے بابو ہو نا؟ جسے پچھلی بار ہم نے معاف کر دیا تھا۔ پھر تُم اس ریگستان میں تیل کی کھوج کر رہے ہو؟'

'کر رہا ہوں!' پریم ناتھ نے کہا۔

'ہم نے کہا تھا یہ سب کھوج کھاج بند کرو۔ یہاں ہماری آ گیا چلتی ہے!'

'آ گیا تو بھارت سرکار کی چلتی ہے جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔'

'بھارت سرکار کیا چیز ہے؟'

'تمھیں جلد معلوم ہو جائے گا۔ بھارت سرکار ساٹھ کروڑ آدمیوں کا نام ہے!'

'ہم نہیں مانتے۔ چلو کام کرتے رہو۔ اگر پانی چاہیے تو؟' گوری نے کسی قدر ڈر کے کہا۔ کیونکہ اُس کی نظروں کے سامنے سرکار کی فوج اور پولیس کے ہزاروں جوان پھر گئے تھے۔

جب گڈھا تقریباً چار فٹ اور گہرا ہو گیا تو ایک کدال لوہے سے ٹکرائی یہیں خزانہ گڑا ہوا تھا۔

دوسری کدال بھی لوہے سے ٹکرائی۔۔

اب وہ اور ہوشیاری سے چاروں طرف کھودنے لگے۔

'کھودنا بند کرو اور باہر نکل آؤ۔ گوری نے بندوق کے اشارے سے اُنھیں حکم دیا۔

سب باہر نکل آئے۔

اب اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ گڈھے میں اُتریں اور گڑے ہوئے خزانے کو ٹرک میں رکھ دیں۔

ہمارے حصّے کا کیا ہوگا؟' نرمل نے جرأت کر کے سوال کیا۔

'تمھارا حصّہ دو چلّو پانی ہے۔۔ یا وہ بھی نہیں چاہیے؟'

'چاہیے۔' نرمل نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

'پانی دے دو انھیں۔'

جب دوسرے ڈاکو بھاری بھاری صندوقوں کو ٹرک میں رکھ رہے تھے تو جگا نے چھاگل سے دو دو گھونٹ پانی ہر ایک کو پلا دیا۔ تھوڑا سا پانی پی کر بھی اُن میں جان آگئی۔

اب ہربنس سنگھ نے للکار کر کہا۔ ابے مادر کھود و۔ کس کے حکم سے میری ٹرک میں یہ سامان رکھ رہے ہو؟'

'ہمارے حکم سے! کیا تمھارا ارادہ کچھ اور ہے؟'

'لے جاؤ ٹرک کو اگر لے جاسکتی ہو!' ہربنس اپنی ٹرک کے بارے میں وہ باتیں جانتا تھا جو کوئی اور نہ جانتا تھا۔

سارے صندوق جب رکھے جا چکے تو گوری گیس کی لالٹین لیے ہوئے ہربنس کے پاس آئی۔ اب اُس کا فولاد جیسا بدن اُس نے روشنی میں دیکھا اور پسند کیا۔

'ہم تمھیں پسند کرتے ہیں!' گوری نے اُس کی بھری ہوئی مچھلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ہم تمھیں بھی ٹرک کے ساتھ لے جائیں گے!'

'اور جو میں جانے سے انکار کر دوں؟'

'آج تک تو کسی نے انکار نہیں کیا! خزانے میں سے بھی کچھ حصّہ تمھیں دے دیں گے۔'

'اور میرے ساتھیوں کو؟'

'انھیں کچھ نہ ملے گا! جان بخشی کر دی یہ بھی بہت ہے!'

ایک اندھیرے کونے سے ایک پستول کی گولی آئی اور گیس کی لالٹین کو ایک تڑاخے کے ساتھ خاموش کر دیا۔ یہ پریم ناتھ تھا جس نے اب اپنا خفیہ پستول نکالا تھا۔

ایک دم اندھیرے میں کسی کو کچھ نظر نہ آیا۔ تین پستول کی گولیاں اور چلیں اور گوری کے تین چار ساتھیوں کو ڈھیر کر دیا۔ گوری کو ہربنس نے گھوڑے سے کھینچ لیا اور اُس کی بندوق چھین لی۔

باقی تین ڈاکو گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

گوری کے پاس اب ایک ہی حربہ باقی تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اس کا بھی استعمال کر دیکھے گی۔

اندھیرے میں اُس نے اپنی قمیض پھاڑ ڈالی۔

'بول ہربنس سنگھ اب کیا کہتا ہے؟'

'ہربنس سنگھ مردار کُتیا کو ہاتھ نہیں لگاتا، سمجھی!'

کُتیا کا لفظ سُن کر گوری جیسے پاگل ہوگئی۔ اُس نے ہربنس کو نوچ ڈالا۔

'حرامزادے مجھے کُتیا کہتا ہے؟ جانتا ہے راجے مہاراجے بھی میرے پیروں کے نیچے آنکھیں بچھاتے رہے ہیں!'

'وہ آنکھیں بچھاتے رہے ہوں گے، میں ایسا نہیں!' یہ کہہ کر اُس نے ایک زوردار تھپڑ گوری کے گال پر مارا۔

اب تو گوری بالکل ہی پاگل ہوگئی۔ بندوق کی چھینا جھپٹی میں اُس کی انگلی بندوق کی لبلبی پر پڑی اور اُس نے لبلبی دبا دی۔ ایک تڑاخہ ہوا اور گوری اپنی ہی گولی کا شکار ہوگئی!

ستاروں کی روشنی میں اُنھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

مری ہوئی گوری کو دیکھا۔

مرے ہوئے ڈاکوؤں کو دیکھا۔ اُن کے گھوڑوں کو دیکھا۔

پھر کچھ سنا!

ٹرک اسٹارٹ ہونے کی آواز! پھر انجن تیز ہونے کی آواز!

پھر ٹرک تیزی سے غائب ہونے کی آواز!!

کون ٹرک لے گیا، ڈاکو ــ یا اُن میں سے کوئی؟

اندھیرے میں نرمل کی آواز آئی 'میں حاضری لیتا ہوں۔

'رابرٹ!'

'یس سر!'

'ہربنس سنگھ!'

'حاضر ہوں، جناب!'

'سونو!'

'یہاں ہوں، جی!'

'پریم ناتھ!'

'عبدالکریم'

کوئی جواب نہ ملا۔

'حرامزادہ! لے گیا نا سارا خزانہ۔ پاکستان کی سرحد یہاں سے دور نہیں ہے۔ اب تک تو وہ سرحد پار کر چکا ہوگا!'

O

چودھواں باب

پھر 'چار یار'

لیکن کریم پاکستان کی سرحد کی طرف نہیں گیا تھا۔

وہ ایک گاؤں کی طرف گیا جہاں کنوئیں میں پانی موجود تھا وہاں سے ایک پکھال پانی خرید کر اس نے ٹرک میں صندوق پر ڈال دیا تھا۔

صبح سویرے جب سو کر اٹھے تو پہلی چیز جو انھیں نظر آئی تو وہ ٹرک تھی جس کے اسٹیرنگ وہیل پر کریم سر رکھے سو رہا تھا۔

''ابے او کریم کے بچے! کہاں گیا تھا؟''

کریم نے جاگتے ہوئے کہا۔''پانی لینے گیا تھا دس روپے میں پکھال ملی ہے۔''

اور خزانہ؟

ٹرک ہی میں محفوظ ہے!

''گنو سب صندوق؟ نرمل نے حکم چلایا اور رابرٹ بکسوں کی تعداد گننے لگا۔

ون۔ ٹو۔ تھری۔ فور۔ الیون۔ ٹویلو۔ تھرٹین بس تھرٹین بکسے ہیں۔''

مگر سنا تھا خزانے میں چودہ بکسے تھے: نرمل نے کہا۔

کریم نے جواب دیا وہ چودھواں بکس اور نیچے دبا ہوگا۔ اس ڈاکو کی بچی کو معلوم نہیں تھا کہ چودہ بکسے ہیں اس لیے اس نے تیرہ پر ہی جھگڑا شروع کر دیا۔

پریم ناتھ گڈھے میں اترا اور ماہروں کی طرح ریت کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے مٹھی بھر ریت کو ناک کے پاس لا کر سونگھا اور پھر بولا:

یار اصل خزانہ تو نیچے چھپا ہے! دینا ایک کدال۔ اور کدال لے کر وہ پھر کھودنے لگا۔

ایک ایک گھونٹ پانی پی کر دوسرے ساتھی بھی نیچے اترنے لگے۔ گڈھا اور گہرا ہوتا گیا۔

وہ اندر کی ریت ایک لکڑی کے بکسے میں بھر بھر کر ایک سیڑھی پر سے باہر سونو کو دینے لگے۔

اب تو گڈھا ایک کنواں بن گیا۔

تھوڑی دیر میں پریم نے ریت کو پھر سونگھا۔ اب ریت سیاہ پڑتی جا رہی تھی۔

سونو جو ریت کو باہر ڈال رہی تھی۔ اس نے بھی ریت میں سے تیل کی بو محسوس کی۔ وہ جان گئی کہ پریم کس خزانے کی بات کہہ رہا تھا۔

ایک کدال اور پڑی.....

اور پھر تیل کا ایک فوارہ زور سے پھوٹا اور اوپر تک آ گیا۔

کنویں میں سے پریم کی آواز گونجی، خبردار جو کسی نے ماچس جلائی۔ ہم سب ایک دھماکے کے ساتھ اڑ جائیں گے۔ یہ پٹرول ہے!

اچھا تو چودھویں صندوق کے بجائے، اس خزانے کے کھوج میں تھے! نرمل نے کہا۔

ہاں اور کیا تم لوگوں کی مدد سے راجستھان میں پہلا تیل کا چشمہ دریافت ہو گیا ہے۔ چودھواں بکس تھا ہی نہیں۔ تیرہ ہی صندوق تھے۔ جب ہی تو مہارانی کے لیے اشبھ ثابت ہوئے۔ لو اب باہر نکلو ورنہ تیل میں نہا جائیں گے۔

کنوئیں سے باہر آتے آتے سب تیل میں نہا گئے۔

باہر آ کر ہر ایک نے پکھال سے پانی پیا اور منہ دھویا۔ پھر سب صندوق کے تالے توڑنے لگے۔ کدالوں کی مار سے تالے ٹوٹ گئے۔ جب ڈھکنے کھولے تو ان کی آنکھیں چکا چوندھ

ہوگئیں۔ ہیرے جواہرات اور ہر قسم کے قیمتی پتھروں سے بڑے بڑے صندوق بھر پور تھے۔
سونے کی تو بھر مار تھی۔ کئی صندوق صرف سونے کی پرانی اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھے۔
سب سے پہلے سونے کے لالچ نے رابرٹ کو ستایا۔ او مائی گارڈ! ۔ کیا TREASURE ملا ہے۔ یار! گورنمنٹ کو کیا معلوم ہے، مہارانی گھر سے کتنی دولت لائی تھی۔ ہم ایک دو صندوق اپنے لیے رکھ لیں تو کیا حرج ہے۔ ورنہ دسواں حصہ ملے گا اور سات آدمیوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔
چھ آدمیوں میں نہیں، صرف چار آدمیوں میں اور ایک عورت میں۔ میں تمھارے خزانے کی کھوج میں شامل نہیں تھا۔ مجھے جو خزانہ چاہیے تھا وہ تمھاری مدد سے مل گیا ہے۔
پھر وہ سونو سے بولا بولو— سونو تمھیں چاہیے اس خزانے میں حصہ؟
سونو نے نظریں جھکا کر کہا، نہیں۔ مجھے بھی میرا خزانہ مل گیا ہے۔ بس چار آدمیوں میں تقسیم کر دو اصلی 'چار یار'
اتنے میں ایک جیپ آتی نظر آئی جس کے پیچھے ٹریلر لگا ہوا تھا۔ پاس پہنچے تو اس میں سے پولیس کا ایک انسپکٹر اور تین سپاہی اترے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔
انسپکٹر صاحب آداب عرض! عبدالکریم نے پولس افسر کو سلام کر کے یہ بتا دیا کہ وہی پولیس کو بلا کر لایا ہے۔
اپنے خزانے پر قبضہ کر لیجیے تیرہ بکسے ہیں صرف۔
پریم ناتھ ہاتھ پوچھتے ہوئے آگے آیا اور پولیس انسپکٹر کو اپنا شناخت کا کارڈ دکھایا۔ میں پریم ناتھ ہوں انڈین آئل کارپوریشن کا ملازم۔
راجستھان میں یہ تیل کا چشمہ نکلا ہے۔ مبارک ہو!
انسپکٹر ٹرک اور تیل کے کنویں کے بیچ میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ پہلے تیل کو دیکھے یا خزانے کو دیکھے؟
ٹرک میں سات کروڑ کا سونا اور ہیرے جواہرات تھے۔
دوسری طرف تیل کا چشمہ تھا جس سے راجستھان کی مستقل کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔
اخیر میں پولیس انسپکٹر نے بھی پہلے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔ اب فوارہ اتنے زور سے نہیں چل رہا تھا لیکن وہ پہچان گیا کہ پٹرول ہی ہے۔

مبارک ہو! اس نے پریم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ آپ کی کارپوریشن والے تو بہت خوش ہوں گے۔

اس میں کیا شک ہے۔ لیکن اصل مبارکباد آپ کو میرے ساتھیوں کو دینی چاہیے جنھوں نے یہ کنواں کھودا ہے۔ چاہے کھودا کسی اور غرض سے ہے۔ آپ سب سے ملیے۔

'نرمل جی'

نمستے

نمستے

رابرٹ صاحب

ہیلو

ہیلو

عبدالکریم جنھوں نے آپ کو خبر دی تھی۔

آداب عرض! انسپکٹر صاحب!

اور یہ سونو دیوی ہیں۔ اسی راجستھان کی رہنے والی ہیں۔ اس چشمے کی اصل مالک یہی ہیں۔

نمستے جی!

نمستے انسپکٹر صاحب! سونو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

اور سردار ہربنس سنگھ جن کی ٹرک میں خزانہ رکھا ہوا ہے۔

اور ایک لاش پر سے کپڑا ہٹاتے ہوئے، اس نے کہا یہ ہے گوری ڈاکو! اور پھر لاش کو ڈھکتے ہوئے کہا۔ اپنی قمیض اس نے خود پھاڑی تھی۔ سردار ہربنس سنگھ کو لبھانے کے لیے لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

کیا نام بتایا تم نے؟

انسپکٹر پر اس نام کا بڑا رعب پڑا۔

ہاتھ سیدھا ماتھے پر گیا۔ سیلوٹ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ سردار ہربنس سنگھ تو سی بی آئی کے بڑے افسر ہیں؟

ہربنس سنگھ نے کہا۔ اور عبدالکریم بھی۔

اس نے کریم کی طرف اشارہ کیا اور پولیس افسر کو اسے بھی سیلوٹ کرنا پڑا۔

تو وہ شراب پینے کا ڈھونگ ہی تھا؟

نرمل نے حیران ہو کر پوچھا۔

کچھ ڈھونگ تھا کچھ نہیں بھی لیکن جو بھی تھا کام آ گیا۔

اچھا تو اب پنچ نامہ ہو جائے۔ پولیس انسپکٹر نے کہا۔ کون کون سائن کرے گا اس کاغذ پر اور کون کون کلیم CLAIM کرے گا دس فیصد خزانے کا؟

بس تین آدمی ہیں!

نرمل، رابرٹ اور سونو دیوی

سونو نے پریم کی طرف دیکھا۔

ان خزانوں سوں حصہ نائیں چاہوں ہوں۔ پر ایک شرط ہے مھاری۔

وہ کیا شرط ہے؟

وہ شرط ہے کہ راجستھان کی نہر اسی برس پوری ہونی چاہیے۔

اب سرکار کو سات کروڑ روپے مل گئے ہیں۔ اس نہر کا کام ختم ہونے میں دیر نہ لگنی چاہیے۔

آیچ میری شرط اور آیچ میرا انعام ہے۔

دھنیہ ہو سونو دیوی! انسپکٹر بولا۔

میں سرکار سے کہہ دوں گا کہ پریم ناتھ صاحب اور سونو دیوی اس عظیم کام میں شریک تھے لیکن وہ کسی انعام کے خواستگار نہیں ہیں۔

ان چاروں کو جو انعام سرکار نے مقرر کیا ہے وہ ضرور ملے گا۔ خزانے کی رسید جس کے نام تم کہو لکھ دوں۔

'چار یار' کے نام لکھ دو۔

یہ چار یار کیا ہے؟

یہ ایک کمرہ ہے جہاں ہم چار یار رہتے ہیں۔ جو روپیہ ہمیں ملے گا ہم نے فیصلہ کر لیا ہے

کہ اب اس سے ایسا بڑا مکان بنالیں گے جس میں 'چار یار' ہی نہیں ہزاروں بے کار بے یار و مدد گار لوگوں کو مدد مل سکے گی لیکن نام وہی رہے گا، چار یار، ایک ہندو ایک مسلمان ایک عیسائی ایک سکھ۔ یہ ہے ہندوستان کا چھوٹا سا نقشہ جسے اب ہم بڑھانا چاہتے ہیں۔

بہت اچھا خیال ہے آپ کا۔ اچھا تو یہ لیجیے رسید۔ اور سردار ہربنس سنگھ آپ اپنی ٹرک کو لے چلیے۔ وجے نگر پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی۔ وہاں یہ خزانے میں جمع کرا دیں اس سے پہلے کہ ڈاکو پھر ہم پر حملہ کر سکیں۔

ڈاکوؤں کی سردار مر چکی ہے۔ آدھے ڈاکو بھی مارے جا چکے ہیں۔ اب ان کی ہمت نہ ہوگی کبھی آپ پر حملہ کرنے کی۔

اس ڈاکوؤں کے سردار کو تو آپ یہیں دفن کر دیجیے۔۔ اب چلیے سردار صاحب!

ہربنس سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''ست سری اکال۔'' کیا میں کوئی افسر ہوں۔ میں تمھارا یار ہوں۔ یاد رکھو چوتھا یار۔ میرا حصہ چار یار میں ہمیشہ رہے گا۔

عبدالکریم بھی وہیں رہے گا۔ وہیں میرا کام بھی چلتا رہے گا۔

بھگوان آپ کی سہایتا کرے، نرمل نے کہا۔

گڈ بائی سردار صاحب، رابرٹ نے کہا۔

خدا حافظ! عبدالکریم نے کہا!

ٹرک چلی گئی۔

پولیس کی جیپ چلی گئی۔

نرمل نے کہا: کہو 'چار یار' ہربنس سنگھ، اور کریم نے تو کمال کر دیا۔ ایسا بھیس بھرا کہ کوئی شک ہی نہ کر سکے۔

رابرٹ نے کہا:

I TOLD YOU I WAS AMAZED

ریگستان میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ سونو نے تینوں یاروں کو نمستے کیا۔ اب میں جاؤں گی۔

کہاں جا رہی ہو؟

پریم کے ساگے ..... پہلو مہارے گاؤں جاؤں گی۔

''وہاں تو ہم بھی چلتے ہیں''

''تے سگرا مھارا مہمان ہوئے گیا''

''وہاں بھوکا تو نہ مارو گی''۔

نا بھئی نا گرم گرم روٹیاں اور بھاجی پروسوں گی... انوں آٹا تو گھر میں ہے ہی۔

اور ہماری شادی میں بھی شریک ہونا پڑے گا۔ تین بھائی کنیادان کرنے کو ہونے چاہئیں۔

پریم نے سونو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مبارک ہو پریم! کریم نے کہا۔

تمہیں سب سے اچھا انعام ملا ہے۔ جب کبھی بمبئی آؤ تو 'چاریار' جہاں بھی ہو ضرور ٹھہرنا۔

''سونو لے آنا انہیں!''

سونو نے کہا ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اور مینو؟

نرمل نے کہا جو کہیں نہیں رہتے وہ یہاں رہتے ہیں۔ اب یہ بورڈ لگا دیں گے اپنے گھر پر۔ عورت، مرد، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی۔ مگر بھائیوں کی طرح سب کو رہنا ہوگا۔

اور جدھر سورج ایک نارنجی بال بنا ہوا ڈوب رہا تھا۔ پانچوں ٹہلتے ہوئے ادھر چلے گئے۔

یہ ایک کہانی کا اختتام تھا اور دوسری کہانی کا آغاز بھی۔

O

نوٹ: یہ ناولٹ 'رسالہ بیسویں صدی، نئی دہلی میں مئی 1978 سے لے کر نومبر 1978 تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ کتابی شکل میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم

خواجہ احمد عباس (جون 1914 - یکم جون 1987) اردو کے متنوع منفرد ادیب و دانشور تھے انھوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے و مضامین بھی، کالم بھی لکھے اور فلم بھی، فلموں کے لیے مکالمے بھی لکھے اور ہدایت بھی دی، سفرنامے و سوانح بھی تحریر کیے اور اخبارات کے کالم بھی۔ وہ ایک نابغہ ادیب تھے اور تصنیف و تالیف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دی ہے۔

8 جلدوں پر مشتمل اس کلیات میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں اس کے علاوہ ایک ڈرامہ ''لال گلاب کی واپسی'' جو بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا ایک ساتھ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی شخصیات پر ان کے شائع شدہ مضامین کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ یعنی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نہایت عرق ریزی سے خواجہ احمد عباس کے جملہ کام کو یکجا کرنے کا نہایت معرکۃ الآرا فریضہ انجام دے دیا ہے تا کہ موجودہ اور آنے والی نسل یہ جان سکے کہ ہمارے اکابرین نے سرمایۂ ادبِ اردو کے بیش بہا خزانوں کو کتنی عرق ریزی سے ہمارے لیے خلق کیا ہے تا کہ ہم اس تخلیقی میراث سے نہ یہ کہ صرف اخذ و استفادہ کریں بلکہ اس کو اور بیش بہا بنانے کی سعی بھی کریں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو دنیائے ادب میں فکشن کے ناقد کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے انھیں کلاسیکی ادب سے خاص شغف ہے۔ کمیاب و نایاب متون کی تلاش اور اسے اہتمام کے ساتھ ادبی دستاویز بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اب تک ان کی مختلف موضوعات سے متعلق متعدد کتب و مقالات منظرِ عام پر آ کر اہلِ ذوق و دانش سے خراجِ داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ISBN 978-81-934243-9-1

ISBN 819342439-5

NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی - 110025

قیمت سیٹ - /1935₹